فقہائے ہند

جلد سوم

دسویں صدی ہجری

محمد اسحاق بھٹی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کلب روڈ۔ لاہور

یہ کتاب سلسلۂ فقہائے ہند کی تیسری جلد ہے۔ اس میں برصغیر پاک و ہند کے دسویں صدی ہجری کے دو سو باون فقہائے کرام کے حالات اور ان کے علمی و عملی کارناموں کو پیش کیا گیا ہے۔ کتاب میں برصغیر کے اس صدی کے ان ملوک و سلاطین کے علمی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے جو دہلی، آگرہ، گجرات، دکن، سندھ، بنگال، کشمیر اور مالوہ وغیرہ مختلف علاقوں میں دادِ حکمرانی دیتے رہے۔ نیز اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ یہ حکمران اپنے دور کے علمائے کرام سے کس درجہ محبت و تعلق رکھتے تھے اور ان کے دل میں ان کی کیا قدرو منزلت تھی۔

22/- روپے

Rs. 30/-

فقہائے ہند

جلد سوم

دسویں صدی ہجری

محمد اسحاق بھٹی

اِدارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

بار اوّل ۱۹۷۶

تعداد ۱۱۰۰

مطبع .. .. .. ندرت پرنٹرز، ۴۰- اردو بازار لاہور

ناشر .. .. .. محمد اشرف ڈار (اعزازی سکریٹری
ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

سلسلۂ فقہائے ہند کی یہ تیسری جلد ہے جو بتوفیقِ خداوندی قارئینِ محترم کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذٰلک حمداً کثیراً۔

اس میں اپنے محدود علم کے مطابق برصغیر پاک وہند کے دسویں صدی ہجری کے علما و فقہا کے حالات و سوانح ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہیں اور ان کی علمی و فقہی مساعی کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اہلِ علم کی اس قابلِ احترام جماعت میں بعض بوریہ نشین اور درویش منش بزرگ تھے جو حکومت و سطوت کے پرشکوہ ایوانوں سے کوئی راہ و رسم نہ رکھتے تھے۔ ان کا میدانِ عمل صرف درس و تدریس یا وعظ و تذکیر تھا۔ اس اہم خدمتِ دین کی انجام دہی کے لیے انھوں نے مختلف زاویوں اور مسجدوں کو اپنا مرکز قرار دے لیا تھا۔ اور کچھ وہ بھی تھے جو باقاعدہ ارکانِ سلطنت میں شامل، دربارِ مملکت سے وابستہ اور حکومتِ وقت کے اونچے مناصب پر فائز تھے۔ مقدمۂ کتاب میں اختصار کے ساتھ ہم دو چیزوں کی وضاحت کریں گے۔ ایک یہ کہ سو سال کے اس طویل عہد میں جو سلاطین و ملوک اس خطۂ ارض میں دادِ حکمرانی دیتے رہے، وہ ان فقہائے عظام اور علمائے کرام سے کیا تعلقِ خاطر اور قلبی روابط رکھتے تھے اور ان کے دل کی نہائیوں میں ان کی کیا قدر و منزلت تھی۔ دوسرے یہ کہ ان شاہانِ ہند کی خود اپنی کتابِ حیات کے علمی اور دینی پہلو کس درجہ نمایاں اور تابناک تھے۔

سکندر لودھی

اس سلسلے میں کتاب کی دوسری جلد کے مقدمہ میں ہم ہندوستان کے لودھی خاندان کی حکومت کے مؤسسِ اعلیٰ سلطان بہلول لودھی کے علمی کوائف سے اپنے قارئین کو متعارف کرا چکے

ہیں۔ اب اس خانوادہ کے دوسرے حکمران سلطان سکندر لودھی کے علمی و عملی کارناموں سے آپ کو روشناس کرائیں گے۔ سکندر اپنے عظیم باپ سلطان بہلول لودھی کی وفات کے بعد ۸۹۴ھ میں تختِ ہند کا وارث بنا۔ یہ اپنے باپ کے ساتھ بہت سے معرکوں میں شریک رہا۔ بڑا شجاع اور جنگ جو بادشاہ تھا۔ انتظامی صلاحیتوں کا مالک، سیاسی بصیرت کا حامل اور طرزِ حکمرانی کے جملہ پہلوؤں سے خوب آگاہ تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں مملکت کی حدّیں دُور دُور تک پھیل گئی تھیں، دشمن اس کے زورِ بازو سے کانپتے اور اس کی جنگی تدبیروں کا لوہا مانتے تھے۔ اس میں بڑی خوبی یہ تھی کہ علم و علما کا دوست اور مذہبی و دینی امور سے کامل دلچسپی رکھتا تھا۔

سکندر کی ماں ایک ہندو سنار کی بیٹی تھی۔ اس کا نام ہیماں تھا۔ کہتے ہیں، ہیماں بہت خوب رو عورت تھی، بہلول لودھی کی اس پر نظر پڑی تو اس کا گرویدہ ہو گیا اور بالآخر وہ اس کے عقد میں آگئی۔ یہ بھی منقول ہے کہ سکندر کی پیدائش سے قبل ہیماں نے یہ خواب دیکھا تھا کہ چاند ٹوٹ کر اس کی گود میں آگرا ہے۔ نجومیوں سے اس کی تعبیر پوچھی گئی تو انھوں نے بتایا، اس کے بطن سے ایک لائق اور ہونہار بیٹا پیدا ہو گا جو سلطنت کو چار چاند لگائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بہلول نے سکندر کی تعلیم و تربیت کا خاص طور سے اہتمام کیا، لیکن اس کی تعلیم کے حدود کہاں تک پھیلے ہوئے تھے؟ اس نے کن اساتذۂ عصر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان سے کن کن علوم کی کون کون کتابیں پڑھیں؟ اس کی وضاحت تاریخ کی کتابوں میں ہماری نظر سے نہیں گزری۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ آغازِ زندگی ہی سے سخت دینی حمیت اور شدید مذہبی عصبیت کا حامل تھا۔ اس کے فکر و عمل پر اسلام کا غلبہ اور شعائرِ دین کا قبضہ تھا۔

اس کے حالات میں یہ بھی مرقوم ہے کہ وہ ہندوؤں سے بے حد تعصب رکھتا تھا اور اس ضمن میں کسی قسم کی مداہنت یا رواداری کا قائل نہ تھا۔ اس قسم کا کوئی مسئلہ اگر سامنے آجاتا اور اس میں دو رائیں ہوتیں تو وہ عام طور پر درشت رائے کی تائید کرتا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اس کے زمانۂ شہزادگی میں جب کہ

وہ ایک علاقے کا والی تھا، اسے اطلاع پہنچی کہ کرکشیتر میں ہندو کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اور وہ اپنے مذہب کے مطابق وہاں تالاب میں اشنان اور مندر میں مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں۔ نیز انھوں نے وہاں کچھ ہنگامہ بھی بپا کر رکھا ہے۔ سکندر نے فوری طور پر علما کا محضر طلب کر کے ان سے مشورہ کیا کہ بغیر کسی تاخیر کے ان ہندوؤں کو قتل اور مندر کو مسمار کر دیا جائے۔ اس محضر میں ملک العلما میاں عبداللہ بھی موجود تھے۔ علما نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، اس اہم مسئلے میں فیصلہ کن رائے ان ہی کی ہو سکتی ہے۔ شہزادہ میاں عبداللہ کی طرف متوجہ ہوا۔ انھوں نے دریافت فرمایا:

کرکشیتر کیا شے ہے؟

جواب ملا۔ ایک تالاب ہے جہاں کفار بطور عبادت ملک کے ہر شہر سے جمع ہو کر آتے اور غسل کرتے ہیں۔ نیز وہاں کے مندر اور بت خانے میں اپنے مذہب کے مطابق فرائض عبادت بجالاتے ہیں۔

فرمایا۔ یہ رسم عبادت کب سے جاری ہے؟

جواب دیا۔ یہ ایک قدیم رسم ہے۔

ملک العلما نے تفصیلات سے مطلع ہونے کے بعد فتویٰ دیا۔

بت خانہ قدیم را ویران ساختن جائز نیست۔

کسی دیرینہ بت خانے کو تباہ کرنا جائز نہیں۔

یہ جواب سکندر کی مرضی کے بالکل خلاف تھا۔ ملک العلما کی زبان سے یہ الفاظ سن کر وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے خنجر پر ہاتھ رکھ کر کہا:

طرفِ کفار می کنی، اول ترا می زنم بعد آں بر کرکشیتر خواہم تاخت۔

کافروں کی طرف داری کرتا ہے۔ میں پہلے تیرا خاتمہ کروں گا۔ پھر کرکشیتر کو تباہ کروں گا۔

ملک العلما کے لیے یہ بہت بڑے امتحان کا وقت تھا۔ انھوں نے نہایت جرأت اور متانت سے جواب دیا:

مرگ حق است، بغیر حکم حق کسے نمیرد، چوں کسے پیش ظالمے می آید اوّل مُردنِ خود را اختیار کردہ می آید، ہرچہ باداباد۔ چوں مرا پرسید ید مسئلہ شرع بیان نمود، اگر پروائے شرع ندارید حاجت پرسیدن نیست۔

موت حق ہے۔ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نہیں مرتا۔ جب کوئی شخص ظالم کے سامنے آتا ہے، پہلے اپنی موت کے لیے تیار ہو کر آتا ہے۔ جو کچھ بھی ہونا ہے ہو جائے۔ جب آپ نے مجھ سے دریافت کیا تو میں نے شریعت کا مسئلہ بیان کر دیا۔ اگر آپ کو شریعت کی پروا نہیں ہے تو پھر پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔

یہ صحیح اور جرأت مندانہ جواب سن کر سکندر کا غصہ رفع ہو گیا اور میاں عبداللہ سے کہا:

اگر اجازت می دادید چندیں ہزارہا مسلمانان آسودہ می شدند۔

اگر آپ اجازت دے دیتے تو کتنے ہی ہزار مسلمان مطمئن ہو جاتے۔

جب مجلس برخاست ہو گئی تو سکندر نے ملک العلما سے خاص طور سے مخاطب ہو کر کہا:

میاں عبداللہ! شما گاہ گاہ باما ملاقات فرمائید[1]

میاں عبداللہ! آپ گاہے گاہے ہم سے ملتے رہیں۔

تخت نشینی

بہلول لودھی نے ۸۹۴ھ کو وفات پائی، اس کے بعد سکندر لودھی تختِ دہلی پر متمکن ہوا۔۔۔۔ تخت نشینی سے پہلے اس نے شیخ سماء الدین کنبوہ کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا:

یا شیخ! می خواہم کہ در علم صرف کتاب میزان پیش شما بخوانم

یا شیخ! میں علم صرف کی کتاب، میزان آپ سے پڑھنے کا خواہاں ہوں۔

---

[1] واقعات مشتاقی ص ۱۶

شیخ نے فرمایا: بداں اسعدك الله فی الدارین خیراً۔[۲]

سکندر نے یہ کلمہ تین بار شیخ کی زبان سے کہلوایا اور پھر اسے نیک فال سمجھ کر اور ان کے ہاتھ چوم کر کھڑا ہو گیا۔

فرائض و نوافل کا التزام

تمام مؤرخین اور تذکرہ نگاروں کا اس پہ اتفاق ہے کہ سکندر لودھی ارضِ ہند کا نہایت متدیّن بادشاہ تھا اور فرائض و نوافل کا سختی سے پابند تھا۔ افسانۂ شاہان کا مصنف لکھتا ہے:

نماز باجماعت ہر پنج وقت می گزارد و نوافل بسیار می کرد و نمازِ تہجد و اشراق گاہے فوت نہ کردے۔[۳]

پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا تھا، نوافل کثرت سے پڑھتا اور تہجد اور اشراق کی نماز کبھی ترک نہ کرتا تھا۔

اس کی نیکی اور شب بیداری کا یہ عالم تھا کہ نماز فجر سے تین گھنٹے قبل بیدار ہو جاتا اور غسل کر کے نمازِ تہجد ادا کرتا۔ بعد ازاں:

سہ سپارہ کلامِ ربانی دست بستہ خواندے۔[۴]

قرآن کے تین سپارے ہاتھ باندھ کر اور کھڑا ہو کر تلاوت کرتا۔

غربا و مساکین کی مدد

سکندر متعدد اوصاف کا مالک تھا۔ وہ رعایا کے غربا و مساکین کا بے حد خیال رکھتا تھا۔ قابلِ امداد لوگوں کی سال میں دو مرتبہ فہرستیں تیار کراتا اور ان کی مدد کرتا تھا۔ جاڑوں کے موسم میں بھی غربا میں کپڑے تقسیم کرتا اور گرمیوں میں بھی۔ اس نے تقسیم

---

[۲] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۸۶۔

[۳] سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۲۵۴ بحوالہ افسانۂ شاہانِ ورق ۳۸۔

[۴] تاریخ شاہی ص ۴۹۔

خیرات کے لیے یہ التزام کر رکھا تھا کہ بعض مقامات کے لوگوں کو پکا ہوا کھانا دیا جاتا کچھ لوگوں کی نقدی اور جنس کی صورت میں مدد کی جاتی اور کچھ مستحقین کو ششماہی دیا جاتا تھا۔ اس کے لیے ہر روز، ہر جمعہ اور سال میں دو مرتبہ حسبِ ضرورت لوگوں کی امداد کی جاتی۔ غریب لڑکیوں کی شادی کے لیے بھی ان کے والدین کو خاص رقوم عطا کی جاتیں۔ طبقاتِ اکبری کا مصنف نظام الدین بدخشی رقم طراز ہے:

یومیہ وجمعگی و دو مرتبہ انعام در سالے در کل ممالک مخصوص فقرا بود۔[۵۵]

روزانہ اور جمعہ کے دن اور سال میں دو مرتبہ تمام علاقوں کے فقرا میں تقسیم کرنے کے لیے چیزیں مخصوص تھیں۔

سلطان نہ صرف خود مستحقین کی مدد کرتا، بلکہ امرائے سلطنت اور ارکانِ حکومت کو بھی اس کی تلقین کرتا۔ ان میں سے جو شخص جس قدر غربا کی مدد کرتا، اسی قدر سلطان اس کو معزز و محترم گردانتا تھا۔ یعنی اس کے نزدیک پیمانۂ قدر و منزلت مستحقین کی امداد تھا۔

رعایا کا یہاں تک خیال رکھتا تھا کہ ایک مرتبہ ملک میں قحط کی وجہ سے غلّے کی پیداوار میں کمی واقع ہو گئی تو عشر معاف کر دیا۔ بعد ازاں حالات بدل گئے اور غلّے کی قلت دُور ہو گئی مگر عشر وصول نہیں کیا۔[۵۶]

طرزِ بود و باش

دسویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کا یہ نامور حکمران جو تاریخ میں سکندر لودھی کے نام سے معروف ہے، نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور اس کا طرزِ بود و باش شاہانہ جاہ و جلال کا مظہر نہ تھا بلکہ اس میں ایک عام آدمی کے اسلوبِ معاشرت کی جھلک نمایاں تھی۔ اس کا ذکر افسانۂ شاہاں کا مصنف ان الفاظ میں کرتا ہے:

---

۵۵ طبقاتِ اکبری ج ۱ ص ۳۳۶۔ تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۸۶۔

۵۶ ایضاً

عادتِ سلطان چناں بود تا آنکہ جامہ پارہ نشدے جامۂ نو نپوشیدے۔ تا آنکہ خواب غلبہ نہ کردے نخسپیدے، و نیز تا آنکہ اشتہا غالب نشدے طعام نخوردے۔[۷]

سلطان کی عادت تھی کہ جب تک کپڑا پھٹ نہ جاتا، نئے کپڑے نہیں پہنتا تھا، جب تک نیند کا غلبہ نہ ہوجاتا سوتا نہیں تھا اور جب تک بھوک غالب نہیں ہوجاتی تھی، کھانا نہیں کھاتا تھا۔

احمد یادگار کی روایت کے مطابق وہ اپنا "جامہ و پلنگ" ہر روز بدلتا تھا اور یہ جامہ و پلنگ یتیم بچیوں کے جہیز میں دے دیا جاتا تھا۔[۸]

مساجد میں ائمہ و خطبا کا تقرر

سکندر لودھی سخت مذہبی جذبات کا حامل بادشاہ تھا۔ مؤرخین نے اس کے حالات میں اس ضمن کے بہت سے واقعات تحریر کیے ہیں۔ یہ مقام تفصیل کا متحمل نہیں، اس لیے ہم اس کا مختصر سا تذکرہ کر کے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ اس کی طرف سے پورے ملک کی مساجد میں قاری، امام، خطیب اور خدام و جاروب کش مقرر تھے، اور ان کے وظائف و مشاہرات کا باقاعدہ انتظام۔ رمضان اور عیدین وغیرہ ایامِ متبرکہ میں زیادہ سے زیادہ فقرا و مساکین کی مدد کی جاتی تھی۔[۹]

سکندر لودھی کے مذہبی اور دینی احساسات بہت نازک تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے جو نظام الدین بدخشی نے طبقاتِ اکبری میں لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے، جس زمانے میں سکندر اپنے بھائی باربک شاہ سے برسرِ جنگ تھا، ایک قلندر اس کے سامنے آیا اور سکندر کا ہاتھ پکڑ کر کہا، اس لڑائی میں تو فتح پائے گا۔ سکندر نے سختی سے ہاتھ کھینچ لیا اور درشت لہجہ میں کہا:

---

[۷] سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات بحوالہ افسانۂ شاہان ورق ۳۹۔

[۸] تاریخ شاہی ص ۴۹

[۹] طبقاتِ اکبری جلد ۱، ص ۳۳۶

ہر گاہ کہ در طائفہ اسلامیہ جنگ باشد حکم بر یک طرف نباید کرد۔ بلکہ باید گفت در آنچہ خیریت اسلام است آں شود۔ و در فتح ہر کہ صلاحِ خلق باشد از حق باید خواست۔[۱۰]

جب باہم مسلمانوں کے درمیان سلسلہ جنگ جاری ہو تو ایک فریق کے حق میں فیصلہ نہیں کر دینا چاہیے، بلکہ کہنا چاہیے کہ وہی کچھ ظہور میں آئے، جو اسلام کے لیے بہتر ہو، اور اللہ سے اسی فتح کی خواہش کرنی چاہیے، جس میں خلقِ خدا کی صلاح کا راز مضمر ہو۔

اس کے ان ہی اوصاف کی بنا پر شیخ عبدالحق محدّث دہلوی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

بالحقیقت محامد زمان سلطنت آں سلطان سعادت نشان از حدِّ تقریر و تحریر خارج است۔[۱۱]

حقیقت یہ ہے کہ اس سلطان سعادت نشان کے عہد کی خوبیاں حدِّ تقریر و تحریر سے باہر ہیں۔

شیخ فخرالدین زاہدی سے ملاقات

سکندر لودھی بہار کے سفر پر گیا تو کئی روز وہاں ٹھہرا اور وہاں کے علما و مشائخ سے ملاقات کی۔ بہار کے ایک بزرگ شیخ فخرالدین زاہدی تھے جو اس علاقے کی مشہور شخصیت تھے۔ ان کے مریدوں میں بنگال کے بادشاہ بھی شامل تھے۔ ان ان کا معمول تھا کہ آنے والوں کو شربت پلاتے تھے۔ قیام بہار کے زمانے میں سکندر بھی ان کی خدمت میں گیا۔ اتفاق سے اس وقت مصری یا چینی موجود نہ تھی۔ ایک خادم نے اشارے سے شیخ کو یہ بات بتائی۔ انھوں نے انگلی سے اشارہ کیا: "از

---

[۱۰] طبقاتِ اکبری ج ۱ ص ۳۳۵۔

[۱۱] اخبار الاخیار، ص ۲۲۷۔

شیرینی چینی خراشیدہ ساختہ بیارید" (مٹھائی پر سے چینی کھرچ کر شربت بناؤ اور لے آؤ) بادشاہ اور اس کے رفقا نے شربت پیا۔ مولانا جمالی بھی بادشاہ کے ساتھ تھے۔ شیخ سے اجازت لے کر باہر آئے تو بادشاہ نے مولانا جمالی سے کہا۔ یہ اپنے دَور کے بہت بڑے شیخ ہیں، اس وقت کوئی شیخ نیکی میں ان کی ٹکر کا نہیں ہے، لیکن ان میں ایک نقص یہ ہے کہ جاہل ہیں۔ دورانِ گفتگو میں "من شمارا غبتاً یادمی کردم" کہا تھا۔ جہالت کی وجہ سے "غبتاً" اور "غیبتاً" میں فرق نہ کرسکے۔ "من شمارا غیبتاً یادمی کردم" کہنا چاہیے تھا۔

نماز جمعہ کے لیے مسجد میں حاضری

قیامِ بہار کے زمانے میں سکندر باقاعدگی سے نمازِ جمعہ کے لیے مسجد میں حاضر ہوتا تھا۔ ایک روز اسے آنے میں تاخیر ہوگئی تو میاں بدی حقانی نے، جو بہار کے جلیل القدر عالم تھے اور سکندر ان کی بہت قدر کرتا تھا، معمول سے زیادہ انتظار کیے بغیر جماعت کھڑی کرادی۔ نماز ختم ہوچکی تو بادشاہ پہنچا، مولانا جمالی بھی ساتھ تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ نماز ہوچکی ہے۔ لیکن یوں ہی نمازیوں سے مخاطب ہوکر کہا:

لے مرداں! بس ایں مقدار تاخیر نباید کرد کہ بادشاہ بیاید۔

لوگو! بادشاہ کے انتظار میں اتنی زیادہ تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

میاں بدی حقانی نے مولانا جمالی کو جواب دیا:

من نماز خدائے را گزرانیدم وگزاردیم۔

ہم کو اللہ کی نماز پڑھنا تھی، وہ پڑھ لی۔

بادشاہ نے مولانا جمالی سے خاموش رہنے کی درخواست کی اور میاں بدی سے مخاطب ہوکر کہا۔

آپ نے بہت اچھا کیا کہ نماز ادا کرلی، کوتاہی تو میری ہے[۱۲]

---

[۱۲] طبقاتِ اکبری ج ۱، ص ۳۲۰۔ تاریخ داؤدی ص ۵۳، ۵۴۔

عہدِ سکندری کے علما

سلطان سکندر لودھی اونچے درجے کے علمی ذوق کا مالک تھا۔ وہ علما کے مباحثوں میں شریک ہوتا اور بحثوں میں خود حصہ لیتا۔ رات کو بھی اس کی مجلسِ علم گرم رہتی۔ اس کے عہد میں دور دراز علاقوں اور ملکوں کے بہت سے علما نے جو مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے، دیارِ ہند میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

از اکناف عالم از عرب و عجم بعضے بسابقۂ استدعا و طلب و بعضے بے آں، در عہدِ دولتِ او تشریف آوردہ و توطن ایں دیار اختیار کردند[۱۳]۔

دنیا کے مختلف گوشوں اور عرب و عجم سے بعض علما اس کی طلب و دعوت پر اور بعض بلا دعوت کے اس کے عہدِ حکومت میں تشریف لائے اور پھر اس ملک میں سکونت پذیر ہو گئے۔

عہدِ سکندری کے علما میں شیخ سعد اللہ (شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے دادا)، شیخ رزق اللہ مشتاقی (شیخ عبدالحق دہلوی کے چچا۔ یہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ ہندی میں راجن اور فارسی میں مشتاقی تخلص کرتے تھے) شیخ عبدالوہاب بخاری، شیخ جلال الدین تبریزی، شیخ عبداللہ تلنبی، شیخ عزیز اللہ تلنبی، شیخ اللہ داد جون پوری، میاں خواجگی اور میاں طٰہٰ کے اسمائے گرامی خاص طور پر لائقِ تذکرہ ہیں۔

شیخ عبداللہ تلنبی دراصل علاقہ ملتان کے ایک قصبہ تلنبہ کے رہنے والے تھے، اور سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں دہلی میں جا کر اقامت گزیں ہو گئے تھے، بہت بڑے عالم و فقیہ تھے۔ ان کا سلسلہ درس بڑا وسیع اور اندازِ تدریس نہایت عمدہ تھا۔ خود بادشاہ اس میں شریک ہوتا، لیکن اس طرح کہ:

در گوشۂ مجلس آہستہ می نشست و بعد از فراغ درس سلام علیکم گفتہ، بایک دیگر

---

[۱۳] اخبار الاخیار ص ۲۲۷

صحبت می داشتند[۱۴]

مجلسِ درس کے ایک گوشہ میں آہستہ سے جاکر بیٹھ جاتا اور درس سے فراغت کے بعد حاضرِ خدمت ہو کر اسلام علیکم کہتا۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے محوِ گفتگو ہو جاتے۔

دورِ سکندری کے ان علمائے کرام کے حالات اپنی اپنی جگہ ہماری اس کتاب میں مرقوم ہیں۔ ان علمائے عالی مقام میں ایک بزرگ میاں طٰہٰ تھے، جو بہت سے اصنافِ علم پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ بہترین خطاط، بہت بڑے نقاش، علمِ مفراض میں ماہر اور علمِ موسیقی میں کامل تھے۔

مسلمانوں کے علاوہ حصولِ علم کے لیے ہندو بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ سکندر ان کی بہت قدر کرتا تھا اور کہا کرتا تھا "ہزار آدمی بہ یک ذات میاں طٰہٰ است"۔ (میاں طٰہٰ کی ایک ذات میں ہزار آدمیوں کی قابلیت جمع ہے)

میاں طٰہٰ کی رسائیٔ عقل اور دستِ ہنرمند کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے ایک ایسا موتی اپنے ہاتھ سے بنا کر سلطان کو پیش کیا کہ جوہری بھی اس کی شناخت سے قاصر رہے تھے۔ علمِ کیمیا اور سیمیا میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے بادشاہ کے لیے کاغذ سے ایک "کلاہِ عاج" تیار کیا تھا۔ ایک عجیب و غریب کرن پھول بنایا جو سر کی حرکت کے ساتھ کبھی پھول بن جاتا تھا، کبھی غنچہ[۱۵]

اسی عہد کے ایک اور عالمِ دین سید رفیع الدین صفوی کا اسمِ گرامی بھی تذکروں میں مذکور ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان کے حالات تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے معقولات کی تحصیل شیخ جلال الدین محمد دوانی سے اور علوم حدیث کی شیخ شمس الدین

---

[۱۴] منتخب التواریخ ص ۳۲۴

[۱۵] سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات (حاشیہ ص ۵۹، ۶۰-۴۶) بحوالہ تاریخ داؤدی ص ۵۶

سخاوی مصری سے کی تھی۔ پہلے حرمین شریفین میں مقیم تھے۔ پھر دہلی آ گئے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

سلطان سکندر را درحقِ او اعتقادِ عظیم پیدا شد۔[16]

سلطان سکندر لودھی کو ان کی ذات سے بہت عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔
بعد کو انھوں نے سلطان سے اجازت لے کر آگرہ کو اپنا مسکن ٹھہرا لیا تھا۔

معدن الشفا یا طب سکندری

سکندر لودھی کے زمانے کے ایک بزرگ میاں بہوہ تھے، جو علم و فضل اور خطاطی و حکمت میں عدیم المثال تھے۔ امرائے سکندری میں ان کو امتیازی حیثیت حاصل تھی اور سکندر ان کی بہت قدر کرتا تھا۔ انھوں نے بادشاہ کے مشورے سے معدن الشفا کے نام سے علمِ طب کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی جس میں ایک ہزار ایک سو سات امراض اور ان کے لیے مناسب ادویہ اور علاج کا ذکر ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلامی طب کی تدوین و ارتقا میں اس کتاب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ کتاب "طبِ سکندری" کے نام سے معروف ہے اور حلقۂ اہلِ علم میں متداول و متعارف ہے۔

آگرہ شہر کی تعمیر

سکندر لودھی کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے آگرہ شہر کی بنیاد رکھی اور اسے اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اٹاوہ، چندیری اور گوالیار کے راجپوت ہندو راجے اس کے سخت مخالف تھے اور وہ ان سے پریشان رہتا تھا۔ اس کا بیشتر وقت ان سے معرکہ آرائی میں گزرا۔ وسطی ہند میں آگرہ شہر کی بنیاد رکھنے اور اسے دارالخلافہ بنانے کا بنیادی مقصد ہندو راجاؤں کا زور توڑنا اور ان علاقوں میں اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے راستہ ہموار کرنا تھا اور اس

---

[16] اخبار الاخیار، ص ۲۵۲

میں وہ کامیاب رہا۔

مذہبی تعصّب یا اسلامی غیرت

سلطان سکندر لودھی کے مذہبی تعصّب کا مؤرخین نے خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ خود مسلمان مؤرخ بھی کھلے لفظوں میں اس کو متعصّب گردانتے اور واضح طور سے لکھتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں حدِّ افراط کو پہنچ گیا تھا۔ نظام الدین بدخشی کے الفاظ ہیں:

تعصّبِ اسلام بمرتبہ داشتنے کہ دریں باب بسرحدِّ افراط رسانیدہ بود۔[۱۷]

اسلامی معاملات میں وہ یہاں تک تعصّب رکھتا تھا کہ سرحدِ افراط کو پہنچ گیا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ اس زمانے کے ہندوستان میں اس قسم کی مختلف تحریکیں ابھر آئی تھیں جو اسلام اور ہندو مذہب کو باہم خلط ملط کرنے کے لیے کوشاں تھیں۔ مثلاً بھگتی تحریک، وحدت الوجود کا تصوّر، مسلمان صوفیا اور ہندو جوگیوں کا اتحاد صوفیا کے جذب وسُکر وغیرہ کی مختلف منزلیں اور وحدت ادیان وغیرہ وغیرہ۔ یہ مختلف گروہ تھے جو ہندو مذہب اور اسلام کو باہم ملانے یا ایک دوسرے سے قریب لانے کے لیے ساعی تھے۔ اس کا اندازہ مکتوباتِ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی اس عبارت سے بآسانی ہو سکتا ہے:

ایں چہ شور وایں چہ غوغا کشادہ ـــــــ کسے مومن، کسے کافر، کسے مطیع، کسے عاصی، کسے درراہ، کسے بے راہ، کسے مسلم، کسے پارسا، کسے ملحد، کسے ترسا، ہمہ دریک سلک است[۱۸]

یہ کیا شور اور ہنگامہ بپا کر دیا گیا ہے، کوئی مومن ہے، کوئی کافر، کوئی اطاعت گزار ہے

---

۱۷ طبقاتِ اکبری ج ۱ ص ۳۳۵

۱۸ مکتوباتِ شیخ عبدالقدوس گنگوہی ص ۲۰۵

کوئی گنہ گار، کوئی صحیح راہ پر گامزن ہے اور کوئی بے راہ، کوئی مسلم ہے کوئی پارسا، کوئی ملحد ہے کوئی ترسا۔ اصل بات یہ ہے کہ سب ایک ہی سلک میں منسلک ہیں۔

سکندر لودھی کے ہاتھوں بدھن برہمن کا قتل درحقیقت اسی بنا پر ہوا تھا کہ وہ اسلام اور ہندو مذہب میں امتیاز کا قائل نہ تھا اور اس نے اعلان کیا تھا:

اسلام حق است و دینِ من نیز درست است[۱۹]

اسلام حق ہے اور میرا دین بھی صحیح ہے۔

یہ وہی بدھن برہمن ہے، جس کے قتل میں سکندر لودھی کو بہت بدنام کیا گیا ہے۔

پھر ہندوؤں میں بعض ایسی جماعتیں معرضِ وجود میں آگئی تھیں، جو ہندو مت کی تبلیغ کے لیے سرگرم عمل تھیں اور ان کا دائرۂ عمل نہ صرف دونوں مذہبوں کو متحد کرنے اور ان میں یگانگت کی راہیں تلاش کرنے تک محدود تھا بلکہ یہ مسلمانوں کو حلقۂ اسلام سے نکال کر دائرہ ہندو بت میں داخل کرنے کی جدوجہد کر رہی تھیں اور مسلمانوں کو علی الاعلان مرتد بنانے کے درپے تھیں۔ ان تحریکوں کا رخ صرف جاہل عوام کی طرف ہی نہ تھا بلکہ بڑے بڑے امرا اور سرکردہ مسلمان بھی ان سے متاثر ہو کر الحاد و زندقہ کی وادی میں قدم زن ہو گئے تھے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر انھوں نے مسلمان خواتین تک کو رقص و سرود کی تعلیم کے لیے جو ہندوؤں کا مذہبی شعار تھا، ہندوؤں کے حوالے کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان امرا میں کالپی کے ضابط نصیر خاں اور لکھنوتی کے حاکم احمد خاں لودھی کے نام خاص طور سے کتب تاریخ میں مرقوم ہیں۔ نصیر خاں کے بارے میں طبقاتِ اکبری کا مصنف لکھتا ہے:

او از جادۂ مستقیم شریعت تافتہ، راہِ الحاد و زندقہ پیش گرفتہ، و ترک نماز و روزہ دادہ، و زنانِ مسلمہ را بنائکاں ہندو سپردہ تا رقاصی تعلیم نمایند[۲۰]

---

[۱۹] طبقاتِ اکبری ص ۳۲۲ [۲۰] ایضاً ص ۳۲۶

اس نے شریعت کے جادۂ مستقیم سے منہ موڑ لیا اور الحاد و زندیقت کی راہ اختیار کر لی۔ نماز روزہ ترک کر دیا اور مسلمان عورتوں کو رقاصی سیکھنے کے لیے ہندو نائکوں کے سپرد کر دیا۔

یہی مصنف احمد خاں لودھی کے ارتداد کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

خبر رسید کہ احمد خاں پسر مبارک خاں لودھی کہ حاکم لکھنوتی بود، بمصاحبتِ کفار طریقہ ارتداد پیش گرفتہ از دینِ اسلام برگشتہ است[21]

اطلاع ملی کہ احمد خاں پسر مبارک خاں لودھی نے جو لکھنوتی کا حاکم تھا، کفار کی صحبت کے اثر سے ارتداد کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور دین اسلام سے برگشتہ ہو گیا ہے۔

اسی طرح ہندوستان کے نامور محقق جناب خلیق احمد نظامی افسانہ شاہان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ علاقہ بہار کے ایک شخص کے پورے قبیلے کو ایک ہندو راجہ نے قتل کرا دیا تھا۔ اس نے سکندر لودھی کو بتایا:

اولاً مسلمان بودیم، عثمانی، الحال زنار دار شدہ ام[22]

پہلے ہم مسلمان تھے اور عثمانی (نسل سے تھے) اب میں زنار دار ہو گیا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندو اس سلسلے میں بڑے جری ہو گئے تھے، ان کے قدم اس میدان میں بہت آگے بڑھ گئے تھے اور ان کی مساعی ارتداد نے جارحیت کی شکل اختیار کر لی تھی۔

شیخ رکن الدین گنگوہی لطائف قدوسی میں فرماتے ہیں:

و طرفِ ہندوستان غلبۂ کافراں بود، در پرگنہ ردولی عمل کافراں شد، شعارِ اسلام مندرس شدند، در بازار گوشتِ خوک فروختہ می شد، حضرت قطبی دل گیر شدہ بیرون آمدند[23]

---

[21] طبقاتِ اکبری ص ۳۳۱۔

[22] سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۴۵۰ بحوالہ افسانہ شاہان ورق ۲۹۔

[23] لطائف قدوسی ص ۳۱

اطرافِ ہندوستان میں کافروں کا غلبہ تھا۔ قصبہ ردولی میں کفار کا عمل دخل ہو گیا تھا۔ شعائرِ اسلام مٹ گئے تھے۔ بازار میں سؤر کا گوشت فروخت ہونے لگا تھا، جس سے دل برداشتہ ہو کر حضرت قطبی (شیخ عبدالقدوس گنگوہی) باہر نکل آئے تھے۔

ان حالات میں یہ کیوں کر ممکن تھا کہ سکندر لودھی جیسا مسلمان اور پابندِ شریعت بادشاہ خاموش رہتا اور اسلامی رسوم و عوائد کے تحفظ کے لیے کوئی کوشش نہ کرتا۔ کہا جاتا ہے، چوں کہ وہ ہندو ماں کا بیٹا تھا اور بعض لوگ اسے "کم اصل" ہونے کا طعن بھی دیتے تھے، لہٰذا اس نے اپنا یہ طعن دور کرنے اور خود کو پکا مسلمان ثابت کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا۔ ان حالات کو سامنے رکھیں تو یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی حمیّتِ اسلامی اور غیرتِ دینی اسلام اور مسلمانوں کی بے حرمتی کو برداشت نہ کر سکی اور اس نے ان کانٹوں کو دور کرنے کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اسلام کی صراطِ مستقیم میں جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کے قلب و ذہن میں چبھتے اور انھیں تکلیف پہنچاتے تھے۔ وہ تو مسلمان بادشاہ اور اسلام کا سپاہی تھا۔ اگر کوئی کم حیثیت آدمی بھی اسلام کی حفاظت کرے تو یہ نہ صرف قابلِ طعن و ملامت ہے بلکہ ضروری ہے اور اس کے فرائض میں داخل ہے۔ جس شخص کی بھی اس دور کے ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی حالت پر نظر ہے، وہ سکندر کو متعصب یا حدِ اعتدال سے متجاوز نہیں ٹھہرا سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے بدھن برہمن کو ناحق قتل کیا۔ لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے اس سلسلے میں علمائے عصر کو باقاعدہ جمع کر کے ان سے رائے لی تھی جن میں اس دور کے تقریباً تمام بڑے بڑے مشاہیر اہلِ علم اور اصحابِ فکر شامل تھے۔ مثلاً لکھنوتی کے قاضی پیارہ اور شیخ بدھ، دہلی کے میاں قادن بن شیخ خوجو، میاں عبداللہ بن اللہ داد تلنبی اور سید محمد بن سعید خاں، قنوج کے سید احسن، سید امان، اور میراں، سیکری کے سید صدرالدین قنوجی اور میاں عبدالرحمٰن، سرہند کے مُلّا قطب الدین، مُلّا صالح اور مُلّا اللہ داد اور سنبھل کے مولانا عزیز اللہ اس مجلس میں شریک تھے اور ان کو خاص طور پر صرف

اسی مسئلے پر گفتگو کے لیے بُلایا گیا تھا، اور بدھن برہمن کو ان کے متفقہ فتویٰ کے مطابق قتل کیا گیا تھا۔[۲۴]

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بدھن برہمن کا معاملہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا اور یہ شخص اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں بہت دُور تک چلا گیا تھا۔ اسی لیے بادشاہ ملک کے مختلف گوشوں سے علما کو طلب کرنے پر مجبور ہوا اور پھر مسئلہ زیرِ بحث کے تمام پہلوؤں پر پورے غور و خوض کے بعد اس کے قتل کا فتویٰ جاری کیا گیا۔

خلافِ شرع رسوم کا خاتمہ

سکندر لودھی کے زمانے میں بہت سی غلط اور غیر شرع رسوم و عوائد ملک میں رائج تھیں، اس نے ان سب کو سختی کے ساتھ ختم کیا۔ ان میں بعض رسمیں مذہب کے رنگ میں رواج پذیر ہو گئی تھیں۔ اس نیک اطوار بادشاہ نے ان کے مرتکبین کے خلاف تعزیری کارروائیاں کیں۔ مثلاً سید سالار مسعود کے نیزے جو ہر سال نکلتے تھے، اس نے تمام ملک میں بند کرا دیے۔ فیروز شاہ نے عورتوں کو قبروں پر جانے سے روک دیا تھا، لیکن اس کے بعد یہ رسم پھر جاری ہو گئی تھی، سکندر نے اس پر بھی پابندی لگا دی، علاوہ ازیں بہت سی جعلی قبریں وجود میں آ گئی تھیں، انھیں مسمار کرا دیا، چیچک کی دیوی سیتلا کی پرستش کو سختی سے روکا۔[۲۵]

مذہب سے اس شدید لگاؤ اور خدمتِ دین کے اس گہرے جذبے کے باوجود بادشاہ شراب نوشی کا عادی اور گانے کا شوقین تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شراب نوشی ایک خفیہ مرض کی وجہ سے کرتا تھا، جو درحقیقت اس کا علاج تھا۔

ذوقِ شعری

سکندر لودھی ذوقِ شعری بھی رکھتا تھا اور بہت اچھا شاعر تھا۔ گلرخی تخلص کرتا

---

[۲۴] طبقاتِ اکبری ص ۳۲۲، ۳۲۳

[۲۵] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۶۶ ۴ بحوالہ تاریخ داؤدی۔

تھا۔ عبدالقادر بدایونی نے اس کی ایک غزل کے یہ شعر نقل کیے ہیں:

سروی کہ سمن پیرہن و گل بدنستش | رو چیست مجسم کہ دران پیرہنستش
مشک ختن چیست کہ صد مملکت چین | در حلقۂ آن زلف شکن در شکنستش
گل رخ چہ کند جوہر دندانِ تر او صف | ہمچو در سیراب سخن در دہنستش
در سوزنِ مژگان بکشم رشتۂ جاں را | تا چاک بدوزم کہ دران پیرہنستش

اس کے ایک مصاحب کا نام مولانا جلال تھا۔ وہ بہت بڑے شاعر تھے۔ ابتدا میں جلالی تخلص کرتے تھے۔ بعد کو جمالی کا تخلص اختیار کر لیا تھا۔ سکندر اور جمالی کے تعلقات انتہائی گہرے اور دوستانہ تھے۔ ایک مرتبہ جمالی کسی معاملے میں سکندر سے خفا ہو کر خراسان کی طرف نکل گئے تھے اور دس سال سے زائد عرصہ تک عراق، عرب، عجم، روم، مصر، شام اور ماوراء النہر کے شہروں میں گھومتے رہے تھے۔ پھر دہلی پہنچے۔ سکندر ان دنوں بدایوں میں تھا۔ وہاں سے جمالی کے نام ایک منظوم خط لکھ کر بھیجا۔ اس خط میں مثنوی مہر و ماہ بھی ان سے طلب کی گئی تھی۔ وہ خط درج ذیل ہے:

اے مخزنِ گنج لا یزالی | اے سالکِ راہ دیں جمالی
در گرد جہاں بسے زدہ سیر | در منزلِ خود رسیدہ بالخیر
بودی تو مسافرِ زمانہ | الحمد کہ آمدی بخانہ
اے شیخ بما برس بزودی | بسیار مسافرت نبودی
بکشائے بسوئے در گہم گام | تا در یابی زگلرخی کام!
چشمم بجمالِ تو طپان است | دل مرغ مثال در فغان است
من سکندر تو خضر مائی | آں بہ کہ بسوئے ما بیائی
باید کہ کتاب مہر و ماہم | ارسال دہد چناں کہ خواہم
از مہر کشد دو دیدہ را نور | آں مہ نشود ز دیدہ ام دور

بعض تذکروں میں یہ دو شعر بھی اس خط میں مندرج ہیں:

در مکہ و مدینہ گشتی | گوہر بودی خزینہ گشتی

ور شیخ زِ دوستاں نشد سیر　　　تشریف نمود نش کشد دیر

بادشاہ نے شیخ سماء الدین کنبوہ کو بھی تحریر کیا کہ جمالی کو فوری طور پر اس کے پاس بدایون بھیجا جائے۔ چنانچہ شیخ نے جمالی کو مجبور کر کے بادشاہ کے پاس بھیجا اور ان سے کہا کہ فقرا کو بادشاہوں کی مجلس میں جانے سے گریز نہیں کرنا چاہیے، ان کے ذریعے سے بہت سے مساکین اور مستحقین کے مسائل حل ہو جاتے اور ان کی تکلیفیں رفع ہو جاتی ہیں۔

اس موقع پر مولانا جمالی اور مولانا جامی کی ملاقات اور ان کے تعلقات کا ذکر بھی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ مولانا جمالی جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا جا چکا ہے دربارِ سکندری کے نامور ادیب اور شاعر تھے۔ دہلی کے باشندے تھے۔ کنبوہ برادری سے تعلق رکھتے تھے، بچپن میں یتیم ہو گئے تھے، مگر بڑے ذہین اور طباع تھے ذاتی محنت و کوشش سے تعلیم و تربیت کی اونچی منزلوں پر فائز ہو گئے تھے، جس کا نتیجہ ہوا کہ بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے "بگانۂ روزگار و مجمع اطوار" ہوئے [۲۶] ان کا ذکر ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی کیا ہے [۲۷] درویش منش اور فقیر وضع تھے۔ اثنائے سفر میں ہرات پہنچے تو مولانا جامی سے ملاقات ہوئی۔ پہلی ملاقات میں تو جامی ان سے متعارف ہونے کے بجائے سخت خفا ہوئے۔ بعد کو جب ان کے جوہرِ فکری جامی کے سامنے کھلے تو دونوں میں گہری دوستی ہو گئی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ان کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ ان کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے:

بزرگوں سے سنا ہے کہ پہلی ملاقات میں مولانا جمالی نے اپنا حال کچھ ظاہر نہ کیا اور پاس جا بیٹھے۔ تن برہنہ، فقط لنگ باندھے تھے۔ فقیرانہ حالت تھی۔ جامی نے کہا۔ "میانِ تو و خر چند فرق است"؟ انھوں نے بالشت بیچ میں رکھ دی۔ [۲۸]

---

[۲۶] اخبار الاخیار، ص ۲۲۷۔　　[۲۷] منتخب التواریخ، ص ۳۲۶۔

[۲۸] منقول ہے کہ جمالی جب اس ہیئت کذائی کے ساتھ جس کا ذکر آزاد نے کیا ہے،

جامی نے تحمل کیا اور کہا "کیستی"؟ جمالی نے جواب دیا۔ "از خاکسارانِ ہند"! ان کا کلام جامی تک پہنچ چکا تھا۔ پوچھا۔ "از سخنانِ جمالی چیزے یاد داری"؟ جواب میں یہ شعر پڑھے:

دو سہ گز کے بوریا و پوستکے ۔۔۔ دلکے پُر درد دوستکے

لنگگے زیر و لنگکے بالا ۔۔۔ نے غمِ دُزد و نے غمِ کالا

ایں قدر بس بود جمالی را ۔۔۔ عاشقِ رند و لا اُبالی را

جامی بولے "طبع شعر داری"؟ یعنی کچھ کہتے ہو؟ جمالی نے جواب میں یہ مطلع پڑھا

مارا ز خاکِ کویت، پیراہنی است بر تن
آں ہم ز آبِ دیدہ، صد چاک تا بدامن

یہ کہا اور آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ بدن پر تمام گرد پڑی تھی۔ سینہ پر جو آنسو پڑے، گرد چاک چاک ہوگئی۔ جامی سمجھ گئے۔ اٹھ کر گلے ملے اور تعظیم و تواضع سے پیش آئے[۲۹]۔

یہ شعر بھی جمالی کی ایک غزل کے ہیں اور بڑے وجد آفریں ہیں:

طال شوقنی الی منازلکم ۔۔۔ ایہا الغائبون عن نظری

روز و شب مونسم خیالِ شماست ۔۔۔ فاسئلوا عن خیالکم خبری

شیخ جمالی دَورِ سکندری کے مشہور ادیب و شاعر اور نیک طینت بزرگ تھے۔ انھوں نے سیر العارفین کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی، جس کو بزرگانِ دین کے تذکرہ کی حیثیت حاصل ہے۔ بقول بدایونی کے۔ یہ کتاب "اگرچہ منزہ از اسقام

جامی کی مجلس میں بغیر کسی تعارف یا تمہید کے سیدھے مسندِ شاعر کے پہلو میں جا بیٹھے تو جامی نے بگڑ کر پوچھا۔ "میان شما و خر چہ قدر تفاوت است"، اس وقت ان میں اور جامی میں ایک بالشت کا فرق تھا۔ انھوں نے جواب دیا "یک وجب"۔ (آبِ کوثر حاشیہ ص ۴۶۱)

۲۹ دربارِ اکبری، بحوالہ آبِ کوثر ص ۴۶۱۔

و اغلاط نیست"، تاہم اس موضوع سے متعلق یہ کتب حوالہ میں سے ہے۔ مطبع رضوی دہلی میں ۱۳۱۱ھ کو طبع ہوئی۔ ۱۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

وفات

مؤرخین نے سلطان سکندر لودھی کی بہت تعریف کی ہے اور اس کی نیکی، خدا ترسی اور رعایا پروری کے مختلف واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں اور لکھا ہے کہ اس کے بعض واقعات و مشاہدات تو اس نوعیت کے ہیں کہ لوگ ان کو اس کی "کرامات" قرار دیتے تھے۔ شیخ عبدالحق دہلوی لکھتے ہیں:

وازوے نیز در باب فراست بلکہ کرامت حکایات نقل می کنند[۳۰]

یعنی اس کی فراست بلکہ کرامت کی بہت سی حکایات لوگ نقل کرتے ہیں۔

رزق اللہ مشتاقی کا کہنا ہے کہ داڑھی منڈانے کے علاوہ اس میں کوئی عیب نہ تھا:

در تمام اعمال و افعال او جائے انگشت نہ، الّا کہ ریش مے تراشید۔

اس کے اعمال و افعال میں کہیں بھی انگلی رکھنے کی گنجائش نہ تھی مگر یہ کہ داڑھی منڈاتا تھا۔

سکندر خناق کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا، اس کا علاج کرایا گیا مگر تکلیف روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ دورانِ تکلیف میں بادشاہ نے ایک دن اپنے امام شیخ لاڈن کو بلا کر حکم دیا کہ نماز، روزہ، داڑھی منڈانے، شراب نوشی کرنے اور (غلام اور لونڈیوں کے) کان و ناک کاٹنے کے کفارہ کی رقم کا تعین کر کے مجھے بتاؤ۔ پھر کہا:

خزانہ از بیت المال علیحدہ است ازاں بعلما و صلحا رساند۔

کہ خزانے سے جو بیت المال سے الگ ہے، یہ رقم علما و صلحا کی خدمت میں پیش کر دی جائے۔

ارضِ ہند کے اس خادمِ اسلام بادشاہ نے اٹھائیس ۲۸ سال پانچ ماہ تک بڑے شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی اور ۱۷ ذی القعدہ ۹۲۳ھ کو دارالسلطنت

---

[۳۰] اخبار الاخیار، ص ۲۲۷۔

آگرہ میں مرض خناق میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔

مولانا جمالی جو طویل سیر و سیاحت کے بعد، سکندر کے دربار میں واپس آگئے تھے اور مستقل طور پر دوبارہ اس کی مصاحبت اختیار کر لی تھی، بادشاہ کی وفات سے نہایت مغموم ہوئے اور ایک دردناک مرثیہ کہا۔ اس مرثیے کے چند شعر یہ ہیں:

خلق حیران و پریشانست شہنشاہ چہ شد ہمہ بر سینہ زنان دست کہ اللہ چہ شد
مہر در آتش غم سوخت، شفق خوں بارید انجم از چرخ فرو ریخت کہ آں ماہ چہ شد
ظلمت آباد شد آفاق ز شام غم او یارب آں طلعت خورشید سحرگاہ چہ شد
خون گرہ شد بگلو زآہ دمم شد مسدود در غم آنکہ مرا ہمدم و ہمراہ چہ شد
ویحک آں فرحت و آں بہجت و آں حال چہ شد ادریغ آں دولت و آں مسند و آں گاہ چہ شد
نیک خواہان وے ایں لحظہ اجل خواہ شدند کاں خداداں و خدا بین و خدا خواہ چہ شد

ہاتفم گفت مپندار کہ او در خاک است
قدمش ہمچو پیمبر بسر افلاک است

ابراہیم لودھی

سکندر کے بعد اس کے بیٹے ابراہیم لودھی نے باپ کی جگہ لی۔ اس کی زندگی کے وہ پہلو جو ہمارے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے اس کے مذہبی و دینی افکار کی کوئی جھلک قارئین کے سامنے آسکتی ہے، پردۂ خفا میں ہیں۔ بہت سے امرا و رؤسا اور علما و زعما کو جو سکندر کے زمانے میں بے حد اعزاز و اکرام کے مالک تھے، ابراہیم کے عہد میں مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا اور ان سے ذلیل کن سلوک روا رکھا گیا۔

مولانا جمالی کے بارے میں بھی اس کے دل میں کدورت پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے سکندر لودھی کی وفات پر جو مرثیہ کہا تھا، اس کا ایک شعر یہ تھا:

اے سلیمانِ زماں آہ کجائی آخر تا کنم پیشِ تو از فتنۂ دیوان فریاد

ابراہیم کے ایک مصاحب فرید نے سلطان سے یہ کہہ دیا کہ اس شعر میں جمالی نے تم کو اور تمام افغانوں کو "دیو"، سے تعبیر کیا ہے۔ بس اس نے یہ بات دل میں بٹھالی۔

جمالی خود لکھتے ہیں:

وآں فرید مذکور ایں بیت را درمیان انداخت و سلطان ابراہیم را با فغانان دیگر باز نمائید کہ شیخ جمالی شمارا دیو گفتہ است، چنانچہ سلطان را با فغانِ دیگر بکلی از من مکدر ساخت[۱۳۱]

بہرحال امرائے سلطنت سے اس تکدر اور ذہنی رنجش کا نتیجہ یہ ہوا کہ لودھی خاندان کی حکومت میں ضعف و نقاہت کے آثار پیدا ہو گئے اور اس کا تختِ حکومت تیزی سے ڈولنے لگا۔ خود لودھی خاندان کے بعض امرا نے جن میں دولت خان لودھی پیش پیش تھا، اس کے خلاف مضبوط محاذ قائم کر لیا۔ اس نے اپنے بیٹے خان خاناں کو ظہیر الدین بابر کے پاس کابل بھیجا تاکہ وہ ہندوستان پر حملہ کر کے ابراہیم لودھی کی حکومت کا خاتمہ کر دے اور اس ملک پر خود قابض ہو جائے۔ مختلف امرا کے درمیان کچھ عرصہ تک بابر کی مراسلت جاری رہی، بالآخر اس نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی اور بابر کی فوجوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا اور رجمادی الاخری ۹۳۲ھ کو ابراہیم لودھی کی فوج کو بابر کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست ہوئی اور خود ابراہیم کو قتل کر دیا گیا۔

سلطانِ ہند ابراہیم لودھی کی نعش خاک و خون میں لت پت پڑی پانی پت کے میدان میں انقلابِ دوراں کا مرثیہ پڑھ رہی تھی۔ اتنے میں جمالی نے آگے بڑھ کر بابر کو مبارک باد دی اور ساتھ ہی یہ شعر پڑھے:

زافغاں فغاں برآمد آں دم کہ شد حسامت   اشباح را مخرب ارواح را محصل
از صدمۂ سمندت ہر فیل کوہ پیکر   در خاک و خوں فرو شد ہمچوں حمار در گل

---

[۱۳۱] سیر العارفین، ص ۳۸

در حلقۂ سیاہت کامد عد و پُرا زخول چوں نقطہ زسرخی درچشم گشتہ داخل

لیکن اس موقع پر خود بابر کی حالت دگرگوں تھی اور وہ اس ہیبت ناک و عبرت خیز منظر کو دیکھ کر لرز رہا تھا، اس نے خود ابراہیم لودھی کا سر زمین سے اٹھایا اور احترام کے ساتھ دفن کیا۔

درآں حال عبرت بخش بر خود لرزید، سرِ او از خاک بر گرفت [۳۲]

اس عبرت ناک منظر سے خود (بابر) لرز گیا اور اس کا سر خاک میں سے اٹھایا۔

ابراہیم لودھی نے ہندوستان پر نو سال حکومت کی۔ اس کی موت کے ساتھ ہی ارضِ ہند میں لودھی خاندان کے چھہتّر سالہ دَورِ حکومت کی بساط ہمیشہ کے لیے اُلٹ گئی۔ رہے نام اللہ کا۔!

بابر

اب ہندوستان کی تاریخ ایک اور ورق الٹتی ہے اور یہ ملک لودھی خاندان کے قبضے سے نکل کر مغلیہ خاندان کے زیرِ نگیں آجاتا ہے۔ اس خانوادہ کا پہلا حکمران جس نے باقاعدہ حکومتِ ہند کی زمام ہاتھ میں لی، بابر ہے۔ اس کا شجرہ نسب یہ ہے۔ بابر بن عمر بن ابو سعید بن میران شاہ بن تیمور۔ بابر کا باپ شیخ عمر حنفی المذہب اور خوش عقیدہ آدمی تھا۔ پانچوں وقت کا نمازی تھا۔ اس کا زیادہ وقت قرآن شریف کی تلاوت میں صرف ہوتا تھا۔ خواجہ عبید اللہ احرار کا مرید تھا اور تاریخ کی کتابوں کا دلچسپی سے مطالعہ کرتا تھا [۳۳]

بابر کے نانا کا نام یونس خاں تھا۔ وہ مولانا شرف الدین یزدی کے صحبت یافتہ، علما و فضلا کی مجالسِ علمیہ میں بیٹھنے والے اور نیک سیرت بزرگ تھے۔ قرآن مجید

---

[۳۲] تاریخ شاہی ص ۹۸۔
[۳۳] تزک بابری

کی تلاوت سوز اور قرآت سے کرتے تھے۔ یعنی بابر ماں اور باپ دونوں طرف سے علمی گھرانے کا فرد تھا۔ ان دونوں گھرانوں کو بزرگانِ دین سے ہمیشہ قلبی اور روحانی تعلق رہا۔ اس کا نام ظہیر الدین بابر اس دور کے مشہور بزرگ خواجہ عبید اللہ احرار نے رکھا تھا۔

ولادت اور ابتدائی تعلیم

بابر کی تاریخِ ولادت ۶ محرم ۸۸۸ھ ہے۔ اس نے ابتدائی تعلیم شیخ فرید بیگ، بابا علی قلی خدائی بیروی بیگ اور خواجہ مولانا قاضی عبداللہ سے پائی۔ وہ اپنے تزک میں اپنے ان اساتذہ کی بہت تعریف کرتا ہے۔ علما میں سے وہ مولانا عبدالرحمان جامی، مُلا سعدالدین تفتازانی کی اولاد کے ایک بزرگ شیخ الاسلام سیف الدین احمد، علمِ کلام کے ماہر ملا حسن، میر جمال الدین محدث، عربی ادب کے استاذ میر عطاء اللہ مشہدی اور نامور فقیہ قاضی اختیار کا بے حد مداح ہے اور ان کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کرتا ہے۔

تخت نشینی

بابر بارہ برس کی عمر میں ۵ ارمضان ۸۹۹ھ کو فرغانہ کا بادشاہ ہوا —— بڑا باہمت اور انتہائی مستقل مزاج حکمران تھا۔ اس کی زندگی جنگ و قتال اور حرب ضرب کی ایک طویل داستان ہے۔ حریفوں سے کش مکش کے نتیجے میں اس کو اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑا۔ پھر حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ کابل میں حکومت قائم کرلی۔ اسی اثنا میں ابراہیم لودھی کے کئی با اثر امرا نے جو اس کے سلوک سے نالاں تھے، بابر سے مراسلت کی اور بعض لوگ خود کابل بھی اس کے پاس پہنچے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۹۳۰ھ میں بابر نے ہندوستان کی طرف کوچ کیا اور مختلف واقعات و منازل سے گزرتا اور حالات کے نشیب و فراز کا مقابلہ کرتا ہوا پانی پت کے میدان میں آ رُکا۔ اب پانی پت سے چھ کوس کے فاصلے پر بابر اور ابراہیم لودھی کی فوجیں ایک دوسرے کے قریب پڑاؤ ڈالے بیٹھی تھیں۔ بابر کے فوجیوں نے ابراہیم کے لشکر پر شب خون

مارنا شروع کیا۔ بالآخر ماہ رجب ۹۳۲ھ میں دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر اتریں اور لڑائی کے لیے صف آرا ہوئیں۔ ابراہیم لودھی کی فوج ایک لاکھ سوار اور ایک ہزار ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ اُدھر بابر کے لشکر میں صرف پندرہ ہزار سوار اور پیادے تھے۔ لڑائی کا آغاز ہوتے ہی صورت حال انتہائی ہولناک ہوگئی اور کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ الم ناکی کی انتہا اس وقت ہوئی، جب شاہِ ہند ابراہیم لودھی کا سر قلم کر دیا گیا۔ جنگ کی ہولناکی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مُلّا عبدالقادر بدایونی مصنف منتخب التواریخ لکھتے ہیں، اس جنگ کو ختم ہوئے دو قرن (۷۵ سال) گزر گئے، لیکن اب تک رات کو اس میدان سے بدستور دہ، ستاں، بکش اور بزن کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

۹۹۷ھ میں خود مصنفِ منتخب التواریخ صبح کے وقت لاہور سے فتح پور سیکری کی طرف جا رہا تھا، اس میدان سے گزرا تو یہی ہولناک آوازیں کان میں آئیں۔ جو لوگ ہمراہ تھے، وہ سمجھے کہ شاید دشمن آگئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو سنا تھا وہ خود دیکھا۔ خدا کی قدرت خدا کے حوالے کر کے ہم سب آگے بڑھ گئے۔[1]

اس فتح کے بعد بابر اسی روز دہلی گیا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھایا۔ شہزادہ ہمایوں اور دوسرے بڑے امرا کو آگرہ کی طرف جانے کا حکم ہوا۔ ابراہیم کا بہت بڑا خزانہ تھا، جو بابر کے ہاتھ آیا اور سپاہیوں میں تقسیم کیا گیا۔

تختِ ہندوستان جو اب تک بے شمار بادشاہوں کی داد و دہش کا نظارہ کر چکا تھا، ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ غازی کے قبضے میں آیا۔ لیکن یہ صرف تختِ ہندوستان تھا، پورا ملک ہندوستان اس کے قبضے میں ابھی نہ آیا تھا۔ مختلف راجے اور بہت سے حکمران اس وسیع ملک میں موجود تھے، ان کے ساتھ بابر کی لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا اور رانا سانگا کے ساتھ اس کی لڑائی کو تو خالص جہاد کا درجہ حاصل

---

[1] منتخب التواریخ ص ۳۴۲

تھا اور اس کا مقصد محض اعلائے کلمۃ اللہ تھا۔ یہ لڑائی ۹۳۳ھ میں ہوئی، اس میں راجپوت، ہندوستان کے راجے اور بابر کے حریف لودھی امراسب شامل تھے۔ ان کی فوج پونے دو لاکھ کے قریب تھی جو بابر کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح کھڑی تھی۔ بابر نے اس موقع پر جہاد کا نعرہ بلند کیا، اللہ سے فتح کی دعا مانگی اور شراب نوشی اور ریش تراشی ترک کی اور میدانِ غزا میں کود پڑا، اللہ نے اسے فتح سے نوازا۔

تبدیلیِ افکار

ہندوستان میں بابر کو جن حالات سے سابقہ پڑا اور وہ جن تکلیف دہ مراحل سے دوچار ہوا وہ اپنی جگہ نہایت عجیب وغریب ہیں۔ ان کی وجہ سے اس کے عمل وفکر کا دھارا بالکل بدل گیا اور اس کی زندگی کے شب وروز اور ہی قالب میں ڈھل گئے اس نے شراب نوشی ترک کر دی اور ریش تراشی سے تائب ہو گیا۔ اس سے متاثر ہو کر اور بھی بہت سے امیروں اور فوجیوں نے ان عیوب سے توبہ کی اور اپنا رشتہ و تعلق اللہ سے وابستہ کر لیا۔

ذوقِ شعری اور تصنیفات

بابر بہت سے اوصاف وکمالات کا مالک تھا۔ وہ نہایت متحمل مزاج اور نرم خو بادشاہ تھا۔ خطاکار کو معافی دینے اور اس پر اعتماد کرنے میں بڑا فراخ حوصلہ تھا۔ وہ بہترین شاعر بھی تھا۔ اس کا دیوان شاہی کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔

اس نے ۹۲۸ھ میں ایک مثنوی "مبین" اپنے لڑکے کامران کے لیے لکھی، جو مذہبی، فقہی اور اخلاقی مسائل کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کو "فقہ مبین" اور "فقہ بابری" کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک شرح شیخ زین الدین نے مبین کے نام سے تحریر کی۔

بابر کی یہ شدید خواہش تھی کہ ایک ایسی کتاب تصنیف کی جائے، جو مسائلِ شرعیہ کو محیط ہو۔ اس کے لیے اس نے حکم بھی جاری کیا۔ بعد ازاں شیخ نور الدین خوانی نے اس اہم کام کی انجام دہی کی ذمہ داری قبول کی جو شیخ زین الدین خوانی کی اولاد سے تھے۔

ہرات میں نشو و نما پائی، شیخ الاسلام سیف الدین احمد کے شاگرد تھے، جو مُلا سعد الدین تفتازانی کی اولاد سے تھے۔ انھوں نے مستند روایات و کتب سے مسائل شرعیہ کو ضبطِ تحریر میں لانا شروع کیا اور ہدایہ، شرح وقایہ، شرح مختصر وقایہ، کافی، فتاوی قاضی خان اور خزانہ وغیرہ کتبِ فقہ کی مدد سے ایک کتاب تیار کی جس کا نام فتاوی بابری رکھا۔

بابر نے اپنے مرشد خواجہ عبید اللہ احرار کے ایک منظوم رسالہ "والدیہ" کا ترکی میں قیامِ ہند کے زمانے میں ۹۳۵ھ کو ترجمہ کیا۔

رسائل عروض کے نام سے ترکی شاعری کے عروض پر ۹۳۲ھ میں ایک رسالہ لکھا۔ ۹۱۵ھ کو اس نے اپنے ایک ہم جلیس خواجہ کلاں کو قلعہ بجور کی نگرانی کے لیے بھیجا۔ اس کی جدائی سے پریشان ہو کر اس کو یہ قطعہ لکھا:

قرار و عہد بیار این چنیں نبود مرا گرید ہجر و مرا کرد بے قرار آخر
بہ عشوہائے زمانہ چہ چارہ سازد کس بجور کرد جدا یار را ازیار آخر

آخری مصرعہ میں قلعہ بجور کی رعایت سے لفظِ جور نے قطعہ میں خاص ادبی لطف پیدا کر دیا ہے۔

پانی پت کی لڑائی کے موقع پر بابر کو غیر ملکیوں سے واسطہ پڑا تو اجنبی ماحول اور اجنبی زبان سے وہ خود بھی پریشان ہوا اور اس کے ساتھی بھی بہت حیران ہوئے تو اس نے یہ شعر کہا:

شدہ جمع و بود جمع پریشان گرفتار قومے و قومے عجائب

بیانہ کا قلعہ فتح کیا تو اس کے حاکم نظام خاں کو وفاداری کے وعدہ و قرار پر قائم رہنے کی تاکید کی اور یہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔ اس میں بیانہ کی رعایت سے لفظِ بیان قابلِ ملاحظہ ہے:

باترک ستیزہ مکن اے میر بیانہ چالاکی و مردانگی ترک عیان است
گر زود نیائی و نصیحت نہ کنی گوش آنجا عیان است چہ حاجت بہ بیان است

اس نے اپنی جودتِ طبع سے ایک خاص خط ایجاد کیا، جس کا نام خطِ بابری تھا۔ اس خط میں قرآن مجید لکھ کر مکہ معظمہ بھیجا۔

اس خط کے بارے میں بدایونی لکھتا ہے :

واز جملہ غرائب واختراعات آں شاہ مغفرت پناہی خط بابریست کہ مصحفی بداں خط نوشتہ وبمکہ فرستادہ۔[۳۵]

عہدِ بابری کے علماء و فضلا

عہدِ بابری کے چند معروف علمائے دین کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

شیخ زین الدین۔ صدر کے عہدہ پر فائز تھے اور معقولات ومنقولات کے عالم تھے۔ رانا سانگا پر بابر نے فتح پائی تو اس خوشی میں مسلمانوں سے محصول لینا معاف کر دیا تھا۔ اس کے لیے شیخ زین الدین ہی نے فرمان لکھا جو تمام ملک میں بھیجا گیا۔

مولانا شہاب الدین معمائی۔ قرآن وحدیث پر وسیع نظر رکھتے تھے۔ شاعر بھی تھے حقیر تخلص کرتے تھے۔ معماگوئی میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔

ان کے علاوہ اور بھی متعدد علمائے کرام اور اصحابِ فن دربارِ بابری میں موجود تھے۔

کتب خانہ

بابر کا کتب خانہ متنوع کتابوں پر مشتمل تھا، وہ سفر وحضر میں اسے ساتھ رکھتا تھا۔ ۹۳۰ھ میں وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو لاہور کے قریب غازی خاں سے تصادم کی نوبت آئی۔ غازی خاں کو شکست ہوئی تو بابر قلعہ میں داخل ہوا، وہاں سے بے شمار دولت اس کے ہاتھ آئی، لیکن بابر کے نزدیک سب سے قیمتی سرمایہ غازی خاں کا کتب خانہ تھا۔ غازی خاں بڑا علم دوست تھا۔ شاعری کا بھی اعلیٰ مذاق رکھتا تھا۔ اس نے ہر قسم کی عمدہ اور خوش خط لکھی ہوئی کتابیں جمع کر

---

[۳۵] منتخب التواریخ ص ۳۴۳

رکھی تھیں۔ بابر نے ان کتابوں میں سے کچھ اپنے لیے مخصوص کیں، کچھ شہزادہ ہمایوں کو دیں اور کچھ کامران کے لیے کابل بھیج دیں۔

وصیّت

بابر انتہائی بہادر، معاملہ فہم، منصف، نیک سیرت، تدبیرِ حرب کا ماہر، صاف ذہن اور عقل مند بادشاہ تھا۔ فضا سے مستقبل کے آثار تلاش کر لینے اور لوگوں کے چہروں سے ان کے دلوں کی بات پڑھ لینے میں اسے کمال حاصل تھا۔ اس کا اندازہ اس کی وصیت سے ہو سکتا ہے جو اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کو کی۔ ہمایوں چوں کہ آگے چل کر اس ملک کی زمامِ حکومت ہاتھ میں لینے والا تھا، اس لیے یہ وصیت اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اس سے پتا چلتا ہے کہ بابر اس ملک کے باشندوں کی ذہنی و فکری خصوصیات پر کس طرح حاوی ہو گیا تھا۔

فرزندِ من! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمھیں اس ملک کا بادشاہ بنایا ہے۔ اپنی بادشاہی میں تمھیں حسب ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

۱۔ مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ نہ دینا، بلکہ لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا کامل احترام کرنا اور کسی رو رعایت کے بغیر سب کے ساتھ پورا انصاف کرنا۔

۲۔ گاؤ کشی سے بالخصوص پرہیز کرو، تاکہ اس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں تمھارے لیے عزت و احترام کی جگہ پیدا ہو جائے اور اس طرح وہ احسان اور شکریے کے سبب سے تمھارے مطیع ہو جائیں۔

۳۔ تمھیں کسی قوم اور اہلِ مذہب کی عبادت گاہ مسمار نہیں کرنی چاہیے اور ہمیشہ سب کے ساتھ پورا انصاف کرنا چاہیے۔ تاکہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ بنیادوں پر استوار ہوں اور ملک میں امن و امان رہے۔

۴۔ اسلام کی اشاعت ظلم و ستم کی تلوار کے بجائے لطف و احسان کی تلوار سے

زیادہ بہتر طریق سے ہو سکے گی۔

۵۔ شیعہ سنی اختلافات کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہو، اس کو اہمیت دینے سے اس ملک میں اسلام کی جڑیں کمزور ہوں گی۔

۶۔ اپنی رعایا کی مختلف خصوصیات کو سال کے مختلف موسم سمجھو تاکہ حکومت ضعف و اضمحلال کے مرض سے محفوظ رہ سکے[۳۶]

بابر کے بارے میں مؤرخین کی یہ رائے بہت حد تک قرینِ صواب ہے کہ وہ تمام اوصاف کا حامل ہونے کے باوجود مدبّر نہ تھا۔ اس نے اپنے زمانۂ بادشاہت میں نہ تو افغانستان میں اصلاحات کی طرف توجہ کی، نہ ہندوستان میں۔

وفات

بابر نے ۵ جمادی الاولیٰ ۹۳۷ھ کو انتقال کیا۔ اس نے کل پچاس برس عمر پائی۔ بارہ سال کی عمر میں تاجِ شاہی سر پہ رکھا۔ اڑتیس[۳۸] برس حکومت کی، جس میں پانچ برس ہندوستان کے زمانۂ حکومت کے بھی شامل ہیں۔

بابر کے حالات تزوک بابری، منتخب التواریخ، اکبر نامہ، طبقاتِ اکبری، مآثر رحیمی، منتخب اللباب، سیر المتاخرین اور تاریخ فرشتہ وغیرہ کتبِ تاریخ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

ہمایوں

بابر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نصیر الدین محمد ہمایوں ہندوستان کا تخت نشین ہوا۔ اس کی ولادت ۴ ذی القعدہ ۹۱۳ھ کو کابل کے قلعہ میں ہوئی۔ اس نے حکومت و سطوت کی گود میں پرورش پائی اور بادشاہوں کی اولاد کی طرح فنونِ جنگ

---

[۳۶] رودِ کوثر ص ۲۳، بحوالہ ترجمہ از انڈین اسلام (ٹائی ٹس) اس وصیت کی ایک نقل سٹیٹ لائبریری بھوپال میں موجود ہے۔

اور اصولِ حرب میں مہارت پیدا کی۔ ترکی فارسی، علمِ ہیئت، ہندسہ، نجوم، شعر اور معما گوئی میں ماہر تھا۔ رصد گاہیں تعمیر کرنے میں پوری دستگاہ رکھتا تھا۔ شیخ جلال الدین ٹھٹھوی سندھی، شیخ ابو القاسم جرجانی، مولانا الیاس اردبیلی، نور الدین سفیدونی اور علامہ قطب الدین رازی سے مختلف علوم و فنون کی تحصیل کی۔ ہمایوں کا زیادہ وقت مطالعہ کتب میں صرف ہوتا تھا۔

ہمایوں نے اپنے باپ کی وفات کے بعد ۹ جمادی الاولیٰ ۹۳۷ھ کو آگرہ میں اُدھر ہندوستان کا تاجِ شاہی سر پہ رکھا اور ادھر مخالفتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے بھائی بھی مخالفوں کی فہرست میں شامل تھے لیکن مخالفین کے مقابلے میں ہمایوں کا رویہ فراخ دلانہ تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ مخالفوں میں سے کچھ لوگ والیِ گجرات سلطان بہادر سے جا ملے تھے۔ ہمایوں نے بار بار سلطان بہادر کو خط لکھ کر ان کی واپسی کا مطالبہ کیا مگر اس نے ہمیشہ نفی میں جواب دیا اور ہمایوں کے خطوں کو کوئی اہمیت نہ دی۔ مجبوراً ہمایوں کو تسخیر گجرات کا ارادہ کرنا پڑا۔ اس کے لیے وہ آگرہ سے روانہ بھی ہو گیا مگر جب اسے معلوم ہوا کہ سلطان بہادر خود چتوڑ کا محاصرہ کیے بیٹھا ہے تو وہ سارنگ پور میں رک گیا اور اس کے اخلاقِ شجاعت نے اجازت نہ دی کہ ایسے وقت میں جب کہ سلطان بہادر چتوڑ کے محاصرے میں مصروف اور دشمن سے برسرِ پیکار ہے، اس پر فوج کشی کی جائے۔ اس کو دشمن سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کر لینا ہمایوں نے شیوۂ مردانگی کے خلاف گردانا۔

یوں تو ہمایوں کے مخالفوں اور حریفوں کی فہرست بڑی وسیع ہے لیکن تاریخ ہند اس کے جس حریف کا بہت بڑے عنوان کے ساتھ ذکر کرتی ہے اور اس کے بوقلموں نقوشِ حکمرانی کو اپنے صفحات میں نمایاں طور سے پیش کرتی ہے، وہ شیر خاں سوری ہے۔ شیر خاں معمولی حیثیت سے ترقی کر کے یہاں تک پہنچا کہ اس نے ہندوستان کے عظیم فاتح بابر کے بیٹے شہنشاہِ ہند ہمایوں کے ساتھ پنجہ آزمائی کی، اس کے بھائیوں کو بھی اس کے مقابلے میں لا کھڑا کیا اور آسانی کے ساتھ انھیں اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمایوں کو تمام اطلاعات

برابر پہنچ رہی تھیں لیکن اس کی عادت تھی کہ لڑنے پر آتا تو مسلسل لڑتا ہی رہتا اور کئی کئی مہینے میدانِ جنگ ہی میں گزر جاتے۔۔۔ آرام کرنے لگتا تو ایک مدت آرام ہی میں گزار دیتا۔ جب اس کو اطرافِ ملک سے مسلسل کئی قسم کی خطرناک خبریں ملنے اور شیر خاں کی سرگرمیوں کی پیہم اطلاعات پہنچنے لگیں تو اس نے آگرہ سے حرکت کی اور مختلف مقابلے اور محاربے کرتا ہوا بنگال جا پہنچا۔ ہمایوں کی اس پیش قدمی کی خبر شیر خاں کو ملی تو اس نے جھاڑ کھنڈ کے راستے سے یلغار کی اور قلعہ رہتاس کے دروازے پر جا دستک دی۔ شیر خاں نے رہتاس کے راجہ سے درخواست کی کہ پردہ نشین عورتیں میرے ساتھ ہیں، آپ کا قلعہ بہت مضبوط اور محفوظ ہے۔ میں ان عورتوں کو اس قلعہ میں چھوڑنا چاہتا ہوں۔ رہتاس کا راجہ لالچ میں آگیا، اس نے اس خیال سے کہ عورتوں کا مال و دولت ہاتھ آئے گا، اجازت دے دی اور قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ شیر خاں نے پردہ دار ڈولوں میں دو ہزار مسلح سپاہیوں کو بٹھا کر قلعے کے اندر بھیج دیا۔ جب ڈولے رکھے گئے تو بجائے عورتوں کے خون خوار سپاہی تلواریں سونت کر باہر نکل آئے اور قلعہ کے محافظوں اور مکینوں کو تلوار کی دھار پر رکھ لیا۔ اس طرح شیر خاں آسانی سے قلعہ پر قابض ہو گیا۔

ہمایوں بنگال سے واپس آیا تو راستے میں شیر خاں گھات لگائے بیٹھا تھا اور اس اثنا میں اس نے کافی فوج بھی جمع کر لی تھی۔ ہمایوں کے لشکر کی بے سروسامانی کا علم بھی شیر خاں کو ہو چکا تھا۔ جوسہ کے مقام پر شیر خاں کی فوج نے آگے بڑھ کر شاہی لشکر کا راستہ روک لیا۔ دریائے گنگا کی شاخ رماہی ندی برسات کے پانی سے لبریز چل رہی تھی۔ اس ندی کے دونوں کناروں پر فریقین نے مورچے جما لیے۔ تین ماہ تک برابر لڑائی ہوتی رہی، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ایک روز ہمایوں نے ملا عزیز کو شیر خاں کے پاس صلح کا پیغام دے کر بھیجا۔ ان سے شیر خاں پہلے سے متعارف تھا۔ وہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ سخت گرمی میں شیر خاں آستینیں چڑھائے اور پھاوڑہ ہاتھ میں لیے خندق کھود رہا ہے اور پسینے سے شرابور ہے۔ ملا محمد عزیز کو دیکھ کر اس نے ہاتھ دھوئے۔ ان کے لیے شامیانہ نصب کرایا اور خود بلا تکلف وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ جب بادشاہ کا پیغام

سن چکا تو جواب میں کہا :

"میری طرف سے ہمایوں بادشاہ کو اتنا جا کر کہہ دیجیے کہ تم خود لڑنا چاہتے ہو لیکن تمھارا لشکر لڑنے پہ رضامند نہیں، اور میں لڑنا نہیں چاہتا مگر میرا لشکر لڑائی پر مُصر ہے۔"

اس سے کچھ دن بعد خود شیر خاں نے شیخ خلیل کو ہمایوں کے پاس بھیجا۔ شیخ خلیل ایک مشہور بزرگ تھے جو شیخ فرید شکر گنج کی اولاد سے تھے اور شیر خاں کے پیر تھے شیر خاں نے ان سے کہا، وہ بادشاہ سے کہہ دیں کہ "میں بنگال کے سوا اور کسی علاقے سے سروکار نہیں رکھتا۔ اگر یہ علاقہ مجھے دے دیا جائے تو وہاں بھی خطبہ اور سکّہ بادشاہ کے نام کا ہوگا۔" کہتے ہیں اس نے یہ عہد حلف اٹھا کر کیا۔ ہمایوں اس پر اعتماد اور یقین کر کے صلح پہ رضامند ہو گیا اور پوری طرح مطمئن ہو کر ندی پہ پُل باندھنے کا حکم دیا تاکہ دوسرے دن صبح کوچ کیا جائے۔

لیکن شیر خاں کا یہ پیغامِ صلح محض دھوکا تھا۔ اس نے دوسرے روز علی الصبح شاہی لشکر پر اچانک حملہ کر دیا۔ ہمایوں کی فوج بالکل بے خبر تھی۔ پریشانی میں اس کو صف آرائی کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیر خاں کے ایک ہی حملے سے ہمایوں شکست کھا گیا۔ جو پُل اس نے ندی عبور کرنے کے لیے تیار کرایا تھا، پٹھانوں نے توڑ دیا اور ان کے توپچیوں اور تیر اندازوں نے کشتیوں میں بیٹھ کر ہمایوں پر گولوں اور تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس ناگہانی حملے میں ہمایوں کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔ بادشاہ نے گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ جب ڈوبنے لگا تو ایک سقّے نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی مدد کی اور دریا پار کرایا۔ اس وقت شیر خاں نے یہ شعر کہا :

فرید حسن را نو شاہی دہی
سپاہ ہمایوں بہ ماہی دہی

اس کے استاد نے اس کو اس طرح اصلاح دی :

یکے را برآری و شاہی دہی
سیاہ ہمایوں بہ ماہی دہی

یہ واقعہ ۹۴۶ھ میں پیش آیا۔

اس کے بعد شیر خاں نے بنگال کے علاقے پر فوج کشی کی اور متعدد لڑائیوں کے بعد سارا بنگال اس کے قبضے میں آگیا۔ وہاں اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھا اور شیر شاہ کے خطاب سے تخت نشین ہوگیا۔ اس سے اگلے سال شیر شاہ نے بہت بڑی تیاری کے ساتھ آگرہ کا عزم کیا۔ اب ہمایوں کے بھائی اور بعض امرائے سلطنت ذہنی اور عملی طور پر ہمایوں کے مزید مخالف ہوگئے تھے اور شیر شاہ کو یہ خبریں برابر موصول ہو رہی تھیں، جس سے اس کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ تاہم شیر شاہ کے حملے کی اطلاع پاکر ہمایوں مقابلے کو نکلا لیکن بھائیوں کی بے وفائی کی وجہ سے پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور عین میدانِ جنگ میں ہمایوں کے ساتھیوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ مجبوراً بادشاہ نے گھوڑا گنگا میں ڈال دیا اور پانی کے شدید بہاؤ میں پشت کی طرف سے دریا میں گر پڑا۔ اس وقت شمس الدین محمد غزنوی نے مدد کی اور بادشاہ کو دریا عبور کرایا۔ وہاں سے ہمایوں آگرہ گیا، مگر شیر شاہ برابر تعاقب میں چلا آرہا تھا، اس لیے وہ وہاں بھی نہ ٹھہر سکا اور فوراً پنجاب چلا گیا — یہ لڑائی ۹۴۷ھ میں ہوئی۔

ہمایوں نے لاہور پہنچ کر آئندہ اقدام کے بارے میں غور کرنا شروع کیا، مگر بھائیوں میں سخت پھوٹ پڑ چکی تھی۔ آخر فیصلہ ہوا کہ کشمیر فتح کیا جائے تاکہ بادشاہ وہاں چلا جائے۔ چنانچہ شاہی فوج اور بعض کشمیریوں کی مدد سے ۲۲ رجب ۹۴۷ھ کو کشمیر پر قبضہ کرلیا گیا۔ اسی اثنا میں پتا چلا کہ شیر شاہ نے پنجاب کا رُخ کرلیا ہے اور اس کی فوجیں لاہور سے صرف بتیس کوس دُور رہ گئی ہیں۔ یہ سُن کر ہمایوں دریائے راوی عبور کرکے لاہور سے نکل گیا۔ اس وقت محدود تعداد پر مشتمل فوج اس کے ساتھ تھی اور وہ اپنی حاملہ بیوی کے ساتھ اونٹ پر سوار تھا۔ اس قافلے کا رُخ علاقہ سندھ کی طرف تھا۔ امرکوٹ (یا عمرکوٹ) پہنچے تو ۵ رجب ۹۴۹ھ کو شہزادہ اکبر پیدا

ہوا۔ یہ لوگ راستے میں علاقائی حکمرانوں سے لڑتے جھگڑتے اور بھوک پیاس کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے سندھ عبور کرکے ایران جا پہنچے۔ وہاں سے شاہ طہماسپ صفوی سے مدد لے کر ہمایوں نے قندھار اور کابل پر حملہ کیا اور ان شہروں کو فتح کرنے کے بعد وہاں ایک مضبوط فوج منظم کی اور پھر ہندوستان پر حملہ کرکے اسے دوبارہ فتح کیا۔

یہ ہمایوں کے لیے سخت آزمائش اور مصیبت کا دور تھا۔ ہندوستان کی وسیع سرزمین اس کے لیے تنگ ہوگئی تھی۔ شیر شاہ مسلسل اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا اور اس کو کہیں ٹھہرنے اور قدم جمانے کا موقع نہ ملتا تھا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور ہندوستان پر حملے اور قبضے کی تیاریوں میں مصروف رہا۔ آئندہ سطور میں شیر شاہ سوری اور اس خاندان کے ان افراد کا ذکر کیا جائے گا جو ہمایوں کے بعد تختِ ہند پر متمکن ہوئے۔ اس کے بعد پھر ہمایوں کا تذکرہ کیا جائے گا۔ ہمایوں کا برِصغیر میں یہ پہلا دورِ حکومت ہے جو دس سال (۹۳۷ھ تا ۹۴۷ھ) پر مشتمل ہے۔

شیر شاہ سوری

ہندوستان کی تاریخ اب ایک اور شخص کو ابھارتی اور اس ملک کے بادشاہ کی حیثیت سے سامنے لاتی ہے۔ وہ ہے شیر شاہ سوری۔ شیر شاہ کا اصل نام فرید خاں تھا۔ اس کے باپ کا نام حسن اور دادا کا ابراہیم تھا۔ ابراہیم درحقیقت افغانستان کے علاقہ رن کا رہنے والا تھا اور وہاں کے سور خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ سلطان بہلول لودھی کے عہدِ حکومت میں ہندوستان آیا اور اس کے لشکر میں ملازم ہوگیا اور عرصہ تک حصار فیروزہ اور نارنول میں کارپرداز رہا۔ ابراہیم کی وفات کے بعد اس کے بیٹے حسن نے سلطان سکندر لودھی کے ایک امیر جمال خاں کی ملازمت اختیار کرلی۔ اسے جمال خاں کی طرف سے سہسرام اور خواص پور قلعہ رہتاس کے ماتحت پرگنے جاگیر میں ملے۔ پانچ سو سوار اس کی نگرانی اور ماتحتی میں خدمات انجام دیتے تھے۔ حسن کے

آٹھ بیٹے تھے جن میں ایک فرید خاں تھا۔ جاگیر کی تقسیم اور انتظام کے سلسلے میں فرید خاں کی باپ اور بھائیوں سے چپقلش ہوگئی اور اس نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جون پور کی راہ لی۔ جون پور اس زمانے میں مرکزِ علم و فضل تھا۔ وہاں اس نے طالب علمی کی زندگی اختیار کرلی۔ مشہور اساتذہ سے کافیہ اور اس کی شرح (مصنفہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی) سکندر نامہ، گلستاں، بوستاں اور دوسری درسی کتابیں باقاعدہ سبقاً سبقاً پڑھیں اس کے اوقات جون پور کے مدرسوں اور خانقاہوں میں گزرتے تھے، جہاں وہ علما و صلحا سے استفادہ کرتا، اپنی قابلیت بڑھاتا اور فکر و ذہن کی تربیت و اصلاح کے سامان بہم پہنچاتا تھا۔

اس کے بعد باپ سے صلح ہوگئی اور اسے جاگیروں کے انتظام و انصرام پر مامور کردیا گیا۔ اپنی اس عمل داری کے زمانے میں فرید خاں نے بڑے عدل و انصاف اور حسنِ انتظام کا ثبوت دیا اور عقل مندی و زیرکی سے اپنے خطرناک حریفوں کا خاتمہ کردیا۔ اس کا یہ انتظامی دور بہت مختصر رہا اور بعض معاملات میں باپ سے پھر اختلاف پیدا ہوگیا۔

اب سلطان ابراہیم لودھی کا دورِ حکومت تھا۔ فرید خاں آگرہ چلا گیا اور وہاں سلطان کے ایک سردار دولت خاں کی ملازمت اختیار کرلی۔ ایک روز اس نے ابراہیم لودھی سے اپنے باپ (حسن) کی شکایت کی۔ سلطان نے خفگی کا اظہار کیا اور کہا، "یہ تو بہت غلط آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا باپ اس سے ناراض ہے اور یہ الٹا اس کی شکایت کرتا ہے۔"

کچھ عرصہ بعد حسن وفات پاگیا تو دولت خاں نے اس کی جاگیر کے پرگنے فرید خاں کو واپس دلا دیے اور وہ خاصی مدت تک جاگیروں ہی میں رہا لیکن بھائیوں سے مخاصمت کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ بعد ازاں بہار چلا گیا اور سلطان محمد خاں کا ملازم ہوگیا، جس نے سلطان ابراہیم لودھی کے قتل کے بعد بہار میں اپنی حکومت قائم کرلی تھی اور اپنے نام کا خطبہ اور سکہ بھی جاری کرلیا تھا۔ ایک دن فرید خاں نے سلطان محمد خاں

کی رکاب میں شیر کا شکار کیا۔ اس کی بہادری سے متاثر ہو کر سلطان نے اس کو "شیر خاں" کا خطاب عطا کیا اور یہ فرید خاں کے بجائے شیر خاں کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اب شیر خاں انقلابِ احوال سے دوچار اور حالات کے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا بابر کے دربار میں جا پہنچا اور سلطان جنید برلاس کی سفارش سے جو بابر کی طرف سے مانک پور اور کڑہ کا حاکم تھا، شاہی ملازمین کی سلک میں منسلک ہو گیا۔ ایک مرتبہ بابر چندیری کے سفر پہ روانہ ہوا تو شیر خاں اس کے ہم رکاب تھا۔ شیر خاں ذہین اور تیز فہم آدمی تھا۔ اس سفر میں اس کو اندازہ ہوا کہ مغل حکمران امورِ مملکت اور ملک میں بنیادی اصلاحات کے نفاذ کی ضرورت سے بے پرواہے، اور رشوتیں لے کر عمالِ حکومت لوگوں کے معاملات کو بگاڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر شیر خاں کو یقین ہو گیا کہ مغلوں سے بادشاہت چھین لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے، بس کمرِ ہمت باندھ لینے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس وقت سے وہ حصولِ اقتدار کی تدبیروں میں لگ گیا۔

ایک روز بابر نے کھانا کھاتے وقت دسترخوان پہ شیر خاں کی کوئی گستاخانہ اور خلافِ ادب حرکت دیکھی تو ایسے الفاظ استعمال کیے جن سے شیر خاں کی مخالفت کا اظہار ہوتا تھا۔ اہلِ مجلس نے بھی موقع پا کر شیر خاں کی خودسری اور باغیانہ خیالات بابر کے گوش گزار کیے۔ شیر خاں خوف زدہ ہو کر شاہی لشکر سے بھاگ گیا اور واپس اپنی جاگیر میں چلا گیا۔ تاہم اس اثنا میں وہ آرام سے نہیں بیٹھا۔ مختلف امرا و حکام سے ملنے اور تعلقات بڑھانے میں مصروف رہا۔

پھر ہمایوں تخت نشین ہوا تو شیر خاں اس سے بھی ملا۔ بعد کو بعض معاملات میں اس سے شدید اختلاف پیدا ہو گیا اور نوبت لڑائی تک پہنچی۔ لڑائی میں بھائیوں اور ساتھیوں کی بے وفائی اور شیر خاں کے حسنِ تدبیر سے ہمایوں کو شکست کھا کر ۹۴۷ھ میں راہِ فرار اختیار کرنا پڑی اور شیر خاں نے شیر شاہ کا لقب اختیار کر کے ہندوستان کا تاجِ شاہی سر پہ رکھا۔ یہ ہے اس کے زمامِ اقتدار ہاتھ میں لینے اور ہندوستان کے تختِ حکومت پر قابض ہونے کا مختصر پس منظر! اس میں واقعات کی اور بھی متعدد کڑیاں

ایک دوسری سے ملی ہوئی ہیں، مگر ہم ان سے تعرض کیے بغیر جلد جلد آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور بتانا چاہتے ہیں کہ اب برِصغیر کی تاریخ بادشاہت نے سوری خاندان کے لیے اپنا دروازہ کھول دیا اور نہایت شان و شوکت کے ساتھ آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔

شیر شاہ سوری کا دورِ حکمرانی

شیر شاہ بڑا مدبر، عالم و فاضل، علما کا دوست و ہمدرد اور عادل و منصف بادشاہ تھا۔ اس نے ملک میں باقاعدہ اصلاحات جاری کیں اور اپنی قلمرو کو نظم و نسق کی مضبوط لڑی میں پرو دیا۔ رعایا کا بدرجہ غایت خیر خواہ تھا اور اس کو ہر اعتبار سے آرام و آسائش بہم پہنچانے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ اس نے بنگال سے لے کر اٹک تک جو پورے چار ماہ کا راستہ تھا، ایک عظیم شہراہ بنائی، جو پندرہ سو کوس لمبی تھی، اس میں آگرہ سے لے کر مانڈو تک ہر کوس پر ایک سرائے، مسجد اور پختہ کنواں تعمیر کرایا اور ہر مسجد میں ایک امام اور موذن مقرر کیا۔ پانی کی بہم رسانی کے لیے مختلف مقامات پر سقّے مقرر کیے۔ ہندوؤں کے لیے ہندو سقّے کا علیحدہ انتظام کیا۔ اس طویل شہراہ پر دو رویہ درخت لگائے گئے تاکہ مسافر دھوپ سے محفوظ رہیں۔ راستوں کی مسافت کا اندازہ کرنے کے لیے میل نصب کرائے۔

اس نے اپنی مملکت میں دیانت دار قاضی اور منصف مقرر کیے۔ اس کے عدل و انصاف کی شہرت، ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی تھی۔ بدایونی کے الفاظ ہیں کہ بڑھیا بھی اگر جنگل میں سونے کا تھال اچھالتی ہوئی چلی جاتی، تو کسی کو مجال نہ تھی کہ اسے ٹیڑھی نظر سے دیکھے۔ بدایونی منتخب التواریخ میں اس کی معدلت گستری کی تعریف میں لکھتا ہے: "میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ میری پیدائش ماہ ربیع الثانی ۹۴۷ھ میں اس عادل بادشاہ کے زمانے میں ہوئی۔"

شیر شاہ جنگی تدبیروں کا ماہر تھا اور حزم و احتیاط کے ساتھ میدانِ جنگ میں اترتا تھا۔ وہ عموماً مقابلے کے بجائے حکمت عملی سے لڑائی جیتنے کا خواہاں ہوتا۔

اس کے دورِ حکمرانی کو برِ صغیر میں زرّیں دور سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن افسوس ہے اس کو اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع نہ ملا۔ پوری زندگی ہنگاموں میں گزری، حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں آئی تو عمر ڈھل چکی تھی۔ وہ آئینہ دیکھ کر کہا کرتا تھا :

"افسوس ہے مجھے اس وقت حکومت ملی جب میری زندگی کی شام ہو چکی تھی۔"

شیر شاہ کے زمانے میں حرمین شریفین کا سفر انتہائی دشوار گزار اور خطرناک تھا۔ ڈاکوؤں اور لٹیروں نے راستے روک رکھے تھے، اور حجاج کے قافلے خطرات میں گھرے رہتے تھے۔ شیر شاہ حجاج کے راستوں کو لٹیروں سے محفوظ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا اور اس ضمن میں شاہِ روم سے گفتگو کر کے کسی آخری نتیجے پر پہنچنے کا خواہاں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر ملک کے مسلمان بادشاہ اس میں تعاون کریں اور مشترکہ طور سے ایک شاہراہِ امن بنائیں۔ وہ مشہور عالم دین سید رفیع الدین محدث کو اپنا وکیل و نمائندہ بنا کر حرمین شریفین بھیجنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا، لیکن افسوس ہے دستِ اجل نے اس کی مہلت نہ دی۔

اس نے بندوبستِ اراضی کا اہتمام کیا اور زمینداروں اور مزارعوں سے غیر ضروری مالیہ کی وصولی کا سلسلہ ختم کیا۔ تاجروں کو بھی محصولات کی کثرت سے نجات دلائی۔

علاؤ الدین خلجی کے بعد یہ برصغیر کا پہلا بادشاہ تھا جس نے ملک میں بنیادی اصلاحات جاری کیں اور فوج اور دیگر محکموں کو اس دور کے جدید تقاضوں کے مطابق منظم کیا۔ وہ علما کی بے حد قدر کرتا اور دینی معاملات میں ان سے مشورے لیتا تھا۔ اس کے عہدِ حکومت کے علمائے کرام کے حالات کتاب کے آئندہ اوراق میں مرقوم ہیں۔

اس نے مختلف امور کی انجام دہی کے لیے اپنے اوقاتِ شب و روز کو چند حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ کچھ حصے عبادت کے لیے، کچھ عدل و قضا کے لیے اور کچھ اصلاحِ عساکر کے لیے مخصوص تھے۔ اس کا معمول تھا کہ رات کے تیسرے حصے میں بیدار ہو جاتا، غسل کر کے نمازِ تہجد پڑھتا اور وظائف و اوراد میں مصروف

ہو جاتا۔ پھر مختلف محکموں کے حسابات دیکھتا اور متعلقہ حکام و امرا سے گفتگو کر کے اس دن کے ضروری اور اہم امور کے سلسلے میں ان کو ہدایات دیتا۔ بعد ازاں نماز فجر جماعت کے ساتھ ادا کرتا اور وظائف میں مشغول ہو جاتا۔ نماز و وظائف سے فارغ ہونے کے بعد امرا سے گفتگو کرتا، پھر نمازِ اشراق پڑھتا۔ بعد ازاں اہلِ حوائج سے ان کی ضروریات سے متعلق گفتگو کرتا اور انھیں ان کی ضرورت کی چیزیں مثلاً گھوڑے، سامان اور ضروری اموال وغیرہ عطا کرتا۔ پھر مظلومین و مستحقین کی طرف عنانِ توجہ مبذول ہو جاتی، ان کی داد رسی و حق رسی کے لیے مناسب احکام جاری کیے جاتے۔ اہلِ عساکر کو وہ بالخصوص مرکزِ توجہ ٹھہراتا تھا۔ عسکری نظام کو مضبوط بنانے کے لیے وہ اس کے عہدہ داروں سے بہت ہی تفصیل سے گفتگو کرتا۔ پھر امراء سفرا اور وکلائے سلطنت کو شرف باریابی بخشتا اور ضروری احکام جاری کرتا، ڈاک خود پڑھتا اور اس کے جواب لکھواتا، مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کی درخواستیں وصول کرتا اور ان پر مناسب فرامین تحریر کراتا۔ پھر علما و مشائخ کی صحبت میں مسائل و احکام کی مجلس منعقد کرتا اور پیش آئند امور کے بارے میں ان سے شرعی نقطہ نظر سے مشورے لیتا اور ان کو عملی جامہ پہناتا۔ اتنے میں ظہر کی نماز کا وقت ہو جاتا اور باجماعت نماز ادا کرتا۔ نماز کے بعد تلاوتِ قرآن میں مصروف ہو جاتا۔ اس نے اپنے عمال و حکام کے نام یہ حکم جاری کر رکھا تھا کہ عدل و انصاف میں قطعی طور سے کوتاہی نہ کی جائے اور اس باب میں کافر و مسلم، امیر و غریب اور چھوٹے بڑے کے درمیان کوئی امتیاز روا نہ رکھا جائے۔ اس نے قضات کے نام فرمان جاری کیا تھا کہ نماز باجماعت کی ہر حال میں پابندی کی جائے۔ رشوت اور طمع و حرص کو اس نے اپنی مملکت سے ختم کر دیا تھا۔ باغیوں، چوروں، لٹیروں اور راشیوں کا سخت دشمن تھا اور ان کو شدید سزا دیتا تھا۔ غرض اس کا عہدِ حکومت ہر اعتبار سے مثالی تھا۔

وفات

شیر شاہ کی زندگی کا بیشتر حصہ میدانِ جنگ میں گزارا اور اس کی موت بھی اسی

حالت میں واقع ہوئی۔ ۹۵۲ھ میں اس نے قلعہ کالنجر کا محاصرہ کیا، جو ہندوستان کا ایک نہایت مضبوط اور مستحکم قلعہ تھا۔ قلعہ کی فصیل کے گرد سرنگیں کھودی گئیں، ان سرنگوں کے ذریعے مسلمان بہادر قلعے میں داخل ہوئے۔ قلعے کے اندر شیر شاہ کی نگرانی میں بارودی گولے دشمن پر پھینکے جا رہے تھے۔ اتفاق سے ایک گولا قلعے کی دیوار سے ٹکرا کر شاہی لشکر میں لوٹ آیا اور پھٹ گیا۔ اس کے اثر سے وہاں پڑے ہوئے تمام گولے پھٹ گئے اور ہر طرف آگ پھیل گئی۔ شیر شاہ بھی شعلوں کی لپیٹ میں آگیا، اور سارا جسم جل کر سیاہ ہو گیا۔ بارودی مورچے کے قریب ہی بادشاہ کے لیے ایک چھوٹا سا خیمہ نصب کر دیا گیا تھا۔ شیر شاہ اسی نازک حالت میں دوڑتا ہوا اس خیمے میں پہنچا۔ فوج دشمن پر یورش کر رہی تھی اور بادشاہ خیمے میں بے ہوش پڑا تھا۔ جب ہوش آتا تو چلا چلا کر لوگوں کو قلعہ فتح کرنے پر اکساتا۔ کوئی اسے دیکھنے جاتا تو اسے محاذ پر جانے کا اشارہ کرتا۔ جاں بلب بادشاہ کے اس عزم کو دیکھ کر فوج کے حوصلے اور بڑھ جاتے۔ شیر شاہ حالت اضطراب و بے قراری میں بار بار قلعہ کی فتح کے بارے میں دریافت کرتا۔ اس دن سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ شیر شاہ کے جسم پر صندل اور گلاب کا لیپ کیا گیا۔ تکلیف برابر بڑھتی گئی۔ جوں ہی بادشاہ نے فتح کی خوش خبری سنی، جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ یہ حادثہ ۱۲ ربیع الاول ۹۵۲ھ کو پیش آیا۔ اس کا آبائی قبرستان سہسرام میں تھا، میت وہیں لے جا کر دفن کی گئی۔

شیر شاہ سوری نے پندرہ برس تک سرداری اور حکومت کی اور تقریباً پانچ سال ہندوستان کا خود مختار بادشاہ رہا۔ اس کا سالِ ولادت رجب ۸۷۷ھ اور سالِ جلوس ۹۴۷ھ ہے۔ مقام جلوس آگرہ اور دار الخلافہ دہلی تھا۔ مدتِ بادشاہت چار سال چار ماہ پندرہ یوم بنتی ہے۔ تاریخ وفات ۱۲ ربیع الاول ۹۵۲ھ ہے۔

سلیم شاہ سوری

سلطان شیر شاہ سوری کے بعد ۱۵ ربیع الاول ۹۵۲ھ کو اس کا بیٹا سلیم شاہ سوری

سر پر آرائے تختِ ہند ہوا۔ یہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا مگر باپ کی طرح بڑا عادل اور منصف مزاج تھا۔ اس نے بھی ملکی اصلاحات اور حکومت کے نظم و نسق کو مستحکم کرنے کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی۔ شہر تعمیر کیے، زراعت کو ترقی دی، رعایا کے مفاد کو ملحوظِ خاطر رکھا اور اس سے عدل و احسان کا برتاؤ کیا۔ یہ عبادت گزار اور نیک نفس بادشاہ تھا۔ مسجد میں لوگوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرتا، علما سے عزت و تکریم سے پیش آتا اور علمی مسائل میں ان سے مذاکرہ کرتا۔ مسکرات سے اس کو شدید نفرت تھی اور غیر شرعی امور کے ارتکاب سے دامن کشاں رہتا تھا۔ فوج کے لیے اس کے والد شیر شاہ نے بھی اصلاحات نافذ کیں لیکن اس نے ان اصلاحات میں مزید اضافہ کیا۔

سلیم شاہ نے عسکری نظام کو جدید قالب میں ڈھالا اور اس کو دو حصوں میں مرتب کیا۔ ایک چھوٹا حصہ اور ایک بڑا حصہ۔ چھوٹا حصہ کم نفری پر مشتمل تھا اور بڑا حصہ زیادہ نفری پر۔ چھوٹے حصے میں چار درجے رکھے۔ ایک درجہ پچاس افراد کی نفری پر، دوسرا دو سو کی، تیسرا اڑھائی سو کی، اور چوتھا پانچ سو کی نفری پر مشتمل تھا۔ بڑا حصہ پانچ ہزار، دس ہزار اور بیس ہزار کی نفری کو محتوی تھا۔ اسی ترتیب سے ان پر امرا کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ فوج میں فارسی اور ہندی زبانوں پر عبور رکھنے والے محرر مقرر کیے۔

محکمہ قضا میں پٹھان اور ہندی قاضی متعین کیے۔ سنار گاؤں سے لے کر کابل کی سرحدوں تک اس نے فوجی چھاؤنیاں تعمیر کیں۔ گزرگاہوں اور راستوں میں شیر شاہ نے مسافروں کے آرام کے لیے جو سرائیں تعمیر کی تھیں، سلیم شاہ نے ان میں اور اضافہ کیا، اور بہت سی نئی سرائیں بنوائیں، راستوں میں پانی کا انتظام کیا، اس نے لنگر خانے بھی جاری کیے، جن میں مسلمانوں کو پکا ہوا کھانا اور ہندوؤں کو اناج دیا جاتا تھا۔

اس کی زندگی کے شب و روز کا بیشتر حصہ اگرچہ حرب و ضرب میں گزرا، مگر اس نے کبھی رعایا کی خبر گیری اور اصلاحی امور سے صرفِ نظر نہیں کیا اور اس کی گوناگوں مصروفیات اصلاحِ احوال اور علمائے دین سے تعلقات کی راہ میں حائل نہیں ہو سکیں۔

سلیم شاہ میں ایک خوبی یہ تھی کہ یہ بلند کردار اور بلند حوصلہ بادشاہ تھا۔ اس ضمن

میں یہ واقعہ لائقِ تذکرہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک قصبے میں قیام پذیر ہوا، جس کا نام ''بن'' تھا، حسبِ معمول عصر اور مغرب کی نماز کے درمیان تنہا قلعہ مان گڑھ کی سیر کے لیے جا رہا تھا، جو قصبہ بن سے پانچ چھ کوس کے فاصلے پر واقع تھا۔ راستے میں ایک شخص فریاد کرتا ہوا سامنے آیا اور بادشاہ کا راستہ روک کر بغل سے تلوار نکالی اور حملہ کر دیا۔ سلیم شاہ نے تیزی سے اس کے وار کو روکا۔ جان سے تو بچ گیا مگر معمولی زخم آئے۔ وہ شخص دوسرا وار کرنا چاہتا تھا کہ سلیم شاہ پہلو بچا کر اس سے لپٹ گیا اور تلوار چھین لی۔ اتنے میں کچھ اور لوگ بھی وہاں آگئے اور حملہ آور کو پکڑ لیا گیا۔ لوگوں نے حملہ آور سے پوچھنا شروع کیا کہ تم نے یہ حرکت کس کے اشارے سے کی ہے۔ بادشاہ نے یہ کہہ کر لوگوں کو تفتیش و تحقیق سے روک دیا کہ معلوم نہیں یہ شخص غلط بیانی کر کے کتنے گھروں کو برباد کر دے۔ اس کے بعد بادشاہ کے حکم سے اسے فوری طور پر قتل کر دیا گیا۔ اس کی تلوار دیکھی تو پتا چلا کہ یہ وہی تلوار ہے جو سلیم شاہ نے اقبال خاں کو دی تھی۔ اقبال خاں عرصہ تک شیر شاہ کی خدمت میں رہا تھا مگر چھوٹا پن اس کی فطرت میں داخل تھا۔ لوگوں نے سلیم شاہ کو اسے قتل کرنے کو کہا لیکن اس نے جواب دیا، اپنے پروردہ کو قتل کرنے سے مجھے شرم آتی ہے۔

سلیم شاہ عبادت گزار، طباع و ذہین اور علما و صلحا کا عقیدت مند تھا، مگر ساتھ ہی لطیفہ گو بھی تھا اور لطیفہ سن کر خوش ہوتا تھا۔ کہتے ہیں پنجاب جاتے ہوئے جب وہ الور ٹھہرا تو ایک دن دور سے مخدوم الملک مُلا عبداللہ سلطان پوری کو آتے ہوئے دیکھا۔ مصاحبوں سے کہا ''تمھیں معلوم ہے یہ کون آرہا ہے''؟ بولے ''حضور ہی فرمائیں''۔ سلیم شاہ نے کہا ''بابر بادشاہ کے پانچ بیٹے تھے، جن میں چار تو ہندوستان سے نکل گئے، مگر یہ پانچواں یہاں رہ گیا''۔ ایک مصاحب سرمست خاں نے کہا ''یہ فتنے کی جڑ آپ نے کیوں رہنے دی''؟ سلیم شاہ نے جواب دیا ''کیا کروں، اس سے بہتر آدمی مجھے نظر نہیں آتا''۔ جب مخدوم الملک مجلس میں آئے تو بادشاہ نے نہایت اعزاز کے ساتھ انھیں اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا اور مروارید کی تسبیح عنایت کی جو تیس ہزار

روپے کی تھی اور اسی وقت کسی نے پیش کی تھی۔

سلیم شاہ کا زمانہ علم و علما کے اعتبار سے بڑا زرخیز تھا اور یہ بادشاہ اہلِ علم کا بہت قدردان تھا۔ اس کے دربار میں شعر و شاعری اور مختلف مسائل پہ علما کے درمیان مذاکروں اور مباحثوں کا ہنگامہ بپا رہتا۔

سلیم شاہ نے نو سال بادشاہت کی، ۹۶۱ھ کو وفات پائی۔ اس کی میت کو سہسرام لے جا کر شیر شاہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اسی سال گجرات کے خدا ترس اور عادل بادشاہ سلطان محمود کو برہان نامی ایک خادم نے شہید کر دیا۔ دکن کے بادشاہ نظام الملک نے بھی اسی سال انتقال کیا۔ یہ سال گویا بادشاہوں کی موت کا سال تھا۔

سلیم شاہ کے بعد

سلطان سلیم شاہ سوری کے بعد اس کا بیٹا فیروز شاہ تخت نشین ہوا، جو دس سال کا کم سن بچہ تھا۔ لیکن تخت نشینی کے تیسرے ہی دن سلیم شاہ کے سالے مبارز خاں نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مبارز خاں کی بہن بھائی کے قدموں میں گر پڑی اور منت و لجاجت سے عرض گزار ہوئی کہ اس بچے کو قتل نہ کرو، بادشاہی تم لے لو، میں اس کو کسی نامعلوم مقام میں لے کر چلی جاؤں گی۔ لیکن ظالم بھائی پہ بہن کی لجاجت کا کوئی اثر نہ ہوا اور محل سرا میں گھس کر ماں کے سامنے اس کم سن بچے کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس بچے کے قتل سے سلیم شاہ سوری کی نسل ختم ہو گئی۔

فیروز شاہ کے بعد اس کا قاتل ماموں مبارز خاں سلطان محمد عادل کا لقب اختیار کر کے تختِ ہند پہ متمکن ہوا۔ یہ شخص عدلی کے عرف سے معروف تھا۔ اس کا دور ہنگاموں اور بغاوتوں کا دور تھا۔ ادھر مغل حکمران ہمایوں کی فوج بھی دوبارہ تختِ ہند پر قبضہ کرنے کے لیے ملک میں داخل ہو گئی تھی اور آگرہ اور اٹاوہ تک پیش قدمی کر چکی تھی۔ عدلی نے اس کے مقابلے کے لیے بہت سی فوج، ہاتھی اور خزانہ دے کر ہیموں بقال کو بھیجا، جس کو ہیموں بنیا بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شخص شیر شاہ کے زمانے

6/31

میں معمولی حیثیت کا مالک تھا اور ترقی کرتے کرتے اونچے منصب پر فائز ہو گیا تھا۔ اسی اثنا میں ایک لڑائی میں ایک شخص سلطان محمد بہادر نے جو عدلی سے بغاوت کر کے ایک علاقے کا حاکم بن بیٹھا تھا، ۹۶۲ھ میں عدلی کو قتل کر دیا۔ سور خاندان نے اس ملک پر صرف پندرہ سال حکومت کی۔

ہمایوں کی ہندوستان میں واپسی

ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھانے اور اس ملک سے بھاگ جانے کے بعد خاموش نہیں بیٹھا۔ اس نے شاہ طہماسپ صفوی کی مدد سے پہلے کابل و قندھار کو فتح کیا، اور پھر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس نے بے وفا بھائیوں اور حریفوں کا زور ختم کر کے اس ملک پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ تاریخِ ہند کا نیا باب اس کے سامنے کھل گیا اور وہ آگے بڑھا تو تاجِ شاہی اس کے سر کی زینت بننے کے لیے بے تاب تھا۔

علما کا احترام

ہمایوں بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ علما کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اس ضمن کا یہ واقعہ قابلِ بیان ہے کہ ہمایوں نے ہندوستان پر حملہ کرنے سے پہلے بیرم خاں کی معرفت مولانا زین الدین محمود سے ملاقات کی۔ مولانا ممدوح خراسان کے موضع بہدا کے رہنے والے تھے۔ کئی بزرگوں اور عالموں کے صحبت یافتہ تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی اور مولانا عبدالغفور سے بھی ملاقات کر چکے تھے۔ بیرم خاں ان کا شاگرد تھا اور ان کے درس میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ ہمایوں نے کچھ لوگوں کو کھانے پر بلایا، مولانا زین الدین محمود کو بھی دعوت دی۔ مہمانوں کے ہاتھ دھلانے کا وقت آیا تو ہمایوں نے خود اپنے ہاتھ میں آفتابہ اٹھایا اور طشت بیرم خاں نے پکڑا۔ اس دعوت میں مولانا سید جمال الدین محدث کے پوتے میر حبیب اللہ بھی موجود تھے۔ مولانا نے میر حبیب اللہ کی طرف اشارہ کر کے ہمایوں سے کہا: "ان کو جانتے ہو یہ کون ہیں؟" ہمایوں ان کے سامنے

بھی آفتابہ لے گیا۔ میر صاحب گھبرا گئے، تھوڑا سا پانی لیا اور جلد جلد ہاتھوں پر ڈالا۔ لیکن مولانا نے نہایت اطمینان کے ساتھ اچھی طرح ہاتھ دھوئے۔ اس موقع پر ہمایوں کی رگِ ظرافت پھڑکی تو مولانا سے پوچھا۔ "کتنے پانی سے ہاتھ دھونا مسنون ہے؟" فرمایا۔ "جتنے پانی سے ہاتھ اچھی طرح دُھل جائیں۔" مولانا زین الدین کی مخلصانہ محبت اور شفقت سے ہمایوں بہت خوش ہوا اور ان سے باقاعدہ استفادہ کرتا رہا۔ بعد کو اس نے بیرم خاں کے ذریعے کچھ رقم بھی ان کی خدمت میں پیش کی۔ لیکن وہ تحفہ لینے کے عادی نہ تھے، لہٰذا انکار کر دیا۔ بیرم خاں کا اصرار زیادہ بڑھا تو وہ رقم بادلِ نخواستہ قبول کر لی اور اس کے بدلے میں اپنے ہاتھ سے بنی ہوئی بہت سی کمانیں جو اس رقم سے زیادہ قیمت کی تھیں اور اس وقت ضروری تھیں، بادشاہ کے پاس بھجوادیں کہ اصولاً و شرعاً ہدیہ یک طرفہ نہیں، دونوں طرف سے ہوتا ہے۔

اسی طرح علما کی عزت و تعظیم کے بارے میں ہمایوں سے متعلق یہ واقعہ بھی مشہور ہے اور تاریخ کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ جب تسخیرِ ہند کے لیے اس نے دوسری مرتبہ چڑھائی کی تو مفسرِ قرآن شیخ حمید سنبھلی اس کے استقبال کے لیے گئے۔ ہمایوں ان کا بڑا معتقد تھا۔ ایک دن شیخ نے ہمایوں سے کہا۔ "تمھارا پورا لشکر رافضی معلوم ہوتا ہے۔" ہمایوں نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟" فرمایا۔ "اب کی بار تمھارے سپاہیوں کے نام یار علی، کفش علی اور حیدر علی وغیرہ ہیں۔ دوسرے کسی خلیفہ کے نام پر کسی فوجی کا نام نہیں۔" شیخ کی بات سن کر ہمایوں کو طیش آ گیا، اس وقت ہاتھ میں قلم پکڑا ہوا تھا، اس کو غصے سے فرش پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "نام پدرِ من کبیر عمر شیخ بود۔" (میرے دادا کا نام عمر شیخ تھا) یہ کہہ کر ہمایوں تیزی سے محل سرا میں چلا گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد باہر آ گیا اور نرمی اور تحمل سے شیخ کو اپنے صحیح عقائد سے آگاہ کیا۔

شیخ حمید سنبھلی کی اس بات کا دراصل پس منظر یہ تھا کہ ہمایوں نے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے شاہ طہماسپ صفوی سے مدد لیتے وقت شیعہ عقائد قبول کرنے سے

صاف لفظوں میں انکار نہیں کیا تھا اور صفویوں کا لشکر لے کر ہی بدخشاں پر چڑھائی کی تھی، اس سے شیخ کو یہ شبہ پیدا ہوا کہ شاید اس نے شیعیت قبول کر لی ہے۔ ہمایوں نے اپنے دادا عمر شیخ کے نام کا حوالہ دے کر اس سے اپنی برائت ظاہر کی۔

عہدِ ہمایوں کے علمائے کرام اور فقہائے عظام کے واقعات و حالات اس کتاب میں متعدد مقامات پہ مذکور ہیں۔

ہمایوں کے اوصاف

ہمایوں بہت سی خوبیوں کا مالک اور متعدد اوصاف کا حامل تھا۔ امورِ سلطنت پہ گہری نظر رکھتا تھا، مروجہ علوم میں ماہر تھا، علاوہ ازیں علومِ نجوم و ہیئت پر بھی اسے کمال حاصل تھا، علما و فضلا کی دل سے قدر کرتا تھا۔ بزرگانِ دین اور شعرا سے اسے محبت تھی اور خود بھی اچھا شاعر تھا۔ اس میں یہ خوبی تھی کہ ہمیشہ باوضو رہتا اور اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام کبھی بے وضو زبان پہ نہ لاتا۔ اگر کوئی ایسا نام لینے کی ضرورت پڑتی تو جو "عبد" اور لفظ "اللہ" سے مرکب ہو، مثلاً عبداللہ، عبدالرحمن عبدالحی وغیرہ تو فقط "عبدل" کہہ کر پکارتا کہ مبادا بے وضو نامِ اللہ زبان پہ آجائے۔

اس کی زبان پہ کبھی گالی نہ آتی، جب بہت غصے میں آجاتا تو منہ سے "بے نادان" کے سوا کوئی کلمہ نہ نکلتا۔ مجلس میں آتا تو کبھی بایاں پیر پہلے نہ رکھتا۔ کسی اور شخص کی بھی مجال نہ تھی کہ مجلس میں آتے وقت بایاں پاؤں پہلے رکھے۔ اگر کسی سے کبھی چوک ہو بھی جاتی تو اسے پیچھے لوٹا دیتا اور کہتا، دوبارہ مجلس میں آئے۔ اس کی حیا اور متانت کا یہ عالم تھا کہ کبھی قہقہہ مار کر نہیں ہنسا اور کسی کی طرف گھور کر نہیں دیکھا۔

ہمایوں کی علمی و شعری اور ملکی معاملات پہ غور و خوض کی محفلیں رات بھر جمی رہتیں کبھی اس کی طرف سے تکان یا تکاسل کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ بے حد سخی اور فیاض تھا۔ کہتے ہیں اس کی فیاضی کے مقابلے میں تمام ہندوستان کا خراج بھی کافی نہ تھا اسی لیے محکمہ مالیات کے عمال اس کے سامنے نقد روپیہ نہیں لاتے تھے۔

کتب خانہ ہمایوں صاحبِ علم حکمران تھا اور اس کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔

اس کا کتب خانہ بڑا وسیع اور مختلف عنوانات کی کتابوں پر مشتمل تھا۔ اس کے وقت کا ایک حصہ مطالعہ کتب کے لیے مخصوص تھا۔ دہلی کے شیر شاہی قلعہ کی سہ منزلہ عمارت کی آخری منزل میں اس نے اپنا کتب خانہ قائم کر رکھا تھا۔ وہ چوں کہ علم نجوم اور کواکب کا بھی ماہر تھا، اس لیے اس منزل میں اس کی رصد گاہ بھی تھی۔ ہمایوں کے اس شاہی کتب خانہ کے مہتمم کا نام نظام تھا جو باز بہادر کے عرف سے معروف تھا۔ ہمایوں کے ذوقِ مطالعہ اور شوقِ کتب بینی کا یہ عالم تھا کہ میدان جنگ میں بھی ایک چھوٹا سا سفری کتب خانہ اس کے ساتھ رہتا۔ چنانچہ اس نے جب کھمبایت کا محاصرہ کیا تو دیگر کتابوں کے ساتھ تاریخِ تیمور کا وہ نسخہ بھی موجود تھا، جو بہزاد نے مصوّر کیا تھا۔ ایک جنگلی قبیلے نے ہمایوں کے فوجی کیمپ پر چھاپہ مارا تو یہ نسخہ گم ہو گیا تھا لیکن جلد ہی مل گیا تھا۔

دو شاعروں کا دلچسپ واقعہ

عہدِ ہمایوں میں علمائے دین کے علاوہ متعدد شعرائے کرام بھی تھے جو اونچے درجے کے شاعر ہونے کے ساتھ مروّجہ علوم میں بھی ماہر کامل تھے۔ ان میں سے دو شاعروں کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ یہ شاعر تھے، شیخ زین الدین خاں وفائی اور شیخ ابوالواحد فارغی۔ دونوں بابر کے زمانے میں واردِ ہند ہوئے تھے اور علم و فضل کی مختلف اصناف پر گہری نظر رکھتے تھے۔ زین الدین وفائی کے بارے میں مُلا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ بابر نے ان کو پورے ہندوستان کا صدر الصدور بنا دیا تھا۔ تمام اصنافِ نظم و نثر میں انھیں مہارت حاصل تھی، خاص طور سے فنِ معمّا گوئی، تاریخ اور بدیہہ گوئی میں عدیم المثال تھے۔ آگرہ میں جمنا کے کنارے ایک مسجد اور مدرسہ ان کی یادگار تھا۔ جب یہ پہلی مرتبہ بابر کے پاس آئے تو بادشاہ نے پوچھا، "تمھاری عمر کیا ہے؟" فی البدیہہ جواب دیا۔ "بس پانچ برس پہلے چہل سالہ" تھا اور اب "چہل سالہ" ہوں اور دو برس بعد "چہل سالہ" پورے ہوں گے۔

اسی زمانے کے دوسرے شاعر ابوالواحد فارغی تھے۔ یہ درویش مزاج اور شیریں کلام

شاعر تھے ۔ دونوں میں گہری دوستی تھی، دونوں اکٹھے ہندوستان آئے اور بابر سے وابستہ ہوئے ۔ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں نے ایک ہی سال ۔ ۹۴۰ھ میں ۔ یکے بعد دیگرے وفات پائی اور ایک ہی جگہ مقبرہ شیخ زین الدین وفائی میں ان کی تدفین ہوئی ۔ بدایونی نے لکھا ہے جب یہ دونوں ہندوستان آنے کے ارادے سے سفر کر رہے تھے تو اتنے قلاش تھے کہ ان کے پاس سوائے ایک پرانی پوستین کے کچھ بھی نہ تھا ۔ ہرات سے کابل پہنچے تو وفائی نے فارغی سے کہا، میں پوستین فروخت کرنے بازار جاتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم وہاں آ کر مسخرہ پن نہ کرنا ۔ انھوں نے یہ شرط قبول تو کر لی مگر اس پر عمل نہ کر سکے ۔ وہ بازار میں وفائی کے پیچھے پیچھے چلنے لگے ۔ ایک شخص سے پوستین کا سودا ہونے لگا تو خریدار اتنی قیمت دینے پر آمادہ نہ ہوا جتنی وہ مانگتے تھے ۔ وہ صرف پانچ اشرفیاں دیتا تھا ۔ وفائی زیادہ مانگتے تھے ۔ مالک اور خریدار کے درمیان جھگڑا دیکھ کر فارغی سے نہ رہا گیا ۔ وہ اجنبی کی طرح وہاں پہنچے اور دونوں کے درمیان دلالی کے فرائض انجام دینے لگے ۔ گاہک زیادہ قیمت لگانے پر آمادہ نہ ہوا اور بات لمبی ہو گئی، تو فارغی پوستین ہاتھ میں پکڑ کر گاہک سے مخاطب ہوتے۔ "اے بے انصاف، پوستین کے اس ایک ایک ٹکڑے میں پانچ پانچ اشرفی کے تو فقط پسو اور جوئیں ہیں" یہ سن کر گاہک چلتا بنا اور پوستین وفائی کے ہاتھ میں پکڑی رہ گئی ۔ وفائی کو سخت غصہ آیا اور بگڑ کر فارغی سے کہا ۔ ہم تو ایک ایک روٹی تک کے محتاج ہیں اور تم اس حالت میں بھی مسخرہ پن سے باز نہیں آتے ۔

اس طرح کے اور بھی کئی دلچسپ واقعات تاریخ کی کتابوں میں منقول ہیں ۔

وفات

۷ ربیع الاول ۹۶۳ ہجری کو ہمایوں اس کتب خانہ کی چھت پر گیا، جو دہلی کے قلعہ دین پناہ میں قائم کیا گیا تھا ۔ مطالعہ سے فارغ ہونے کے بعد چھت سے نیچے اتر رہا تھا کہ کان میں اذان کی آواز پڑی ۔ اذان کے احترام میں وہیں سیڑھیوں میں بیٹھ گیا ۔ اٹھنے لگا تو عصا اچٹ گیا ۔ اچانک بادشاہ کا پاؤں پھسلا اور وہ سیڑھیوں پر سے

پھسلتا ہوا زمین پر آگیا۔ اس ضرب سے خاصی چوٹیں آئیں، کچھ افاقہ ہوا تو شیخ جولی کو پنجاب میں شہزادہ اکبر کے پاس روانہ کیا اور اس کو اپنی حالت کی اطلاع پہنچائی۔ چوٹیں شدید تھیں، بادشاہ ان سے جاں بر نہ ہو سکا اور حادثہ سے سات روز بعد، ۱۵ ربیع الاول ۹۶۳ھ کو اس دنیائے فانی سے آنکھیں پھیر لیں اور عالم جاودانی کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ ہمایوں نے اکیاون[۵۱] برس عمر پائی اور پچیس[۲۵] سال سے زائد عرصہ فرائضِ حکمرانی انجام دیے۔[۳۵]

ہمایوں کی وفات کے بعد جلال الدین اکبر نے باپ کی جگہ سنبھالی۔ اگر اللہ کو منظور ہوا اور حالات نے موافقت کی تو اکبر کے حالات اس کتاب کی چوتھی جلد کے مقدمہ میں تحریر کیے جائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ کیوں کہ اکبر کا عہدِ اقتدار گیارھویں صدی ہجری ہے۔

سلاطینِ گجرات

اس وقت ہم اس عہد کے ہندوستان کے حالات پڑھ رہے ہیں، جبکہ وہ حکمرانی کے اعتبار سے کئی حصوں میں بٹا ہوا ہے اور اس میں متعدد مضبوط علاقائی حکومتیں قائم ہیں۔ ان میں ایک حکومت علاقہ گجرات کی ہے۔ اس کا پایہ تخت احمد آباد تھا۔ دسویں صدی ہجری میں جن سلاطین نے ان میں دادِ حکمرانی دی، ان میں سلطان محمود بیگڑہ کا نام خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہے۔

سلطان محمود بیگڑہ

سلطان محمود بیگڑہ ماہ شعبان ۸۶۳ھ میں تختِ گجرات پر متمکن ہوا۔ اس وقت

---

۳۵ بابر، شیر شاہ سوری، سلیم شاہ اور ہمایوں سے متعلق تفصیلی واقعات کے لیے دیکھیے تزک بابری، ہمایوں نامہ، منتخب التواریخ، طبقاتِ اکبری، تاریخ فرشتہ، مآثرِ رحیمی اور زبدۃ التواریخ وغیرہ کے متعلقہ ابواب۔

اس کی عمر صرف تیرہ سال دو ماہ تین روز تھی۔ اس کو "بیگرہ" کے تسمیہ سے موسوم کرنے کی دو وجہیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہندی زبان میں بیگرہ اس بیل کو کہتے ہیں، جس کے سر پہ بائیں اور دائیں جانب دو بڑے بڑے سینگ ہوں۔ چوں کہ بیل کے سینگوں کی طرح اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں، اس لیے وہ بیگرہ مشہور ہو گیا۔ دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہندی میں "بے" کے معنی "دو" اور "گرہ" کے معنی "قلعہ" کے ہیں۔ اس نے جوناگڑھ اور چانپانیر کے دو قلعے فتح کیے تھے جو استحکام و مضبوطی کے لحاظ سے اس دور کے ہندوستان کے مشہور قلعے تھے۔ لہٰذا اسے "بیگرہ" کے نام سے موسوم کیا گیا۔

اپنے اوصاف و اطوار کی وجہ سے سلطان محمود بیگرہ سرزمین گجرات کا ایک عالی مرتبت حکمران تھا۔ ارضِ گجرات متعدد سلاطین کا پایہ تخت رہی مگر اس سے قبل یا بعد اس قسم کا کوئی حکمران اس کو دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ داد و عدل، نیکی و دین داری، رعایا پروری و غریب نوازی، شان و شکوہ، فتح و کامرانی اور شجاعت و بسالت میں گجرات کا کوئی سلطان اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتا۔ حُسنِ اتفاق ملاحظہ ہو کہ اس عہد میں ہندوستان کے دیگر علاقوں اور خراسان میں بھی جو سلاطین دادِ حکمرانی دیتے تھے، وہ ان ہی اوصاف و کمالات سے متصف تھے، جن سے محمود بیگرہ متصف تھا۔ تختِ خراسان پر حسین مرزا متمکن تھا اور اس کی مسندِ وزارت پر میر علی شیر فائز تھا اور مسندِ ملائی و شاعری مولانا جامی کے قبضے میں تھی۔ حکومتِ دہلی کی زمامِ اقتدار سلطان سکندر لودھی کے ہاتھ میں تھی اور کاروبارِ وزارت روشن فکر عالمِ دین میاں بھوہ انجام دیتے تھے۔ اورنگِ مانڈو پر سلطان غیاث الدین بن محمود خلجی سرفراز تھا۔ دکن کی بساطِ سلطنت سلطان محمود بہمنی کے دستِ بلند ہمت میں تھی۔

سلطان بیگرہ کے بارے میں مرآتِ سکندری کا مصنف رقم طراز ہے:

می تواں گفت کہ روحِ سلطان محمود غازی بعد از چندیں بعالم بر روح سلطان

محمود بیگرہ تجلّی کردہ بود کہ ہمہ افعال و اعمالِ سلطنت مشابہت و مضارعت باآں شہریار غزوت آثار داشت[۳۶]

کہا جا سکتا ہے کہ کچھ مدت بعد غازی سلطان محمود غزنوی کی روح سلطان محمود بیگرہ کی روح میں منتقل ہوگئی تھی، کیوں کہ اس کی سلطنت کے افعال و اطوار اسی جنگ جو اور بہادر سلطان کے مشابہ تھے۔

یہ محمود غزنوی کی طرح بت شکن اور شرک دشمن بادشاہ تھا۔ شرک کی حمایت اور اسلام کی مخالفت ہرگز برداشت نہ کرتا تھا۔

سلطان محمود بیگرہ نے اپنی سلطنت میں بہترین اصلاحات نافذ کیں اور ہر موقع پر رعایا کے مفاد کو پیش نظر رکھا۔ اس کا حکم تھا کہ امرائے حکومت اور سپاہ میں سے جو شخص درجۂ شہادت سے بہرہ ور ہو جائے یا طبعی موت مر جائے اس کی جاگیر اس کے بیٹے کے حوالے کر دی جائے۔ اگر بیٹا نہ ہو تو آدھی جاگیر بیٹی کو دی جائے۔ اگر بیٹی نہ ہو تو اس کے دیگر متعلقین کے سپرد کر دی جائے تاکہ ان کے لیے وجہِ کفاف اور ذریعہ معاش ثابت ہو، اور ان لوگوں کو روزگار کی کوئی شکایت باقی نہ رہے۔

رعایا میں مال و دولت کی تقسیم میں محمود بیگرہ بڑا وسیع القلب تھا۔ کسی شخص نے ایک امیر کے بیٹے کے متعلق کہا کہ وہ اپنی عادات کے لحاظ سے اس قابل نہیں کہ اسے مال و دولت سے نوازا جائے۔ سلطان نے فوراً جواب دیا۔ دولت اس میں خود یہ عادت پیدا کر دے گی کہ وہ اس کے قابل ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دورِ حکومت میں کوئی شخص غربت یا ناداری کا شکار نہ تھا۔ ہر امیر کئی کئی پرگنوں کا مالک تھا، عام لوگ بھی آسائش و راحت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ رعیت میں دولت و ثروت کو عام کرنے کی اس نے جو پالیسی اختیار کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرزمین گجرات امن و امان کا گہوارہ بن گئی۔ چوروں اور ڈاکوؤں کا وجود ختم ہو گیا اور جرائم پیشہ لوگ ارتکابِ جرائم

حواشی

[۳۶] مرآت سکندری ص ۱۰۲

سے توبہ کر کے سلطان کے مطیع و فرماں بردار ہو گئے۔ معذوروں اور اپاہجوں کی گزر اوقات کے لیے وظائف مقرر تھے۔ لوگوں کی سکونت کے لیے سرکاری خرچ سے مکان اور رباط تعمیر کیے گئے، مسافروں کے لیے سرائیں بنائی گئیں، تعلیم کے لیے ہر ہر گاؤں میں مدارس قائم کیے گئے، اور عبادت و نماز کے لیے عالی شان مسجدیں معرضِ تعمیر میں لائی گئیں۔ بے روزگاروں اور بے کاروں کو ان کی قابلیت کے مطابق کام پر متعین کیا جاتا تھا۔ ظلم و تعدی کا نام و نشان باقی نہ رہا تھا اور پورے ملک میں عدل و انصاف کا بول بالا تھا، غلّہ عام ملتا تھا اور ہر چیز ارزاں نرخ پر مہیا ہوتی تھی۔ بعض چیزیں مفت تقسیم کی جاتی تھیں۔

محمود بیگرہ کی فوجی طاقت بے حد مضبوط تھی اور ہر معرکے میں فتح یاب ہوتی تھی سپاہیوں کو زیادہ سے زیادہ رعایت دی جاتی تھی۔ اس نے اپنے عمال کے نام فرمان جاری کر رکھا تھا کہ کسی سپاہی کو پریشان نہ کیا جائے اور ان کی ضروریات کے حصول میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ فوجیوں کو حکم تھا کہ ان کو قرض کی ضرورت ہو تو سُود پر قرض نہ لیں۔

حکم کردہ بود کہ ہیچ کس از لشکریانِ من قرض بربا نگیرد، خزانچی علاحدہ مقرر کردہ بود کہ از سپاہی ہر کس کہ بقرض حاجت داشتہ باشد باو بدہد و بوعدہ بگیرد از اں جہت ربا خوراں حال سگ داشتند بلکہ ایشاں را از سگ کمتر می انگاشتند، می فرمود، اگر مسلمانان قرض بربا خورند از دستِ ایشاں غزا چگونہ آید۔ از برکتِ حسنِ نیت و خلوصِ عملِ او حق تعالیٰ ہمیشہ ظفر در رکاب و نصرت ہم عنان می داشت[۳۷]

اس نے حکم جاری کر دیا تھا کہ میرے فوجیوں میں سے کوئی شخص سُود پر قرض نہ لے۔ اس کے لیے علیحدہ خزانچی مقرر تھا کہ فوج میں سے جس شخص کو بھی قرض کی ضرورت ہو، اسے دے دیا جائے۔ اور وعدہ لینا تھا کہ اس طرح کے سُود خواروں کو وہ کتّے کی حیثیت

۳۷؎ مرآتِ سکندری ص ۱۰۴

دیں گے، بلکہ کُتّے سے بھی ذلیل گردانیں گے۔ کہا کرتا تھا اگر سُود پر قرض لے کر کھائیں گے تو جہاد کے فرائض کس طرح انجام دیں گے۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے حسنِ نیت کی برکت اور خلوصِ عمل سے اللہ نے اسے ہمیشہ فتح وظفر سے نوازا اور نصرتِ الٰہی ہر موقع پر اس کے ہم عنان رہی۔

محمود بیگرہ رعیّت کا اس درجہ خیر خواہ تھا کہ اس نے گجرات کے شہروں میں لوگوں کے لیے راستوں میں سایہ دار اور پھل دار درخت لگاتے۔ بکثرت کنوئیں کھدوا کر پانی کا وافر انتظام کیا، قصبات و دیہات میں تعمیرِ مکانات کے لیے لوگوں میں سرکاری زمین تقسیم کی اور زراعت کے لیے بھی حسبِ ضرورت اراضی عطا کی۔ شاہ راہیں اس قدر کشادہ اور صاف ستھری تھیں کہ گرد و غبار کا نشان تک نہ تھا اور مسافروں پر کسی قسم کے آثارِ سفر ظاہر نہ ہوتے تھے۔

یوں تو سرزمین گجرات کا یہ فرماں رواحیاتِ مستعار کے ہر دور میں یادِ الٰہی میں مصروف رہا اور اس کی زندگی کے اکثر لمحات ذکرِ خداوندی میں بسر ہوئے، مگر آخری دنوں میں تو اس نے اللہ کی طاعت و عبادت کے لیے اپنے آپ کو بالکل وقف کر دیا تھا اور اس درجہ رقیق القلب ہو گیا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر اللہ کے ڈر سے آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ سلطان کی اس کیفیت کو دیکھ کر ملک سارنگ عرف قوام الملک نے عرض کیا "مرتبۂ بادشاہت پر فائز ہونے کے باوجود اور درجہ شہنشاہیت پر سرفراز ہونے کے باوصف، یہ گریہ کیوں ہے اور یہ خوف وزاری کس وجہ سے آپ پر طاری ہے"؟ فرمایا "اے بے عقل! میں تجھے اس کا کیا جواب دوں۔ میری تمنا ہے کہ کہیں کانوں میں یہ آواز پڑ جائے کہ "عاقبتِ محمود، محمود خواہد بود"۔ سفرِ عمر جاری ہے اور گزرا ہوا وقت واپس نہیں آتا ہے۔ اسی لیے آنکھوں سے آنسو بہاتا اور دلِ پُر حسرت رکھتا ہوں۔ افسوس ہے، مَیں نے اللہ کی قدر اس طرح نہیں جانی جس طرح جاننا چاہیے اور جس طرح جانی اس پر عمل نہیں کیا"۔ [۳۸]

---

[۳۸] مرآتِ سکندری ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

سلطان، علمائے دین اور فقہائے کرام سے بہت تعلق و مودّت رکھتا تھا، وہ اگرچہ علومِ مروّجہ کا زیادہ عالم نہ تھا مگر علما کی صحبت اور فضلا کی مصاحبت سے بے شمار مسائل دینی، اشعار، تاریخی واقعات اسے حفظ ہو گئے تھے اور جب وہ مجلس میں دینی مسائل پر بات کرتا تو اس پر عالم و فقیہ کا گمان ہوتا تھا۔ می دانستند کہ سلطان عالم و فقیہ است۔ اس لیے کہ وہ اپنی قوتِ طبع اور ذکاوتِ فہم کی بنا پر دقیق اور گہرے علمی نکات بیان کرتا تھا۔[۵۳۹]

بہرحال سلطان محمود بیگڑہ بہت سے اوصاف کا حامل تھا۔ علاقہ گجرات کا یہ نہایت بہادر، فاتح اور مجاہد بادشاہ تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں سلطنتِ گجرات میں وسعت پیدا ہوئی اور اس کی سرحدیں دُور دُور تک پھیل گئی تھیں۔ اس نے ہند کے غیر مسلم حکمرانوں کو کئی بار شکست دی اور ان کے بہت سے علاقوں پر اپنا پرچمِ اقتدار لہرایا لیکن اس موقع پر ہم اس کی زندگی کے اس پہلو کو بیان نہیں کرنا چاہتے۔ اس وقت ہمارا مقصد صرف اس کے دینی و علمی اور اسلامی و اخلاقی گوشوں کی اختصار کے ساتھ نشان دہی کرنا ہے، اور یہ بتانا ہے کہ علمائے دین سے یہ سلطان کس درجہ تودد و محبت رکھتا تھا۔

علمی لحاظ سے اس کا زمانہ بڑا زرخیز تھا اور عرب و عجم کے متعدد چوٹی کے اہلِ علم اور مشہور اصحابِ حدیث گجرات میں آکر سکونت پذیر ہو گئے تھے، جن میں علامہ جلال الدین محمد بن محمد مالکی مصری خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہیں۔ سلطان نے ان کی بڑی تکریم کی اور ان کو اپنی قلمرو میں وصولی جزیہ کے محکمہ پر متعین کیا۔ ان کے علم و فضل کی وجہ سے انھیں ملک المحدثین کے لقب سے سرفراز کیا۔ بلادِ ہند کے یہ پہلے محدث ہیں، جنھیں یہ لقب عطا کیا گیا۔ ان کے علاوہ علامہ مجد الدین محمد بن محمد الایجی اور علامہ ابوالقاسم بن احمد محمد شافعی المعروف بہ ابن فہد بھی دیارِ ہند میں تشریف لائے۔ علامہ ابن فہد فتح الباری کا ایک نسخہ بھی اپنے ساتھ لائے تھے

---

[۵۳۹] مرآت سکندری ص ۱۰۹

جو ان کے والد اور عم محترم کے ہاتھ کا مکتوبہ تھا۔ پھر علامہ ہبۃ اللہ بن عطاء اللہ شیرازی اور علما کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس دور میں قصدِ ہند کیا۔

سلطان محمود بیگرہ کے لیے کئی اہلِ علم نے کتابیں تصنیف کیں۔ مثلاً عبدالکریم بن عطاء اللہ شیرازی نے طبقات محمود شاہی اور شمس الدین محمد شیرازی نے ماثر محمود شاہی لکھی۔ شیخ یوسف بن احمد بن عثمان حسینی نے منظر الانسان کے نام سے تاریخ ابن خلکان کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

اس زمانے میں گجرات کے محکمہ قضا پر قاضی نجم الدین فائز تھے جن کے عدل و انصاف کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی اور جو قضا کے سلسلے میں قطعاً کسی کی رعایت نہ کرتے تھے۔

سلطان بیگرہ کی زندگی کے بہت سے واقعات کتبِ تاریخ میں مرقوم ہیں لیکن تنگ دامانیٔ صفحات ان کے تذکرہ سے مانع ہے۔ گجرات کے اس نامور سلطان نے ۲ رمضان المبارک ۹۱۷ھ کو وفات پائی۔ پچپن برس حکومت کی اور ۶۷ سال کی عمر پاکر فوت ہوا۔

سلطان مظفر حلیم

سلطان مظفر حلیم، سلطان محمود بیگرہ کا بیٹا تھا، ۲۰ شوال ۸۷۵ھ کو پیدا ہوا۔ اس نے سلطنت و حکومت کی گود اور علم و فضل کے ماحول میں تربیت حاصل کی۔ اپنے دور کے مشاہیر اساتذۂ فن سے تعلیم حاصل کی، جن میں علامہ مجدالدین محمد بن محمد الایجی اور مشہور محدث شیخ جمال الدین محمد بن عمر بن مبارک حمیری حضرمی المعروف بہ بحرق کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہیں۔ شیخ بحرق کے سامنے حصولِ علمِ حدیث کے لیے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مظفر حلیم دسویں صدی ہجری کے گجرات کا والیِ تخت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑا محدث و فقیہ، اونچے مرتبے کا عالم اور حافظِ قرآن حکیم تھا۔ علاوہ ازیں نیک، رحم دل اور پیکرِ جود و سخا تھا۔ اپنے والد سلطان محمود بیگرہ کی وفات کے بعد ۳ رمضان ۹۱۷ھ کو تختِ گجرات کا وارث بنا۔ اس نے اکرام

علما، تعظیمِ فقہا، تحفظ حدودِ مملکت، جہاد فی سبیل اللہ، عدل و انصاف اور جود و سخاوت کو اپنے لیے فرض ٹھہرالیا تھا۔ فنونِ حرب، طریقِ جنگ و جہاد اور تیراندازی و شمشیرزنی میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ انتہائی تقویٰ شعار، عزیمت و عفو کا کامل نمونہ، لوگوں سے درگزر کرنے میں بے مثال، خطاکاروں کی خطا معاف کرنے میں فراخ حوصلہ، بلند کردار، سلیم الطبع، عبادت گزار اور بہترین شاہ سوار تھا۔ اس میں ایک خوبی یہ تھی کہ منجھا ہوا خطاط اور خوش خط تھا۔ اقسامِ کتابت میں سے نسخ، ثلث اور رقاع پر عبور رکھتا تھا۔ قرآن مجید اپنے ہاتھ سے لکھ کر مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ بھیجتا تھا۔ قول و فعل میں آثارِ سنت کا متبع اور عاملِ احادیثِ نبویؐ تھا۔ علمائے دین کی بے حد تعظیم کرتا تھا۔ ابتدا میں اسے مشائخ و صوفیا سے حُسنِ ظن نہ تھا لیکن بعد کو طبیعت کا رُخ بدل گیا تھا اور ان کو لائقِ تعظیم گرداننے لگا تھا۔ موت کو یاد کرکے اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

ہمیشہ باوضو رہتا، نماز باجماعت ادا کرتا اور رمضان کے روزے پابندی سے رکھتا تھا، مے نوشی سے سخت نفرت تھی، اسراف و تبذیر اور فضول خرچی سے ہر حال میں دامن بچاتا اور کسی معاملے میں جائز حدود سے قدم آگے نہ بڑھاتا تھا۔ رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا۔ عام طور پر بھیس بدل کر کبھی دن اور کبھی رات کو بازاروں اور گلیوں کے چکر لگاتا تھا۔ تاریخ کے مطالعہ کا شائق تھا اور گزشتہ دور کے ملوک و سلاطین کے کوائف و واقعات دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ مختصر یہ کہ اوصاف گوناگوں کی بنا پر سلطان مظفر حلیم اپنے اسلاف و اقران سے سبقت لے گیا تھا۔

اس کی زندگی کے بہت سے واقعات، تاریخ کی کتابوں میں مرقوم ہیں، جن میں ایک یہ ہے کہ ایک مرتبہ جانپانیر کے قاضی کی عدالت میں گھوڑوں کے ایک تاجر نے بادشاہ کے خلاف یہ استغاثہ دائر کیا کہ بادشاہ نے اس کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا ہے، اس سے گھوڑے خریدے ہیں مگر ان کی قیمت ادا نہیں کی، بذریعہ عدالت بادشاہ سے ان کی قیمت دلائی جائے۔ قاضی نے اپنا فرستادہ بھیج کر

بادشاہ کو عدالت میں طلب کیا۔ وہ ملزم کی حیثیت سے عدالت میں آیا اور آداب بجا لاکر قاضی کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اب مدعی اور مدعا علیہ دونوں قاضی کی عدالت میں کھڑے ہیں۔ قاضی نے مدعا علیہ بادشاہ کو حکم دیا کہ عدالت کے آداب کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے، عدالت میں نہ اسے بیٹھنے کی اجازت ہے اور نہ زیادہ اونچی آواز سے بات کرنے کی۔ قاضی نے مدعی تاجر اور مدعا علیہ بادشاہ کا بیان لیا، تو تاجر کا دعویٰ صحیح ثابت ہوا۔ تاجر نے اسی وقت قاضی کی عدالت میں رقم لینے کا مطالبہ کیا اور قاضی سے عرض کی، جب تک پوری رقم ادا نہیں کردی جاتی بادشاہ کو عدالت سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دی جائے۔ چنانچہ بادشاہ کو مجبوراً اسی وقت رقم تاجر کو ادا کرنا پڑی۔ حساب صاف ہوگیا تو قاضی نے تاجر سے سوال کیا ”رقم پوری مل گئی یا کچھ باقی رہ گئی ہے۔“؟ تاجر نے جواب دیا ”مل گئی ہے“۔ اب قاضی اپنی جگہ سے اٹھا اور بادشاہ کو سلام کیا۔ بادشاہ نے قاضی کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھایا۔ خود دوسری کرسی پر اس کے برابر بیٹھا، صحیح فیصلہ کرنے پر اس کی تعریف کی اور کہا، یہ آپ کے لیے امتحان کا وقت تھا، اگر آپ میرے لحاظ میں آکر مداہنت کرجاتے، تو میں اس منصب سے آپ کو علیحدہ کرکے کسی بہتر شخص کو اس پر متعین کردیتا۔ میری دعا ہے، اللہ آپ کو اس حق گوئی کا بہتر صلہ عطا فرمائے۔ عہدۂ قضا پر آپ ہی جیسے شخص کو متمکن ہونا چاہیے۔ قاضی نے کہا، بادشاہت بھی آپ ہی جیسے اونچے کردار کے آدمی کو زیب دیتی ہے۔

سلطان مظفر حلیم نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں حجاج کے لیے رباط بنایا، اور اس میں مدرسہ قائم کیا جس کے اخراجات وہ خود ادا کرتا تھا۔

سرزمین گجرات کا یہ سلطان عابد و زاہد اور مستجاب الدعوات تھا۔ ایک مرتبہ اس کے عہد۔ ۹۳۱ھ۔ میں گجرات میں شدید قحط پڑا اور لوگ سخت تکلیف میں مبتلا ہوگئے۔ بادشاہ نے صدقہ و خیرات کیا اور لوگوں کو ساتھ لے کر نماز استسقا کے لیے باہر نکلا۔ نہایت عجز و انکساری اور خشوع و خضوع کے ساتھ دعا

کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اس کی دعا کے آخری الفاظ یہ تھے:

اللّٰھم انی عبدک ولا املک لنفسی شیئاً فان تک ذنوبی حسبت القطر عن خلقک فھا ناصیتی بیدک فاغثنا یا ارحم الراحمین۔

اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں، میں اپنے لیے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔ اگر میرے گناہوں کی وجہ سے تو نے بارش کو اپنی مخلوق سے روک لیا ہے، تو میرے یہ پیشانی کے بال تیرے ہاتھ میں ہیں۔ اے ارحم الراحمین! ہم پر بارش برسا۔

یہ الفاظ کہے اور پیشانی زمین پر رکھ دی، سجدہ میں گر پڑا اور بار بار یا ارحم الراحمین کے الفاظ زبان سے ادا کرنے لگا۔ پھر زمین سے سر نہیں اٹھایا، یہاں تک کہ ہوا چلنا شروع ہوئی، آسمان پر بادل نمودار ہوئے اور گرج چمک کے ساتھ مینہ برسنے لگا۔ اب اللہ کے حضور سجدۂ شکر ادا کیا اور نماز و دعا سے فارغ ہو کر بارش میں بھیگتا اور صدقہ و خیرات کرتا ہوا، عام لوگوں کے ساتھ گھر آیا۔

سلطان مظفر حلیم کے اس قسم کے متعدد واقعات کتبِ تاریخ میں منقول ہیں۔ اس پر نرمی اور حلیمیت اس درجہ غالب تھی کہ لفظ "حلیم"، اس کے نام کا مستقل جز بن گیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ اپنے دیگر فرائضِ سلطانی سے محروم تھا اور محض ایک نیک اور متحمل مزاج حکمران تھا۔ یہ گجرات کا نہایت باہمت، فاتح، صاحبِ تدبیر اور شجاع بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں مملکتِ گجرات کی حدود میں بڑی وسعت ہوئی اور متعدد علاقے اور مضبوط قلعے مفتوح ہوئے۔ لیکن اس موقع پر اس کی زندگی کے اس پہلو کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں، صرف اس کے علمی گوشوں کی وضاحت اور علم و علما سے تعلقات اور روابط کی نشان دہی پیشِ نگاہ ہے۔

سلطان باقاعدہ عالمِ دین تھا، حصولِ علم کا اس درجہ شائق تھا کہ ایامِ سلطانی میں اساتذۂ حدیث سے صحاح ستہ کا درس لیا اور یہ کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں کتبِ تفاسیر میں سے تفسیر معالم التنزیل زیرِ مطالعہ رہتی حصولِ علم کے بارے میں اس کی

تگ و تاز کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :

روزے تفسیر معالم التنزیل مطالعہ می فرمود۔ گفت کہ من در ایام بادشاہی نسبت با یام شاہزادگی تحصیل بیشتر کردم۔ صحاح ستہ را در ایام سلطانی خواندم۔ الحال نصف تفسیر معالم التنزیل مطالعہ کردم و امید دارم کہ نصف دیگر در بہشت خوانم[۱۴۰]

ایک دن وہ تفسیر معالم التنزیل کا مطالعہ کر رہا تھا کہ کہا میں نے زمانۂ بادشاہی میں بہ نسبت زمانۂ شاہزادگی کے زیادہ علم حاصل کیا ہے۔ صحاح ستہ کی تکمیل زمانۂ بادشاہی میں کی ہے۔ اب تک نصف معالم التنزیل پڑھ چکا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ نصف باقی جنت میں پڑھوں گا۔

وفات

مظفر حلیم کی وفات جمعہ کے روز ہوئی۔ سورج ڈھل چکا تو وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی۔ نماز کے بعد محل سرا میں جانے لگا تو قدم لڑکھڑا گئے۔ طبیعت پہلے سے خراب تھی۔ اب اور نقاہت طاری ہو گئی۔ مستورات رونے لگیں تو انھیں صبر کی تلقین کی۔ اتنے میں ایک مصاحبِ خاص اسد الملک راجہ محمد حسین آیا۔ اس کے لیے علم و عمل کی دعا کی اور کہا، تم نے میری بڑی خدمت کی ہے، اس کا بدلا تو تمھیں اللہ ہی دے گا، اب آخری خدمت یہ کرو کہ وفات کے وقت میرے پاس حاضر رہو، اور سورۂ یٰسٓ پڑھو۔ مجھے غسل اپنے ہاتھ سے دینا۔ اس کے بعد راجہ ممدوح کے لیے دعائے خیر کی۔ اتنے میں اذان کی آواز کان میں پڑی تو پوچھا، اذان وقت پر ہو رہی ہے؟ اسد الملک نے جواب دیا، یہ جمعہ کی اذان ہے اور ان لوگوں کے لیے ہے جو نماز میں حاضر ہونے کی طاقت رکھتے ہیں۔ سلطان نے کہا، ظہر کی نماز تو میں تمھارے پاس پڑھوں گا، لیکن عصر کی نماز ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے اللہ کے پاس جنت میں ادا کروں گا۔ یہ کہہ کر لوگوں کو نمازِ جمعہ کے لیے مسجد میں بھیج دیا اور خود گھر میں نمازِ ظہر پڑھی اور بصورتِ دعا یہ آیت تلاوت کی :

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ

---

[۱۴۰] مرآتِ سکندری ص ۲۰۵، ۲۰۶

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قف اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ج تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ہ (سورۂ یوسف : ۱۰۱)

اے میرے پروردگار! تونے مجھے سلطنت کا بڑا حصہ عطا فرمایا، اور مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم سکھایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے۔ مجھ کو پوری فرماں برداری کی حالت میں دنیا سے اٹھائیو اور مجھ کو نیک بندوں شامل کیجیو۔

اس کے بعد مصلّے سے اٹھا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ قبلہ رُخ ہو کر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا اور جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی ـــ اس عادل و عالم بادشاہ نے پندرہ سال آٹھ مہینے حکومت کرنے کے بعد ۲ جمادی الاولیٰ ۹۳۲ھ کو وفات پائی۔[1]

بہادر شاہ

دسویں صدی ہجری کے سلاطینِ گجرات میں سلطان بہادر شاہ کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ سلطان مظفر کا لڑکا تھا۔ عید الفطر کے دن ۹۳۲ھ کو تختِ گجرات پر متمکن ہوا۔ تہوّر و شجاعت، تدبیر و سیاست، فہم و فراست اور سخاوت و معدلت گستری میں اپنے اسلاف کا صحیح نمونہ تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں سلطنتِ گجرات کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا، اس میں کئی نئے علاقے اور نئے شہر داخل ہوئے، جن میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا اور سکّہ جاری کیا گیا۔ پھر یہ تماشا بھی چشمِ فلک نے اسی کے عہد میں دیکھا کہ ۹۴۲ھ میں ہمایوں نے گجرات کا قصد کیا اور اس پر حملہ کر کے بعض علاقوں میں سلطان کو شکست دی۔

سلطان بہادر شاہ کو پرتگالیوں نے بندر دیو میں ۳ رمضان ۹۴۳ھ کو دھوکے سے شہید کر دیا تھا۔ اس وقت سلطان تنہا تھا، کوئی دوسرا اس کے ساتھ نہ تھا، ایک

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مرآتِ سکندری ص ۱۷۳ تا ۲۳۵ ـــ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۱۳۱۳ تا ۲۲۴۔

پرتگالی مریض کی عیادت کے بہانے سے اس کو وہاں بلایا گیا، ندیموں اور مصاحبوں نے ہر چند جانے سے روکا اور پرتگالیوں کی نیت پر شبہے کا اظہار کیا مگر سلطان نے کوئی پروا نہ کی اور ساتھیوں کے روکنے کے باوجود کشتی میں سوار ہو کر بندر دیو کا عزم کیا اور مرتبۂ شہادت سے سرفراز ہوا — بہادر شاہ بیس[۲] سال کی عمر میں تختِ گجرات پر بیٹھا - گیارہ سال حکومت کی، اکتیس[۳۱] برس کی عمر میں درجۂ شہادت حاصل کیا۔[۴۲]

سلطنت گجرات کا آخری بادشاہ محمود بن لطیف تھا، اس نے اوائل ربیع الاول ۹۴۴ھ کو گجرات کا چترِ شاہی اس وقت سر پر رکھا، جب حکومت کی بنیادیں ہل چکی تھیں اور مغلوں نے ارضِ گجرات کو اپنے شدید حملوں کا نشانہ بنالیا تھا۔ سلطان محمود کو اوائل ربیع الاول ۹۶۱ھ میں قتل کیا گیا اور اس کی موت کے ساتھ ہی گجرات کا ڈیڑھ سو سالہ دورِ حکومت ختم ہو گیا۔ اب گجرات دوبارہ تختِ دہلی کے ماتحت آگیا اور اس پر مغلوں کا پرچم اقتدار لہرانے لگا۔

نویں صدی ہجری کے سلاطینِ گجرات نے علم و علما کی جو خدمات انجام دیں اس کا ذکر فقہائے ہند کی دوسری جلد کے مقدمہ میں کیا جا چکا ہے اور جو واقعاتِ علمیہ دسویں صدی ہجری کے عہد میں رونما ہوئے، ان کا تذکرہ اختصار کے ساتھ ان سطور میں پیش کر دیا گیا ہے۔

سلاطینِ سندھ

برِصغیر میں علاقۂ سندھ کو باب الاسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نواح میں یہ وہ خطۂ ارض ہے، جہاں پہلے پہل اسلام کے قدم جمے اور اس ملک میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے پھیلاؤ کے لیے فضا ہموار ہوئی۔ قدیم دور کے برصغیر میں سندھ اور ہند دو الگ الگ ملک تھے اور سندھ کو اسلامی علوم کے مرکز کی حیثیت حاصل

---

[۴۲] تفصیلات کے لیے دیکھیے مرآتِ سکندری ص ۲۵۸ تا ۳۲۸۔

تھی۔ ہم اس موقع پر اپنے موضوع کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھنا چاہتے مختصر الفاظ میں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دسویں صدی ہجری کے سندھ کی علمی حیثیت کیا تھی اور اس کے کون کون حکمران علم و علما سے کس درجہ تعلق و مودت رکھتے تھے۔

شاہی بیگ

دسویں صدی ہجری کے سندھی ملوک و سلاطین میں تاریخ ہمیں ایک بہت بڑے فاضل، عالم دین اور منصف حکمران سے متعارف کراتی ہے، جس کا نام شاہی بیگ بن ذی النون ارغون قندھاری ہے۔ شاہی بیگ دراصل قندھار کا بادشاہ تھا جو اپنے باپ ذی النون کی وفات کے بعد تختِ قندھار کا وارث بنا تھا۔ اس کا اسلوبِ زندگی دیگر حکمرانوں سے بہت حد تک مختلف تھا، یہ علم و فضل کا پیکر اور تدین و صالحیت کا مرقع تھا۔

شاہی بیگ کا شاہانہ اقتدار عرصہ تک سرزمینِ قندھار پر رہا پھر ۹۱۳ھ میں مغل حکمران بابر نے قندھار پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ شاہی بیگ نے بابر سے شکست کھا کر سندھ کا رخ کیا اور اس علاقے کو فتح کر کے اپنے تسلّط میں لے لیا۔

شاہی بیگ عالمِ دین اور معقولات و منقولات کا ماہر بادشاہ تھا، اور کئی کتابوں کا مصنف تھا۔ اس نے متعدد فنی و علمی کتابوں پر حواشی و تعلیقات بھی لکھیں، جن میں شرح کافیہ، تعلیقات علی شرح المطالع، سیّد شریف کی شرح سراجیہ پر تعلیقات جو علمِ میراث کے موضوع سے متعلق ہے، خاص طور سے مشہور ہیں۔

ان کے علاوہ دیگر کتب و رسائل پر بھی بہت سے حواشی و تعلیقات سپردِ قلم کیے۔

سندھ کے اس ذی علم اور صاحبِ تصنیفات حکمران نے ۲۸ شعبان ۹۲۸ ہجری کو بھکّر میں وفات پائی اور عارضی طور پر اسے وہیں دفن کیا گیا۔ بعد ازاں اس کی میّت مکّہ مکرمہ منتقل کی گئی اور قبرستان معلّی میں اس کی تدفین

عمل میں آئی۔[۴۳]

اس کے عہد کے علمائے کرام اور فقہائے عظام کے حالات کتاب کے آئندہ اوراق میں مذکور ہیں۔

مرزا شاہ حسین

مرزا شاہ حسین ۸۷۶ھ میں پیدا ہوا اور اپنے باپ شاہی بیگ کی وفات کے بعد ۹۲۸ھ کو حکومتِ سندھ کی باگ ڈور ہاتھ میں لی۔ اس نے عہدِ علم وفضل میں پرورش پائی اور سلطنت وحکمرانی کے ماحول میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ ابتدائے عمر ہی میں اسے اس عہد کے جیّد علمائے کرام کے حلقۂ تلمذ میں داخل کر دیا گیا تھا، جن میں مصلح الدین لاری اور شیخ یونس سمرقندی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہیں۔ ایک مدت تک یہ ان مشاہیر اساتذۂ کرام کی ملازمت وصحبت میں رہا، اور مختلف علوم وفنون میں مہارت پیدا کی۔ یہ اس دور کے سندھ کا وہ بادشاہ تھا جس کے علم وفضل اور تحقیق وتفحص کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔

زمانۂ طالب علمی میں یہ اپنے درس کے مضامین کو باقاعدہ ضبطِ تحریر میں لانے کا عادی تھا اور یہ مضامین کئی اجزا میں پھیل گئے تھے۔ تاریخ معصومی کے مصنف سید معصوم کا بیان ہے کہ انھوں نے بلدۂ سیوستان میں وہاں کے قاضی کے پاس ان مسودات کو دیکھا تھا وہ دس اجزا پر مشتمل تھے۔

مرزا شاہ حسین بڑا عادل وکریم اور محبِّ اہلِ علم وارباب اشراف تھا۔ ان سے اس کی طویل صحبتیں رہتیں، انتہائی عزت واحترام سے پیش آتا، ان کی علمی مجلسوں سے مستفید ہوتا، امورِ مہمہ میں ان سے مشورے لیتا، شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں آگے قدم بڑھاتا اور

---

[۴۳] تفصیلات کے لیے دیکھیے معاصر رحیمی ج ۲ ص ۲۸۴ تا ۲۹۶ — تاریخ فرشتہ ج ۲، ص ۵۱۳، ۵۱۴۔

انھیں صلات و جوائز سے نوازتا تھا۔

اس کے عہدِ حکومت کا یہ واقعہ کتبِ تاریخ میں مرقوم ہے کہ ۹۲۷ھ میں ایک عالم دین قاضی شکر اللہ قندھار سے سندھ کے ایک شہر ٹھٹھہ تشریف لے گئے۔ سندھ میں ان دنوں سلطان شاہی بیگ دادِ حکمرانی دیتا تھا۔ اس نے ان کی قابلیت اور گوناگوں صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ان کو ٹھٹھہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ اس منصب کی نازک اور اہم ذمہ داریوں کو انھوں نے وقار و احترام اور دبدبہ و طنطنہ کے ساتھ انجام دیا۔ شاہی بیگ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مرزا شاہ حسین وارثِ تخت ہوا۔ ایک مرتبہ اس نے بعض تاجروں سے چند گھوڑے خرید کیے اور ان کی قیمت ادا کرنے سے عمداً تساہل و تاخیر سے کام لیا۔ تاجروں نے ناامید ہو کر قاضی شکر اللہ سے رجوع کیا اور ان کی عدالت میں بادشاہ کے خلاف مدعی بن کر حاضر ہوئے۔ قاضی موصوف نے مدعا علیہ کی حیثیت سے بادشاہ کو عدالت میں طلب کیا۔ وہ عدالت میں حاضر ہوا تو اسے مدعی تاجروں کے ساتھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔ دعویٰ پیش ہوا۔ قاضی کے سوال پر مدعا علیہ بادشاہ نے تاجروں کے موقف کی تصدیق کی اور قیمت نہ ادا کرنے کا اقرار کیا۔ قاضی نے تاجروں کے حق میں فیصلہ دیا اور سلطان نے تاجروں کو قیمت ادا کر دی۔ فیصلے کے بعد قاضی شکر اللہ اپنی مسند سے اٹھے، قاعدہ کے آدابِ سلطانی بجا لائے اور سلطان کو اپنے پاس بٹھایا۔ اب بادشاہ نے تلوار نکالی جو اس نے قبا میں چھپا رکھی تھی اور اسے قاضی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا: ”یہ تلوار میں نے آپ کے لیے رکھی تھی۔ اگر آپ صحیح فیصلہ نہ کرتے اور میرے لحاظ میں اپنے مقام و منصب کی ذمہ داریوں کا خیال نہ رکھتے تو اس تلوار سے آپ کی گردن اڑا دیتا۔“ قاضی شکر اللہ نے بھی بادشاہ کی یہ بات سن کر مسند کے نیچے سے برہنہ تلوار نکال کر بادشاہ کو دکھائی اور کہا: ”میں نے بھی یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ مبادا بادشاہ خلافِ شریعت قدم اٹھائے اور کوئی شخص اسے ٹوکنے کی جرأت نہ کرے تو میں خود اس تلوار سے سیاستِ شرعی بجا لاؤں گا۔“

اس کے بعد سلطان اس فیصلے پر اظہارِ مسرّت کرتے ہوئے عدالت سے باہر نکل گیا۔ اس نے صرف اس بنا پر تاجروں کو قیمت ادا کرنے میں تساہل سے کام لیا تھا کہ وہ قاضی موصوف کو اپنے بارے میں آزمانا چاہتا تھا اور اسے یہ معلوم کرنا مقصود تھا کہ قاضی صحیح فیصلہ کرتا ہے یا نہیں۔؟ اس واقعہ سے کچھ عرصہ بعد قاضی شکر اللہ منصبِ قضا سے الگ ہو گئے تھے اور سب امور سے منقطع ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔[۴۴]

مرزا شاہ حسین نے ۱۱ ربیع الاول ۹۶۲ھ کو وفات پائی۔ اس کی میّت مکّہ مکرّمہ منتقل کی گئی اور اپنے باپ کے پہلو میں اسے دفن کیا گیا۔ اس نے چھیاسی [۸۶] سال عمر پائی اور چونتیس [۳۴] برس حکومت کی۔

اس کے عہدِ حکومت کے فقہائے کرام کا تذکرہ کتاب کے آئندہ صفحات میں ملے گا۔

جام نظام الدین

نظام الدین نندہ بن بابینہ بن انڑ بن صلاح الدین بن تماجی۔ یہ سندھ کے قبیلہ سمہ سے تعلق رکھتا تھا۔ شیخ شہاب الدین احمد بن حجر مکّی نے اپنے رسالہ ریاض الرضوان میں مآثرِ عبدالعزیز آصف خاں کے ضمن میں اس کا سلسلۂ نسب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچایا ہے۔ آصف خاں کی روایت سے یہ بھی لکھا ہے کہ جام نظام الدین نندہ مخزومی تھا اور قبیلۂ بنی مخزوم کا فرد تھا۔ لیکن مشہور یہ ہے کہ وہ اسی برصغیر کا نجار تھا اور قبیلۂ سمہ سے تعلق رکھتا تھا۔ بہر حال وہ نسباً کوئی بھی ہو، یہ واقعہ ہے کہ دسویں صدی ہجری کے سندھ کا نہایت عادل و منصف، عالم و فاضل، رحم دل، خدا ترس، رعایا پرور، نرم خو اور نیک فطرت بادشاہ تھا۔ اس نے ۵ ربیع الاول

---

[۴۴] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، تاریخ معصومی ص ۱۹۵ تا ۲۷۱ — تاریخ فرشتہ ج ۲، ص ۵۱۴، ۵۱۵ — مآثر رحیمی ج ۲، ص ۲۹۷ تا ۳۲۲

۸۶۶ھ کو سندھ کی زمام حکومت ہاتھ میں لی اور اڑتالیس[۴۸] سال تک برسر اقتدار رہا۔ خود عالم تھا اور اہلِ علم سے مشفقانہ مراسم رکھتا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنے دو اصحاب علم مصاحبوں ــ شمس الدین اور میر معین الدین ــ کو علامہ جلال الدین دوّانی کی خدمت میں مختلف تحائف دے کر شیراز بھیجا اور انھیں سندھ تشریف لانے کے لیے عرض کیا لیکن ان کے پہنچنے سے قبل دوّانی وفات پاچکے تھے۔

جام نظام الدین کی نیکی اور مسلمانوں سے محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ مسلمان حکمرانوں سے لڑائی کو سخت ناپسند کرتا تھا اور اپنے گھوڑے کی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر کہا کرتا تھا، اللہ ہمیں لڑائی کے لیے تیری پیٹھ پر سوار ہونے سے بچائے، کیوں کہ ہمارے ملک کی سرحدیں مسلمانوں سے ملی ہوئی ہیں۔ آخر ہم کس سے برسرپیکار ہوں گے۔ بہرکیف جام نظام الدین ندہ سندھ کا ایک بہت ہی متقی، متورع اور نیک کردار بادشاہ تھا۔ اس کے عصر کو تاریخ میں احسن الاعصار سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے عہد کو بہترین عہد کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے زمانے کے علما و فقہا کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے ــ سندھ کے اس بلند اطوار بادشاہ نے ۹۱۴ھ کو وفات پائی[۴۵]۔

کشمیر

سرزمین برِصغیر کا یہ سرسبز و شاداب خطّہ جسے وادیٔ کشمیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اسلام کی نشر و اشاعت کے اعتبار سے آٹھویں صدی ہجری سے قبل تقریباً بنجر تھا۔ اس میں شاہ مرزا ابن طاہر خراسانی نے اسلام کی شمع روشن کی، جو ۷۱۵ھ کو کشمیر آئے اور ایک ہندو راجہ کے حلقۂ ملازمت میں داخل ہوگئے۔ بہت تھوڑے عرصے میں یہ حکومتِ کشمیر کے اعلیٰ منصب پر فائز ہوگئے اور پھر اپنے اثر و رسوخ اور مقبولیت کی وجہ سے تختِ شاہی پر قبضہ کرلیا۔ ان کا پوتا سلطان سکندر سلاطینِ کشمیر میں سب سے

---

[۴۵] معاصر رحیمی ج ۲ ص ۲۷۲ تا ۲۷۴

زیادہ طاقت ور اور با اثر حکمران تھا۔اس کے لڑکے سلطان زین العابدین (۸۲۷ ھ تا ۸۷۷ ھ) نے پچاس سال تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ یہ دور اس خاندان کی حکومت کا انتہائی عروج کا دور تھا۔اس بلند ہمت بادشاہ نے کئی شہر آباد کیے۔آمد و رفت کے لیے پُل تعمیر کیے اور نئے قلعے بنائے۔اس کا دار السلطنت سری نگر تھا،اس کی توسیع و ترقی کی طرف اس نے خاص طور پر توجہ مبذول کی۔اس خاندان کی حکومت کا سلسلہ ۹۹۵ ھ تک چلا،جبکہ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے اس کو فتح کر کے اپنی حدودِ مملکت میں شامل کر لیا۔

کشمیر کے پہلے قابلِ ذکر عالم دین اور نامور مصنف و مبلغ امیر کبیر سید علی ہمدانی (۷۸۶ ھ) تھے۔ یہ اصلاً ہمدان کے باشندے تھے، وہاں سے ہجرت کر کے کشمیر آئے اور پھر مستقل طور پر یہیں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ان کے فرزند سید محمد بھی اچھے عالم اور مصنف تھے۔ان کے بعد دسویں صدی ہجری کے علمائے کرام میں مولانا رضی الدین کشمیری (متوفی ۹۵۶ ھ) اور مفتی فیروز کشمیری (متوفی ۹۷۷ ھ) کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

اس عہد کے کشمیری علما و فقہا کا تذکرہ قارئینِ محترم کتاب کے آئندہ اوراق میں پڑھیں گے۔

سلطنتِ مالوہ

ارضِ ہند میں علم و فضل کے نشر و ذیوع کے سلسلے میں مالوہ کی سلطنت کا ذکر بھی کتب تاریخ میں نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔ یہ سلطنت ۸۰۴ ھ میں عالمِ وجود میں آئی۔ اور ۹۷۰ ھ تک قائم رہی۔اس اثنا میں یکے بعد دیگرے متعدد حکمران اس کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے،جن میں سے بعض نے علم و ادب کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بالخصوص سلطان محمود نے اپنے عہدِ حکومت میں علما کی بڑی پذیرائی کی اور علم کی خدمت کو اپنی زندگی کا ضروری جز قرار دیا۔ دسویں صدی ہجری میں ارضِ مالوہ میں جن علمائے کرام کے نقوشِ علمی اُجاگر ہوئے، ان میں چندیری کے مولانا شاہ احمد

شرعی کا اسمِ گرامی تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ ثبت رہے گا، جو عالمِ دین، فقیہ، کثیر العبادت اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ ان کے حالات میں یہ واقعہ مرقوم ہے کہ ایک مرتبہ تفسیر کشاف کے نامور مصنف زمخشری نے جو مسلکاً معتزلی تھے، اہلِ سنت پر طعن کرتے ہوئے یہ دو شعر کہے:

وجماعۃ سموا ھواھم سنۃ وجماعۃ حمر لعمری مؤلفۃ

قد شبھوا بخلقہ فتخوفوا شنع الوریٰ فتستروا بالبلکفۃ

مولانا شاہ احمد شرعی نے اسی وزن اور قافیہ میں اس کا جواب ان دو شعروں میں دیا:

عجبا لقوم ظالمین تلقبوا بالعدل ما فیھم لعمری معرفۃ

قد جاءھم من حیث لا یدرونہ تعطیل ذات اللہ مع نفی الصفۃ

شاہ احمد شرعی نے ۹۲۸ھ کو وفات پائی ۔[۴۶]

دکن کی سلطنتیں

سلطان محمد بن تغلق کی وفات کے بعد ہندوستان کی مرکزی حکومت میں کمزوری و اضمحلال کے آثار پیدا ہو گئے تھے، بلکہ دکن کی بہمنی سلطنت تو اس کی زندگی ہی میں عالمِ وجود میں آگئی تھی اور بہت مضبوط ہو گئی تھی۔ سلطان مذکور نے اس کو باقاعدہ تسلیم بھی کر لیا تھا۔ بہمنی سلطنت رو بزوال ہوئی تو علاقہ دکن میں چھوٹی بڑی پانچ سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں، جن میں تین سلطنتیں اپنے اوصاف و خصوصیات کی بنا پر بڑی اہم تھیں، اور وہ تھیں، بیجاپور کی عادل شاہی، گولکنڈہ کی قطب شاہی اور احمد نگر کی نظام شاہی سلطنتیں۔ ان سلطنتوں میں علم و تحقیق کے میدان میں

---

۴۶ اخبار الاخیار ص ۲۲۰، ۲۲۱ ــــ تذکرہ علمائے ہند ص ۸۲ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۳۲، ۱۳۳۔

بڑی وسعت پیدا ہوئی اور متعدد علمائے کرام نے مختلف علوم و فنون پر کتابیں تصنیف کیں۔ مدارس جاری کیے اور تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ تفصیل کا یہ محل نہیں، اختصار کے ساتھ ہم ان حکومتوں اور ان کے حکمرانوں کی خدمتِ علمی کا ذکر کریں گے۔

عادل شاہی سلطنت

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت، اگرچہ ہندوستان کی علاقائی سلطنت تھی لیکن بڑی منضبوط اور مستحکم سلطنت تھی۔

یوسف شاہ

عادل شاہی خاندان کا پہلا حکمران یوسف شاہ تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اصلاً ترکی کے عثمانی خاندان کا فرد تھا اور سلطان مراد بن بایزید یلدرم (متوفی ۸۹۴ھ) کا بیٹا تھا۔ سلطان مراد کے بعد ترکی کی عنانِ حکومت اس کے بیٹے سلطان محمد فاتح نے اپنے ہاتھ میں لی تو یوسف کو اپنے اس بڑے بھائی سے جان کا خطرہ پیدا ہو گیا اور وہ اس کے ڈر سے ترکِ وطن پر مجبور ہو گیا۔ ترکی سے بھاگ کر پہلے وہ ساوہ کے مقام پر گیا۔ بعدازاں داخلِ ہند ہوا۔ یہاں آ کر اس نے احمد آباد میں سکونت اختیار کی۔ پھر حالات نے اس کی موافقت کی اور اسے بیجاپور کا والی مقرر کر دیا گیا۔ پانچ سال وہ اس منصب پر متعین رہا۔ منقول ہے کہ ۸۹۶ھ کو محمود شاہ بہمنی کے ایامِ حکومت میں اس نے سلطنتِ بہمنیہ کے متعدد شہروں پر قبضہ کر لیا اور بالآخر بیجاپور میں عادل شاہ کا لقب اختیار کر کے وہاں کا مستقل بادشاہ بن گیا۔ یہ شیعی المسلک تھا۔ ۹۰۸ھ کو اس نے بیجاپور میں بارہ اماموں کے نام کا خطبہ پڑھا۔ ملوکِ ہند میں یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے اپنے ملک میں ائمہ اثنا عشرہ کے نام کا خطبہ پڑھا اور اس مذہب کی ترویج کی ـــ یہ عادل، کریم النفس، حلیم الطبع اور عالم و فاضل حکمران تھا۔ علما کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اچھا شاعر بھی تھا۔ یہ شعر اسی کے ہیں:

آں کس کہ علم را بہ نیک نامی گزاشت — در مزرع دہر تخم بنکوئی کاشت
نیکواں زندۂ جاوید اند — مرد آنکہ بمرد و نام نکو نگزاشت

بیجاپور کے عادل شاہی خاندان کا یہ پہلا حکمران تھا۔ اس نے ۹۱۷ھ کو وفات پائی۔

علی عادل شاہ

عادل شاہی حکمرانوں میں ایک حکمران علی عادل شاہ تھا، جو خود بھی صاحبِ علم تھا اور علمائے کرام کا بھی بدرجۂ غایت قدر دان تھا۔ علم نحو، منطق، فلسفہ، حکمت اور علمِ کلام کا ماہر تھا۔ ان علوم کی تحصیل اس نے اپنے دور کے مشہور فضلا، خواجہ عنایت اللہ شیرازی اور امیر فتح اللہ شیرازی سے کی تھی۔ خطِ نسخ، خطِ ثلث اور خطِ رقاع میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ شعر و انشا، فنِ حرب اور علومِ سیاسیہ میں درجہ کمال پر فائز تھا۔ یہ ۹۶۵ھ میں بیجاپور کے تخت پر متمکن ہوا۔ اس کے عہدِ حکومت میں بیجاپور کو مدینۃ العلم کی حیثیت حاصل تھی۔

علی عادل بھی مسلکاً شیعہ تھا لیکن علم و علما کی تعظیم و تکریم میں بڑا وسیع القلب تھا۔ اس کے زمانے میں حدودِ مملکت میں بھی وسعت پیدا ہوئی اور اس نے متعدد مستحکم قلعے اور کئی شہر فتح کیے۔ اس کے دورِ حکومت میں بھی بارہ ائمہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ شیعہ علما کو اس کے نزدیک بالخصوص تقرب حاصل تھا اور اس کی سلطنت میں شیعہ مذہب کی بڑی ترویج ہوئی۔ اس عالم و فاضل بادشاہ نے تیئس ۲۳ سال حکومت کر کے ۲۳ صفر ۹۸۸ھ کو وفات پائی۔

سلطنتِ قطب شاہیہ

علاقۂ دکن میں سلطنتِ قطب شاہیہ کا آغاز اس طرح ہوا کہ عراق کے شاہی خاندان کا ایک شخص قلی نامی سلطان محمود شاہ بہمنی کے زمانے میں ارضِ دکن میں وارد ہوا۔ یہ شخص دراصل شاہِ عراق میرزا جہان شاہ مقتول کا نواسہ تھا اور اس

کی جائے ولادت ہمدان تھی۔ سلطان محمود شاہ بہمنی کے غلاموں میں ترک غلاموں کو بڑی عزت اور اہمیت حاصل تھی۔ اس نے قلی کو ان ہی غلاموں کی سلک میں منسلک کر لیا۔ یہ شخص علم حساب کا ماہر تھا اور خطِ سیاق کی کتابت میں عبور رکھتا تھا، لہذا سلطانی حرم کے محلات کا مشرف مقرر ہوا۔ شاہی خاندان کی مستورات اس کے حسنِ اخلاق اور امانت و دیانت سے بہت خوش تھیں۔ اتفاق سے حرم شاہی کی جاگیروں کے بعض منتظمین کی طرف سے جو علاقہ تلنگ میں واقع تھیں یہ شکایات پہنچنا شروع ہوئیں کہ وہاں چوروں اور رہزنوں کی بہت بڑی تعداد نے قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے اور منتظمین جاگیر اور عام رعایا ان سے سخت پریشان ہے۔ سلطان نے ان کی سرکوبی کے لیے کچھ لوگوں کو بھیجنا چاہا تو قلی نے اپنی خدمات پیش کیں اور رہزنوں کی سرکوبی کا وعدہ کیا۔ چنانچہ سلطان نے اس کی درخواست منظور کر کے ایک لشکر کا سپہ سالار بنا کر اس کو وہاں بھیجا۔ اس نے چند ہی روز میں قطّاعِ طریق اور رہزنوں سے پورے علاقے کو صاف کر دیا اور سرکشوں کا نام و نشان باقی نہ چھوڑا۔ سلطان نے خوش ہو کر اس کو کئی دیہات اور بلدۂ گولکنڈہ بطور جاگیر عطا کیے اور قطب الملکی کے خطاب سے نوازا۔ یہ مدت تک اس نواح میں سپہ سالار کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا رہا۔ اس دور میں اس کو مختلف فرمانوں اور تحریروں میں صاحب القلم والسیف لکھا جاتا تھا۔

بعد کو جب سلطان محمود شاہ بہمنی کی سلطنت میں کمزوری کے آثار نمودار ہوئے تو اس علاقے میں ۹۱۸ھ کو اس نے خود اپنی حکومت قائم کر لی اور قطب شاہ کے نام سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس مملکت کے اہم مناصب پر اس نے اپنے عزیزوں اور بھائیوں کو فائز کیا اور سلطان محمود شاہ بہمنی سے بھی تعلقات قائم رکھے۔ اس کی خدمت میں شاہی رسم و رواج کے مطابق تحائف و ہدایا پیش کیے اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ اس نے بھی بارہ اماموں کے نام کا خطبہ پڑھنا شروع کیا اور اثنا عشری مذہب اختیار کیا۔

قطب شاہ نے بہمنی سلاطین سے تو گہرے اور مخلصانہ تعلقات قائم کیے مگر مختلف حکومتوں اور فرماں رواؤں کی طرف سے اس کو بہت سی پریشانیاں بھی لاحق ہوئیں، جن کو معرضِ تحریر میں لانا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ تاہم مجموعی طور پر اس کا دورِ حکومت علما و فقہا کے لیے اطمینان بخش تھا۔ اس کے عہد میں جہاں مملکت کی حدیں وسیع ہوئیں وہاں علوم و فنون نے بھی ارتقا کی منزلیں طے کیں۔

قطب شاہ نے خاصی لمبی عمر پائی۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ جمشید، حیدر اور ابراہیم۔ جمشید بھی کافی عمر کو پہنچ گیا تھا اور تمنائے بادشاہی میں داڑھی سفید کرلی تھی۔ اس نے ایک ترک غلام کو باپ کے قتل پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ایک دن بادشاہ دریا کے کنارے بیٹھا تھا کہ جمشید کے ترک غلام نے تلوار سے اس کا سر قلم کردیا۔ جمشید نے جو پاس ہی کھڑا تھا، شمشیر آب دار سے اس غلام کا بھی خاتمہ کردیا تاکہ کسی وقت باپ کے قتل کا راز فاش نہ ہوسکے۔ قطب شاہ کا سانحہ قتل ۹۵۰ھ کو پیش آیا اور اس نے تینتیس ۳۳ سال حکومت کی۔

جمشید قطب

سلطان قلی قطب کے بعد اس کا بیٹا جمشید قطب شاہ دکن کی گولکنڈہ سلطنت کے تختِ حکومت پر متمکن ہوا۔ یہ بھی مذہباً شیعہ تھا۔ اس کے عہد کا یہ واقعہ قابلِ بیان ہے کہ اس زمانے میں ابراہیم عادل شاہ اور برہان نظام شاہ کے درمیان بعض معاملات میں جھگڑا چل رہا تھا۔ جمشید قطب شاہ اس سلسلے میں برہان نظام شاہ کا حامی تھا۔ وہ اس کی مدد کے لیے فوج لے کر روانہ بھی ہوا مگر اس اثنا میں برہان نظام شاہ اور ابراہیم عادل شاہ کے درمیان مصالحت ہوگئی تھی۔

اس صلح سے قطب شاہ خوش نہ تھا، اس نے برہان نظام شاہ سے اس کا اظہار کیا اور اس کی طرف جانے کے لیے عازم سفر ہوا، مگر اس کی سلطنت کے ایک عالم دین

مُلا محمود نے اس کو اس سفر سے روکا اور ان خطرات سے آگاہ کیا، جن کے پیش آنے کا انھیں یقین تھا، قطب شاہ کو اس پر غصہ آگیا اور اس نے جوشِ غضب میں مُلا محمود کی ناک کاٹ ڈالی۔ اب قطب شاہ وہاں پہنچا تو اس کی مخالفت میں ہنگامہ بپا ہوگیا اور تلوار سے قطب شاہ کا چہرہ، ناک اور گلا زخمی ہوگئے، جس کی وجہ سے اس کو اکل وشرب میں سخت دشواری پیش آتی تھی اور وہ کسی کے سامنے کوئی چیز تناول نہ کرتا تھا۔

اس حادثہ کے بعد وہ مُلا محمود سے طالبِ عفو ہوا اور انھیں اپنے دربار میں تشریف لانے کی دعوت دی مگر انھوں نے آنے سے معذرت کردی۔ شدتِ مرض سے جمشید نہایت بدمزاج اور بداخلاق ہوگیا تھا۔ ذرا ذراسی بات پر لوگوں کو جیل میں ڈال دیتا اور موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ اس نے سات سال حکومت کرکے ۹۵۷ھ میں بعارضہ تپِ دق وفات پائی۔

سلطان ابراہیم قطب شاہ

جمشید کے بعد اس کا بھائی ابراہیم قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ بھی مذہباً شیعہ تھا۔ بڑا عقل مند وفہیم، مدبر اور سخی تھا، لیکن قہر وغضب کا عنصر اس کے مزاج پر غالب تھا۔ ذراسی بات پر ناراض ہوجاتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ تازیانہ کی ضرب سے مخالف کے پاؤں کے ناخن انگلیوں سے علیحدہ کرکے برتن میں رکھ کر اس کے سامنے لائے جائیں تو اسے اطمینان ہوگا۔

اس کے عہد میں راستوں اور جنگلوں میں ڈاکوؤں اور چوروں کی بڑی کثرت ہوگئی تھی۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس کا طریق احتساب وحفاظت اس انداز کا تھا کہ سوداگر اور تاجر ان سے بالکل محفوظ تھے اور بلا کسی خوف اور خطرے کے دن رات محوِ سفر رہتے تھے۔

ابراہیم قطب شاہ نے تیئیس ۲۳ سال چند ماہ حکومت کرنے کے بعد ۹۸۹ھ کو وفات پائی۔

سلطنتِ نظام شاہیہ

نظام شاہیہ سلطنت کی ابتدا نظام الملک بحری سے ہوئی۔ اس کے تختِ حکومت پر بھی دسویں صدی ہجری میں کئی نیک دل اور علم پرور بادشاہ متمکن ہوتے، جن کے عہد میں علما کی بڑی قدردانی ہوئی اور علوم و فنون کے نشر و اشاعت میں اضافہ ہوا۔

سلطنتِ ملتان

برِصغیر کی دسویں صدی ہجری کی علاقائی سلطنتوں میں ایک سلطنت ملتان کی تھی۔ ملتان، اقلیم برِصغیر کا وہ خطۂ ارض ہے جو اسلام کے ابتدائی عہد ہی میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی ضوافشانیوں سے منوّر ہو گیا تھا۔ اس کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ ہمیشہ اسلام کی نامور اور اہم شخصیتوں کا مسکن رہا اور اس کی گود میں جلیل القدر علما و فقہا اور مشائخِ کرام نے نشو و نما پائی اور پھر آگے چل کر ان کی خدماتِ گوناگوں کا دائرہ انتہائی وسعت پذیر ہوا۔ ملتان شہر کے علاوہ اس کے گرد و نواح اور مضافات میں بھی بہت سے جلیل القدر علمائے کرام پیدا ہوئے، جنھوں نے مختلف علوم و فنون پر کتابیں تصنیف کیں اور اپنی مساعیِ علم کی بنا پر شاہانِ عصر کے دربار میں بھی بے پناہ عزت و توقیر کے مستحق قرار پائے اور عوام میں بھی بدرجۂ غایت لائق تعظیم گردانے گئے۔ ان کے اسمائے گرامی تاریخ کی کتابوں اور تذکروں میں نمایاں الفاظ کے ساتھ مرقوم ہیں۔ رحمہم اللہ اجمعین۔

ملتان کی سرزمین حکومت و فرماں روائی کے اعتبار سے بھی خاص اہمیت کی حامل ہے اور علم و فضل کے لحاظ سے بھی انتہائی زرخیز ہے۔ یہ علاقہ کئی قسم کے انقلابات دیکھ چکا ہے اور بہت سی علمی و فقہی کاوشوں کا مرکز رہا ہے۔ اس کے حکمرانوں میں شیخ یوسف قریشی کا نام بھی تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے، یہ وہ بزرگ ہیں کہ جب

لنگاہ خاندان کے تسلط کے بعد ملتان سے نکل کر دہلی پہنچے تو سلطان بہلول لودھی نے نہایت اعزاز و احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور اپنی بیٹی ان کے بیٹے شیخ عبداللہ کے عقد میں دے دی تاکہ برصغیر کے اس بلند مرتبت خاندان سے اس کا رشتہ و تعلق پیدا ہو۔

حسین لنگاہ

ملتان پر لنگاہ خاندان کے حکمرانوں میں قطب الدین لنگاہ کا بیٹا شاہ حسین لنگاہ ایک صاحبِ عزم و ہمت بادشاہ تھا، قابلیت، مستعدی، نیکی اور خدا ترسی میں ممتاز تھا، علم و فضل کے زیور سے بھی آراستہ تھا۔ اس کے ایامِ حکومت میں علوم و فنون کی ترقی کی نئی راہیں کھلیں اور اس کے دربار میں علما و فضلا کی بے حد قدردانی ہوئی۔ اس کے وقت کا بڑا حصہ اصحابِ علم کی مجلسوں میں بسر ہوتا تھا۔ یہ صلح کل بادشاہ تھا۔ سلطان بہلول لودھی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان سکندر لودھی دہلی کے تخت پر متمکن ہوا تو حسین لنگاہ نے اس کو باپ کی تعزیت کا پیغام بھیجا اور ساتھ ہی تختِ حکومت پر فائز ہونے کی مبارکباد پیش کی۔ شاہی رسوم کے مطابق تحائف و ہدایا بھی ارسال کیے۔ سلطان سکندر لودھی نے بھی اس کے فرستادوں کی بے حد تکریم کی اور ان کو شاہانہ خلعت عطا کر کے اکرام و تعظیم کے ساتھ رخصت کیا۔

حسین لنگاہ نے بادشاہِ گجرات سلطان مظفر حلیم کے ساتھ بھی سلسلۂ مراسلت جاری کیا اور اس کی خدمت میں اپنے ایک عالمِ دین قاضی محمد احمد کو مختلف تحائف دے کر بھیجا۔ سلطان مظفر حلیم بھی والیِ ملتان کے ایلچی سے انتہائی احترام کے ساتھ پیش آیا۔ بہرحال ملتان کا یہ حکمران بہت سی خصوصیات کا مالک تھا۔ اس نے چونتیس ۳۴ سال، ایک روایت کے مطابق تیس سال حکومت کر کے ۹۰۴ھ یا ۹۰۸ھ کو وفات پائی۔

ان سلطنتوں کے علاوہ خاندانِ اور برہان پور کی علاقائی سلطنتیں بھی خدمتِ علوم

میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں، ان کے بھی بعض حکمران علما و فقہا سے قلبی تعلق رکھتے تھے اور ان کی تعظیم و تکریم میں پیش پیش رہتے تھے، لیکن ان کے واقعات کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ یہ سب کوائف کتبِ تاریخ میں وضاحت کے ساتھ مرقوم ہیں۔

سلطنتِ بنگال

سرزمینِ برصغیر کی علاقائی سلطنتوں میں بنگال کی سلطنت بھی ایک مضبوط اور طاقت ور با اختیار سلطنت تھی۔ اس کے بعض حکمرانوں کے عہد میں بہت سے علما و فقہائے علوم و فنون کی خدمت کی اور مختلف مقامات پہ درس و تدریس کا غلغلہ بلند کیا۔ اس نواح میں دسویں صدی ہجری کے جن حکمرانوں نے علوم کی ترویج کی اور علمائے کرام کو خدماتِ دینیہ انجام دینے کے مواقع فراہم کیے، ان میں سید شریف مکی جو سلطان علاء الدین کے نام سے تختِ بنگال پر متمکن ہوا، خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ اس بادشاہ نے ستائیس سال تک ارضِ بنگال پر حکومت کی اور ۹۲۷ھ کو وفات پائی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے سلطان نصیب شاہ نے باپ کی جگہ لی۔ یہ بھی باپ کے نقشِ قدم پہ چلا، لیکن زندگی کے آخری دور میں فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا سال وفات ۹۴۳ھ ہے۔[۴۷]

ایک وضاحت

ان علاقائی سلطنتوں کے بارے میں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ اگرچہ سیاسی اعتبار سے ان کے حکمران ایک دوسرے سے شدید اختلافات رکھتے تھے اور بسا اوقات نوبت جنگ و جدال تک بھی پہنچ جاتی تھی، لیکن علمائے دین،

---

[۴۷] سلطنت کشمیر، سلطنت مالوہ، دکن کی علاقائی سلطنتوں، سلطنت ملتان اور سلطنت بنگال کے بارے میں تفصیلات کے لیے دیکھیے تاریخ فرشتہ جلد ۲ کے متعلقہ ابواب۔

فقہائے کرام اور مشائخِ عظام کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ آزادانہ طور پر خدماتِ علمی انجام دیتے اور متحارب و متخالف ملکوں میں پوری آزادی سے سفر کرتے اور آمد و رفت رکھتے تھے۔ ہر ملک کے تشنگانِ علوم اور اصحابِ علم حضرات بلا کسی روک ٹوک کے ایک دوسرے سے ملتے اور استفادہ و استفاضہ کرتے تھے۔ یعنی حکمران آپس میں متضاد محاذوں پر کھڑے نظر آتے تھے، اور علمائے کرام کو ہر سلطنت کے حدود میں آنے جانے، قیام پذیر ہونے اور استفادہ و افادہ کے مواقع میسّر تھے۔

کچھ اس کتاب کے بارے میں

یہ فقہائے ہند کی تیسری جلد ہے جو خوانندگان محترم کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ اس میں بنگلہ دیش سمیت برِ صغیر پاک و ہند کے دسویں صدی ہجری کے دو سَو باوَن علما و فقہا کے حالات و سوانح بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات کے حالات بہت کم ملے ہیں اور بعض کے کچھ زیادہ۔ جو مواد میسّر آیا وہ صفحاتِ قرطاس پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ مواد کی فراہمی میں عاجز راقم السطور کو جو محنت کرنا پڑی اور حوالوں کی تلاش و جستجو میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اصحابِ علم اس ضمن کے تمام پہلوؤں سے بخوبی آگاہ ہیں۔

مقدمۂ کتاب میں برِ صغیر کے ان ملوک و سلاطین کا ذکر آپ کے مطالعہ میں آچکا، جو دسویں صدی ہجری میں اس خطۂ ارض میں دادِ حکمرانی دیتے رہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے دَور کے علما و فقہا سے ان کے مراسم و تعلقات کس نوعیت کے تھے اور ان کے دل میں ان کی کیا قدر و منزلت تھی۔ اس سلسلے میں اگرچہ بے حد اختصار سے کام لینے اور ہر قدم پر قلم کے لگام کو کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے، تاہم کہیں کہیں واقعات کے تقاضے سے معاملہ قدرے تفصیل کی حدوں تک بھی پہنچ

گیا ہے، جس پر ہم قارئینِ کرام سے معذرت خواہ ہیں۔

اس کتاب میں قابلِ احترام قارئین کو اگر کوئی اچھی بات نظر آئے تو اسے محض اللہ کا فضل قرار دیں اور اگر کسی مقام پر لغزش کا احساس ہو تو مہربانی فرما کر اس سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کی اصلاح کر دی جائے۔

اس کے بعد اگر اللہ نے توفیق عطا فرمائی تو آئندہ سال ان شاء اللہ اس سلسلے کی چوتھی جلد پیش کی جائے گی جو گیارھویں صدی ہجری کے علما و فقہا کے حالات پر مشتمل ہوگی۔

یہ عاجز چودھویں صدی ہجری تک کے فقہائے برصغیر کے حالات معرضِ تحریر میں لانے کا خواہاں ہے اور اس کی تکمیل کے لیے اللہ کے فضل اور قارئینِ محترم کی مخلصانہ دعاؤں کا متمنی ہے۔

رب یسر ولا تعسر وتمم بالخیر ۔۔۔ اللھم وفقنا لما تحب وترضیٰ۔

بندۂ عاجز
محمد اسحاق بھٹی

۲۲ جون ۱۹۷۶ء
۲۳ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دسویں صدی ہجری

الف

۱۔ سیّد ابراہیم بن احمد بغدادی

سیّد ابراہیم بن احمد بن حسن شریف حسنی جیلانی بغدادی، عالم کبیر اور شیخ وقت تھے۔ اپنے دادا حسن شریف سے اخذِ علم کیا، جن کا سلسلۂ سند و اجازہ شیخ عبدالقادر جیلانی تک منتہی ہوتا ہے۔ والدِ بزرگوار شیخ احمد بغدادی کی زندگی ہیں واردِ ہند ہوئے اور عرصہ تک برِصغیر کے مختلف بلاد و امصار کی سیاحت کرتے رہے۔ پھر کالپی میں سکونت اختیار کرلی۔ وہاں ان کی علمی شہرت پھیلی تو طلبا کی بہت بڑی تعداد ان کے گرد جمع ہوگئی اور درس وتدریس اور افادۂ عوام میں مصروف ہوگئے۔ طلبا ان کے طریقِ تدریس اور اسلوبِ تعلیم سے بدرجۂ غایت مطمئن اور متاثر تھے۔ زیادہ تر وقت اسی خدمت علم میں صَرف ہوتا تھا۔ تفسیر، حدیث اور تصوّف کی تدریس میں تو بہت دلچسپی لیتے تفسیر قرآن حکیم کے سلسلے میں عام طور پر معالم التنزیل اور جامع الاصول کا درس دیتے۔ کتبِ احادیث میں سے صحیح بخاری اور سنن أبوداؤد بڑے شوق اور توجہ سے پڑھاتے۔ تصوّف کی کتابوں میں سے عوالم الجنیدی اور ملہمات القادریہ کی طرف خصوصیت سے طلبا کو توجہ دلاتے، اور بے حد انہماک سے ان کے مختلف مقامات کی وضاحت کرتے اور مسائل تصوّف میں ڈوب کر اس کی زلفِ گرہ گیر کو سلجھاتے۔ علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے ان سے کسبِ علم اور اخذِ فیض کیا۔ شیخ نظام الدین بن سیف الدین علوی کاکوروی کا اسمِ گرامی بھی ان کے تلامذہ کی وسیع فہرست میں شامل ہے[1]

---

[1] نزہتہ الخواطر، ج ۴، ص ۲، بحوالہ کشف المتواری۔

سیّد ابراہیم بن احمد بغدادی، دسویں صدی ہجری کے برِّ صغیر پاک و ہند کے وہ علمائے دین اور فقیہ ہیں، جو تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوّف وغیرہ علوم مروّجہ پر عبور رکھتے اور باقاعدہ طلبائے علم کو ان کا درس دیتے تھے۔ مگر ان کی کسی تصنیف کا ہمیں علم نہیں ہوسکا۔

۲- شیخ ابراہیم بن جمال الدین سندھی

شیخ مفتی ابراہیم بن جمال الدین سندھی، علم و فضل میں اپنے دور کے ممتاز و منفرد بزرگ تھے۔ ان کا شمار علمائے باعمل اور اصحابِ تقویٰ حضرات میں ہوتا تھا۔ علمِ فقہ میں عبور و مہارت کا یہ عالم تھا کہ ان کے عصر اور علاقے کا کوئی شخص ان کا حریف نہ تھا۔ مختلف مسائل میں لوگ ان ہی سے استفسار کرتے، اور قضاتِ سندھ ان ہی کے بیان کردہ مسائل کو معمول بہا ٹھہراتے تھے۔ اس عالمِ دین نے تمام دنیوی آسائشوں اور راحتوں سے اپنے آپ کو بے نیاز کرلیا تھا۔ لوگوں سے منقطع ہو کر گھر کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ جاتے اور علم و عمل سے قلب و روح کی غذا مہیا کرتے۔ نہ کبھی مال و دولت جمع کرنے کی کوشش کی اور نہ فقر و فاقہ اور تنگ دستی کے مسلسل اور متواتر حملوں سے بے بس ہو کر کبھی اضطراب و پریشانی کا اظہار کیا۔ ہمیشہ علم و مطالعہ کو اصل سرمایہ قرار دیا اور اسی پر خوش رہے۔ ایثار پیشہ اور قانع بزرگ تھے۔ اٹھانوے (۹۸) سال عمر پاکر اس دار الفنا سے دار البقا کو روانہ ہوئے۔[۲]

افسوس ہے، ہم ان کی کسی تصنیف کا سراغ لگانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

۳- مولانا ابراہیم بن فتح اللہ ملتانی

مولانا ابراہیم بن فتح اللہ ملتانی، ابراہیم جامع کے نام سے مشہور تھے۔ فضلائے عصر اور علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ ملتان میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے والدِ بزرگ وار شیخ فتح اللہ ملتانی سے علم حاصل کیا اور طویل عرصہ تک ان سے منسلک و

---

[۲] مآثر رحیمی ج ۲ ص ۳۸۰۔ تاریخ معصومی ص ۲۳۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۔

ملازم رہے۔ پھر درس و تدریس میں مصروف ہوگئے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں ان کے بیٹے سعد اللہ بھی شامل ہیں۔

مولانا ابراہیم جامع کے علم و فضل اور مرتبۂ فقہی کو سمجھنے کے لیے فتح ملتان اور اس پر والیِ سندھ مرزا شاہ حسین ارغون کے حملے کا ذکر ضروری ہے۔ مختصر الفاظ میں اس کی تفصیل یہ ہے کہ ملتان پر جب خاندانِ لنکاہ دادِ حکمرانی دیتا تھا تو اس کے ایک حکمران کا نام محمود شاہ لنکاہ تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس خاندان کے اکثر افراد اور لنگر خان نے، جو ان میں خاصے اثر و رسوخ کا مالک تھا، محمود شاہ لنکاہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور وہ والی سندھ مرزا شاہ حسین ارغون سے جا ملے، جو ان کا حریف تھا۔ ان لوگوں نے حسین شاہ ارغون کی مدد سے ملتان کے قصبات و دیہات پر حملہ کر کے ان پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس سے علاقہ ملتان کے معززین اور سرکردہ لوگوں کو سخت تشویش لاحق ہوئی، وہ گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں شہر ملتان کی طرف روانہ ہوئے اور محمود شاہ کے بیٹے کو، جو طفلِ صغیر تھا، حسین شاہ لنکاہ کا خطاب دے کر ملتان کے تختِ حکومت پر بٹھا دیا اور اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ حسین شاہ لنکاہ برائے نام بادشاہ تھا، درحقیقت کاروبارِ حکومت محمود شاہ لنکاہ کے داماد شیخ شجاع الملک بخاری کے ہاتھ میں تھا۔ وہی امورِ سلطنت پر قابض تھا اور ملتان کے حالات کو بگاڑنے کا باعث درحقیقت وہی تھا۔ مرزا شاہ حسین ارغون نے موقع کو غنیمت جانا، وہ فوج کی ایک خاص تعداد کے ساتھ ملتان کی طرف بڑھا اور بغیر کسی مزاحمت کے شہر میں داخل ہو کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ انتہائی سخت تھا اور اس پر ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ باشندگانِ شہر گھبرا اٹھے اور شیخ شجاع الملک بخاری کے پاس آئے، اس سے کہا ہمارے پاس جنگی سامان بھی ہے، گھوڑے بھی ہیں اور فوج بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہے، آپ ہمیں منظم کریں اور فوج کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے دشمن کا مقابلہ کرنے کی اجازت دیں، ممکن ہے، اللہ تعالیٰ مدد کرے اور ہمیں فتح حاصل ہو۔ انھوں

نے یہ بھی کہا کہ قلعے کی حفاظت بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے، جہاں تک ہو سکے ہمیں مقابلہ کرنا چاہیے۔ لیکن شجاع الملک نے دربار میں تو ان کی کسی بات کا جواب نہ دیا، البتہ علیحدگی میں چند سرداروں اور برگزیدہ امیروں کو بلا کر کہا، ابھی شاہ حسین لنگاہ کی حکومت مضبوط نہیں ہوئی اور اس میں قرار و استحکام پیدا نہیں ہوا۔ اگر ہم ان حالات میں جنگ کی غرض سے شہر سے نکلیں گے اور حملہ آور فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے میدانِ کارزار میں اتریں گے تو خطرہ ہے کہ ہمارے آدمی کثیر تعداد میں مارے جائیں گے اور لوگوں کی اکثریت مرزا شاہ حسین ارغون سے جا ملے گی، اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم چپ چاپ شہر میں بیٹھے رہیں اور حالات کا انتظار کریں۔ مولانا ابراہیم جامع کے لڑکے جو مولانا سعد اللہ لاہوری کے نام سے موسوم تھے اور افاضلِ روزگار میں سے تھے، فرماتے ہیں کہ اہلِ ملتان کے لیے وہ انتہائی تکلیف اور اضطراب کا وقت تھا اور خود میں بھی ان دنوں ملتان کے قلعے میں محصور تھا۔

مولانا سعد اللہ لاہوری سے منقول ہے کہ مرزا شاہ حسین ارغون کی فوجیں ملتان میں داخل ہو چکی تھیں اور انھوں نے چاروں طرف سے قلعے کو اس طرح گھیر رکھا تھا کہ اس کے تمام دروازے بند تھے، نہ کوئی شخص اندر سے باہر جا سکتا تھا، نہ باہر سے اندر آ سکتا تھا اور نہ کسی کو کھانے پینے اور استعمال کی کوئی چیز پہنچ سکتی تھی۔ محاصرہ نے طول پکڑا اور کئی مہینے جاری رہا، جس کی وجہ سے معاملہ فاقہ کشی تک پہنچ گیا اور لوگوں کی یہ حالت ہو گئی کہ بلی اور کتا بھی ہاتھ لگتا تو کھا جاتے۔ پھر ایک تکلیف دہ صورت حال یہ پیدا ہو گئی کہ شجاع الملک نے جن تین ہزار افراد کو قلعہ کی حراست و حفاظت پر متعین کیا تھا، انھوں نے شہر میں لوٹ کھسوٹ شروع کر دی، جو شخص قلعے سے باہر نکلتا، اس کو بھی تہ تیغ کر دیا جاتا۔ اس اضطراب اور پریشانی کے عالم میں محصورین قلعے کے اوپر سے کود کود کر خندق میں گرنے لگے۔ اس طرح ایک سال کئی مہینے تک محاصرہ جاری رہا اور ۹۳۲ھ کی ایک شب کو مرزا شاہ حسین ارغون کی فوج قلعے میں داخل ہو گئی اور قلعہ فتح ہو گیا۔ فتح کے بعد انھوں نے بے شمار لوگوں کو

قتل اور بہت سوں کو گرفتار کر لیا۔

مولانا سعد اللہ لاہوری بیان کرتے ہیں کہ جب شاہ حسین ارغون کی فوج نے لوگوں کے گھروں میں داخل ہو کر ان کے مال و اسباب لوٹنا شروع کیے تو چند فوجی میرے مکان میں گھس آئے۔ اس وقت میرے والد مولانا ابراہیم جامع گھر میں بیٹھے تھے، وہ پورے پینسٹھ[۶۵] سال اہلِ ملتان اور اس کے گرد و نواح کو فیض یاب کرتے اور علما و طلبا کو مختلف علوم و فنون کی تعلیم دیتے رہے تھے، بدرجۂ غایت نیک اور پرہیزگار عالمِ دین تھے۔ ارغونی فوج نے ان کی بہت اہانت کی، ان کا مال و متاع لوٹ لیا اور گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ بعد ازاں ان کے لڑکے مولانا سعد اللہ کو بھی گرفتار کر کے وزیر کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

مولانا سعد اللہ کہتے ہیں، اس وقت وزیر اپنے مکان کے صحن میں لکڑی کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کے حکم سے میرے پاؤں میں لوہے کی زنجیر ڈالی گئی، جس کا ایک سرا مضبوطی کے ساتھ، اس کے تخت کے پائے سے باندھ دیا گیا تھا۔ مجھے اپنے والد مولانا ابراہیم جامع کے بارے میں کچھ علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ البتہ اتنا معلوم تھا کہ وہ گرفتار ہیں اور ارغونی فوج کے قبضے میں ہیں۔ میں انھیں یاد کر کے زار و قطار رو رہا تھا اور وفورِ گریہ سے مسلسل میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ کچھ دیر بعد وزیر نے قلم دان طلب کیا اور قلم درست کر کے کچھ لکھنا چاہا۔ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ وضو کر کے لکھے تو بہتر ہے۔ قدرتِ خداوندی ملاحظہ ہو کہ وہ اٹھا اور وضو کے لیے غسل خانے میں گیا۔ اس وقت وہاں کوئی شخص موجود نہ تھا۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا، اپنی جگہ سے اٹھا اور لکھنے کے لیے جو کاغذ اس نے تیار کیا تھا، اس پر قصیدۂ بردہ کا یہ شعر لکھ دیا:

فما لعینیک ان قلت اکففا ھمتا　　وما بقلبک ان قلت استفق یھم

یہ لکھ کر میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا، لیکن آنسو بدستور میری آنکھوں سے جاری تھے۔

اب وزیر وضو کر کے آیا، تخت پر بیٹھا، کاغذ پر نگاہ ڈالی تو اس پر یہ شعر مرقوم تھا۔ اس نے مکان کے چاروں طرف دیکھا، میرے سوا کوئی اور اس کو نظر نہ آیا تو مجھ

سے مخاطب ہو کر پوچھا۔" یہ شعر تم نے لکھا ہے"؟ میں نے جواب دیا" جی ہاں میں نے ہی لکھا ہے"۔ پھر پوچھا" تم کون ہو"؟ میں نے اپنی اور اپنے باپ کی سرگزشت بیان کی۔ اس نے میرے باپ مولانا ابراہیم جامع کا نام سنا تو فوراً تخت سے اٹھا، اپنے ہاتھ سے میرے پاؤں کی زنجیر کھولی، اپنا پیراہن مجھے پہنایا اور اسی آن سواری پر بٹھا کر مجھے مرزا شاہ حسین کے دیوان خانے میں لے گیا اور اس کے سامنے پیش کر کے میرے باپ کی علمی حیثیت بیان کی۔ شاہ حسین ارغون نے فوراً میرے باپ کو بلایا۔ اس وقت اتفاق سے حسین کے دربار میں مختلف علما موجود تھے اور ہدایہ کے ایک فقہی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ میرے باپ سے بھی اس بحث میں حصہ لینے کو کہا گیا۔ وہ فقہ کے بہت بڑے عالم تھے، انھوں نے زیر بحث مسئلہ سے متعلق اس انداز سے گفتگو کی، اور باوجود ذہنی پریشانی اور جسمانی تکلیف کے اس کو اس اسلوب سے بیان کیا کہ حضارِ مجلس بہت محظوظ ہوئے اور بادشاہ بھی انتہائی متاثر ہوا۔ اس نے اسی وقت مجھے اور میرے والد کو ایک ایک خلعتِ خاص مرحمت فرمایا اور خازن کو حکم دیا کہ مولانا ابراہیم کا لوٹا ہوا اثاث البیت واپس کیا جائے اور ان کے مکان پر پہنچایا جائے۔ اگر وہ مال موجود نہ ہو تو اسی وقت سرکاری خزانے سے اس کی قیمت ادا کی جائے۔ پھر بادشاہ نے ان سے اپنے ساتھ ٹھٹھہ تشریف لے جانے کی درخواست کی۔ مگر انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ سفینۂ عمر کنارے آلگا ہے سفرِ آخرت درپیش ہے اور چند روز کی زندگی باقی ہے۔ اب میں اپنے اس قدیم شہر ملتان کی سکونت ترک کر کے آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔

اس واقعہ کے دو ماہ بعد مولانا ابراہیم جامع، اللہ کے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔

یہ ۹۳۲ھ کا واقعہ ہے[۵۳]

دسویں صدی ہجری کے برِصغیر پاک و ہند کے یہ عالمِ دین اگرچہ علمِ فقہ اور دیگر علوم

---

[۵۳] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۵۳۰ تا ۵۳۲۔

پہ گہری نظر رکھتے تھے اور جیسا کہ گزشتہ سطور میں واضح ہوچکا ہے، ان کا حلقۂ تلمذ بھی خاصا وسیع تھا اور ان کی علمی شہرت بھی دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی، مگر ہم ان کی کسی فقہی تصنیف کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ معلوم ہوتا ہے، یہ مسائلِ فقہ اور کتبِ فقہ کے ماہر تو تھے لیکن غالب گمان یہ ہے کہ اس موضوع سے متعلق کسی کتاب کے مصنف نہ تھے۔

۴۔ قاضی ابراہیم بن محمد کالپوی

قاضی ابراہیم بن محمد بنواری کالپوی، عرصہ تک نواحِ کالپی کے ایک قصبہ، بنواری میں اقامت گزین رہے۔ بہت سے اوصاف کے حامل اور متعدد خوبیوں کے مالک تھے۔ ہدایہ شیخ عبدالملک کالپوی سے پڑھا، جن کی کالپی میں مسندِ تدریس آراستہ تھی۔ قاضی ابراہیم کالپوی عالم و فقیہ بھی تھے اور صاحبِ ورع و تقویٰ بھی یعنی فقاہت اور تقویٰ دونوں کے جامع تھے۔ عمر بھر درس دینے اور طلبائے علم کو پڑھانے میں مشغول رہے۔ عالمِ دین، خوش نویس، فصیح البیان اور محبوب القلوب تھے۔ فقہی مسائل کو موضوعِ بحث ٹھہراتے تو سب سے سبقت لے جاتے۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔[۴۲]

دسویں صدی ہجری کے اسلامی ہند کے یہ وہ فقیہ اور عالم ہیں جو فقہی مسائل پہ عبور رکھتے تھے اور اس کی عقدہ کشائیوں میں ماہر بھی تھے مگر جہاں تک ہمارے معلومات کا تعلق ہے، کسی فقہی کتاب کے مصنف نہ تھے۔ ان کے علم و فقاہت کا دائرہ تدریس و افتا اور زبانی مباحث تک محدود تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت بڑی خدمتِ فقہ ہے۔ فقاہت میں عبور کا مطلب تصنیف ہی نہیں، تدریس بھی ہے اور یہ زیادہ مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ مسائل و معلومات میں جو درک، گہرائی اور وسعت، تدریس

---

[۴۲] اذکارِ ابرار ص ۴۴۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۴۔

سے پیدا ہوتی اور قلب و ذہن کے عمیق خانوں میں جاگزین ہوتی ہے، وہ تصنیف سے نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا کہنا چاہیے بسا اوقات تدریس کا پلڑا تصنیف پر بھاری ہوتا ہے۔

۵۔ شیخ ابراہیم بن معین الدین ایرجی

شیخ ابراہیم بن معین الدین بن عبدالقادر حسنی ایرجی دہلوی، علم و فضل کے مرتبۂ بلند پر فائز تھے اور اپنے زمانے کے شہرۂ آفاق علما میں سے تھے۔ بہت بڑے فقیہ اور مروّجہ علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔ تصوّف و سلوک سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ شیخ علیم الدین محدّث سے اخذِ علم اور شیخ بہاء الدین بن عطاء اللہ جنیدی قادری شطاری سے کسبِ طریقت کیا۔ شیخ بہاء الدین نے اذکار و اشغال سے متعلق ان کے لیے ایک رسالہ بھی تصنیف کیا تھا۔ سلطان سکندر لودھی کے عہدِ حکومت کے آخری دنوں یعنی ۹۲۰ھ میں دہلی تشریف لائے اور ان کے کمالاتِ علمی سے متاثر ہو کر شیخ عبداللہ دہلوی، میاں لادن، مولانا عبدالقادر صابون گر اور دیگر اصحابِ علم و طریقت ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے۔ سب مشاغلِ دنیوی سے منقطع ہو کر درس و افادہ میں مشغول ہو گئے تھے۔ کتابیں جمع کرنے اور پڑھنے کے انتہائی شائق تھے۔ تمام علوم و فنون کی کتابیں ان کے پاس موجود تھیں۔ اس دور میں دہلی اور اس کے گرد و نواح میں فراوانیِ علم اور وسعتِ مطالعہ میں کوئی شخص ان کی ٹکّر کا نہ تھا۔ مگر اس وسیع النظر اور کثیر المطالعہ عالم کی لوگوں نے قدر نہ کی اور ان کے صحیح مرتبہ کو نہ پہچانا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں محصور کر لیا تھا اور تصحیحِ کتب کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا تھا۔ وہ اس نہج سے کتابوں کی تصحیح کرتے اور ان کے نکات و غوامض کو حل فرماتے کہ قاری سرسری نظر ہی سے، دقیق سے دقیق مسائل کو سمجھنے اور مشکل سے مشکل مقامات کو احاطۂ فہم میں لانے میں کامیاب ہو جاتا۔ شیخ ابراہیم، سماع کے مخالف تھے۔ وہ اس قسم کی مجلسوں میں شامل نہ ہوتے جن میں سماع کا اہتمام ہوتا تھا۔

اس جیّد عالمِ دین کا حلقۂ تلامذہ بڑا وسیع تھا، جو حضرات ان سے علم حاصل

کرنے کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے، ان میں شیخ رکن الدین بن عبد القدوس گنگوہی شیخ عبد العزیز بن حسن دہلوی اور شیخ نظام الدین بن سیف الدین کاکوروی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

شیخ ابراہیم نے ۹۵۳ ہجری کو سلیم شاہ سوری کے ایامِ حکومت میں دہلی میں وفات پائی اور امیر خسرو کی قبر کے قریب، شیخ نظام الدین اولیا کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

ان کو ایرجی اس لیے کہتے ہیں کہ اصلاً ایرج کے باشندے تھے جو علاقہ مالوہ میں قصبہ تھا۔[۵]

۶- حاجی ابراہیم سرہندی

حاجی ابراہیم سرہندی، ہندوستان کے مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے عہد کے فضلا اور کبار فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ اس زمانے میں عالم دین کو مُلّا یا شیخ یا مولانا کہا جاتا تھا۔ مگر ابراہیم سرہندی کو اس قسم کے الفاظ سے مخاطب نہیں کیا جاتا تھا بلکہ حاجی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ انھوں نے مفتی ابوالفتح بن عبدالغفور تھانیسری اور دیگر علمائے کرام سے تحصیل کی۔ پھر حرمین شریفین گئے۔ حج و زیارت کے شرف سے مشرف ہوئے اور شیخ شہاب الدین احمد ابن حجر ہیثمی مکّی سے حدیث پڑھی۔ بعد ازاں واپس ہندوستان آئے، ملوک و امرا سے تقرب حاصل کیا اور جلال الدین اکبر کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ سنسکرت کے بھی عالم تھے اور اکبر کے حکم سے "انھربن وید" کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ بلا شبہ بہت بڑے عالم، ذہین اور زود فہم تھے۔ مگر سخت جھگڑالو، زبان دراز، مجادلہ و مباحثہ کے شائق، مناظرہ کے لڈا اور لوگوں کو مغالطہ میں مبتلا کرنے میں ماہر تھے۔ علما پر سخت تنقید کرتے اور کسی کو خاطر میں

---

۵ اخبار الاخیار، ص ۲۵۰، ۲۵۱۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۷، ۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۵، ۴۔ سیر المتاخرین ج ۱ ص ۲۷۹۔

نہ لاتے۔ ابوالفتح گیلانی، فتح اللہ شیرازی اور ابوالفضل بن مُلّا مبارک کے سخت مخالف تھے اوران پر زبانِ طعن دراز کرنے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرتے تھے۔ نقد و بحث کے دَوران میں آدابِ شاہی کو بھی خاطر میں نہ لاتے اور بادشاہ کے دربار میں علما و فضلا کی اہانت کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کرتے۔ ایسے مواقع پر اپنے علمی وقار اور شخصی مرتبہ کو بالکل نظر انداز کر دیتے تھے۔

مُلّا عبدالقادر بدایونی، اکبر کے مقربین اور درباری علما میں سے تھے، اور حاجی ابراہیم سرہندی کی عادات و اطوار سے خوب آگاہ تھے۔ انھوں نے اپنی معروف تصنیف منتخب التواریخ میں متعدد مقامات پر ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک جگہ اکبری دربار کے علما کا تذکرہ کرتے ہوئے بطور لطیفے کے لکھتے ہیں۔

"ان ہی دنوں بادشاہ کی محفل میں ایک بڑا دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ اکبر کی مجلس میں حاجی ابراہیم سرہندی بھی موجود تھا، جو ہمیشہ علما سے الجھتا رہتا اور اپنی بڑائی جتانے کے لیے مباحثے کرتا رہتا تھا اور بحث میں طرح طرح کے مغالطے پیدا کر کے مخالف کو پریشان کر دیتا تھا۔ جس وقت تاشکندی نے اپنی تفسیر پیش کی[۵۶] تو حاجی نے مرزا مفلس کو چھیڑنے کے لیے پوچھا "موسیٰ کیا صیغہ ہے اور کس مادہ سے مشتق ہے"۔ مرزا مفلس علومِ عقلیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس کا جواب جیسا دینا چاہیے تھا نہ دے سکے اور عوام نے یقین کر لیا کہ حاجی ابراہیم بلحاظ علم کے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بڑی ناانصافی کی بات تھی۔ کچھ لوگوں نے قاضی زادہ لشکر سے، جسے بادشاہ نے متھرا کا قاضی مقرر کیا تھا، کہا "تم بحث میں کیوں حصہ نہیں لیتے ہو" اس نے بےساختہ جواب دیا۔ "اگر حاجی ابراہیم مجھ سے "عیسیٰ" کا صیغہ پوچھ بیٹھے تو اس وقت بھلا میں کیا جواب

---

۵۶ یہ حافظ تاشقندی تھے جو عربی کے مشہور عالم تھے۔ انھوں نے سورۂ محمدؐ کی ایک تفسیر لکھی تھی، جس سے ان کے علمی مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ۹۷۷ھ میں تاشقند میں فوت ہوئے (منتخب التواریخ ص ۲۶۴)

دے سکوں گا۔"؟ بلا شبہ اس نے یہ بڑی عمدہ بات کہی تھی۔[۵۷]

ملا عبدالقادر بدایونی اس دور کو بہت یاد کرتے ہیں اور انھیں یادِ رفتگاں ستاتی ہے تو افسوس کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں :

و مدتِ دہ سال ازاں تاریخ الی الیوم گزشتہ و آں جماعتِ مباحثین و مناظرین چہ محقق و چہ مقلد کہ از صد نفر متجاوز بودند، یک کس نمی بیند و ہمہ روی در نقاب کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ماندند۔

جرت الریاح علی مکان دیارھم فکانھم کانوا علی میعاد

حالانکہ بمقتضائے النعمۃ اذا فقدت عرفت، آں صحبتاں را یاد میکند خونابہ حسرت از دیدہ غم دیدہ فرومی بارد و می زارد و می نالد و می گوید کہ دریں حسرت آباد کاشکے روزی چند بگرہم اقامت می نمودند کہ بہر حال مغتنم بودند، و خطاب منحصر با ایشاں بود:

پائی در زنجیر پیش دوستاں بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

ایں پیشہ مضرور را و ایں نقشہ مصدور را غیر از داغ حرماں و نالہ پنہاں چہ درمان غفر اللہ الماضین و رحم الباقین۔

افسوس کہ یاراں ہمہ از دست شدند در پائی اجل یگاں یگاں پست شدند

بودند تنک شراب در مجلس عمر یک لحظہ ز ما بیشترک مست شدند[۵۸]

یعنی اس تاریخ سے اب تک کہ دس سال کی مدت گزر چکی ہے، ان مباحثہ کرنے والوں کی جماعت میں سے جو سو سے زیادہ افراد پر مشتمل تھی، محقق و مقلد کوئی بھی نظر نہیں آتا ہے۔ سب کے چہروں پر موت اپنا سیاہ نقاب ڈال چکی ہے۔ بے شک کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔

زخیل دردکشاں غیر ما نماند بیار بادہ کہ ما ہم غنیمتیم بسے

وہ محفلیں اجڑ گئیں اور ایک میں سوگوار رہ گیا ہوں کہ جب بھی ان کی یاد آتی ہے، میری غم زدہ آنکھیں حسرت کے ساتھ خون کے آنسو روتی ہیں اور دل نالہ و فریاد کرنے لگتا ہے۔

---

۵۷ منتخب التواریخ، ص ۱۹۶۔ ۵۸ ایضاً

کاش وہ لوگ کچھ دن اور جی جاتے کہ بہر حال اس قحط الرجال میں ان کی ہستیاں بڑی غنیمت تھیں۔ اب کس سے بات کریں، تبادلِ خیالات کی لذت تو بس ان کے ساتھ ہی چلی گئی۔ اب مجھ ناکارہ و افتادہ کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں رہا کہ ان کی جدائی کے داغ سے جلتا رہوں اور چپکے چپکے آہ و فریاد کرتا رہوں:

افسوس کہ یاران ہمہ از دست شدند ۔۔۔ در پائے اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنک شراب در مجلسِ عمر ۔۔۔ یک لحظہ ز ما پیشترک مست شدند

اس سے چند صفحات آگے چل کر صاحبِ زمان کے متعلق پیشین گوئی کے سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

حاجی ابراہیم سرہندی کا تقرر گجرات کی صدارت پر کیا گیا تھا۔ اس نے ائمہ سے رشوت لے کر کافی روپیہ اور مال و اسباب جمع کر لیا۔ اگر وہ بے چارے رشوت دینے سے انکار کرتے تھے تو وہ ان کی مددِ معاش روک دیتا تھا۔ اس کی حرکتیں بادشاہ کے علم میں بھی آئیں اور یہ بھی پتا چلا کہ وہ دکن جانے کا ارادہ کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ اسے بغاوت کے الزام میں معزول کر دیا گیا اور واپس بلا کر حکیم عین الملک کے سپرد کر دیا گیا۔ تاہم شبانہ مجلسوں میں اس کو باقاعدہ بلایا جاتا تھا۔ اس نے اس زمانے میں بزرگان دین کے متعلق جھوٹی سچی باتیں لکھ کر ایک رسالہ بادشاہ کی خدمت میں خوشامد کے طور پر پیش کیا، لیکن اس کا پول بہت جلد کھل گیا۔ اصل میں اس نے ایک پرانی کرم خوردہ کتاب میں غیر معروف خط میں ابنِ عربی سے منسوب کر کے ایک جعلی عبارت لکھی تھی کہ صاحبِ زمان بہت سی عورتوں سے نکاح کرے گا، داڑھی منڈا ہوگا اور ایسی ہی چند علامتیں جو اکبر میں پائی جاتی تھیں درج کر دی تھیں۔ یہ رسالہ اکبر کو بہت پسند آیا اور مہربان ہو کر اسے مقربوں میں شامل کر لیا۔

حاجی ابراہیم کی مذکورہ تحریر کے مطابق میاں امان پانی پتی کے بھتیجے ملا ابو سعید کی کتابوں میں سے ایک پرانا رسالہ فراہم کیا گیا، جس میں ایک موضوع حدیث درج تھی کہ ایک صحابی کا لڑکا داڑھی منڈا کر جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا، تو

آپ نے فرمایا، اہلِ جنت کی یہی وضع ہوگی۔ یہ "حدیث"، بھی اکبر کو بڑے اہتمام سے دکھائی گئی۔

حاجی ابراہیم سرہندی، شاہ فتح اللہ، شیخ ابو الفضل اور حکیم ابوالفتح کے ساتھ بڑی بے باکی سے مباحثے کرتا تھا اور ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیتا تھا۔ اسی لیے اکبر نے اس کو رنتھنبور کے قلعے میں بھیج دیا۔ وہ اسی جگہ فوت ہوا، اس کی لاش قلعے کی فصیل سے نیچے پھینک دی گئی۔ لاش لمبے کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی، اس لیے یہ مشہور ہوا کہ اس نے خود اپنے آپ کو قلعے سے نیچے گرا دیا۔ یہ حادثہ ۹۹۴ھ میں پیش آیا۔[۹]

اس سے چند صفحات آگے چل کر لکھا ہے:

حاجی ابراہیم سرہندی کو پہلے ہی معزول کر دیا گیا تھا۔ اس کے متعلق بادشاہ کو یہ رپورٹ ملی تھی کہ اس نے کافی مال متاع جمع کر لیا ہے اور اس کے حرم میں بہت سی عورتیں موجود ہیں اور وہ دکن کی طرف فرار ہو جانے کی فکر میں ہے۔ اسے گرفتار کر کے اسی سال بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اکبر نے کچھ عرصہ تک اسے عین الملک کی نگرانی میں رکھا اور بعد میں قلعہ رنتھنبور بھیج کر قتل کرا دیا گیا۔[۱۰]

مولانا محمد حسین آزاد نے بھی دربارِ اکبری میں حاجی ابراہیم سرہندی کا ذکر کیا ہے اور اپنے خاص اسلوبِ بیان اور اندازِ تحریر میں ان کے مختصر حالات بیان کیے ہیں۔ وہ دربارِ اکبری سے متعلق علما کے کردار کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"لطیفہ: حاجی ابراہیم سرہندی، مباحثوں میں بڑا جھگڑالو اور مغالطوں میں پھیلاوے کا تماشا تھے۔ ایک دن چار ایوان کے جلسے میں مرزا مفلس سے کہا کہ موسیٰ کیا صیغہ ہے اور اس کا ماخذ اشتقاق کیا؟ مرزا علومِ عقلی کے سرمائے میں بہت مال دار تھے مگر اس جواب میں مفلس ہی نکلے۔ شہر میں چرچا ہو گیا کہ حاجی نے مرزا کو لاجواب کر دیا، اور حاجی بڑے ہی فاضل ہیں۔ جاننے والے جانتے تھے کہ یہ بھی تاثیرِ زمانہ کا ایک شعبدہ ہے۔ یہ رباعی

---

[۹] منتخب التواریخ ص ۲۲۹

[۱۰] ایضاً ص ۲۴۲

مُلا صاحب نے فرمائی :

از بہر فساد و جنگ بعضے مردم ۔ کردند بکوئے گمرہی خود را گم
در مدرسہ ہر علم کہ آموختہ اند ۔ فِی الْقَبْرِ یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ[۱۱]

جلال الدین اکبر علما کی بحثوں سے بہت دلچسپی لیتا تھا، اس قسم کی مجلسیں رات کو بھی جاری رہتی تھیں۔ دربارِ اکبری کے اہلِ علم ان میں باقاعدہ شامل ہوتے تھے۔ اس ضمن میں محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :

لطیفہ : تحصیل فوائد پر نظر کر کے بادشاہ خوش اعتقاد دل سے چاہتا تھا کہ یہ جلسے گرم رہیں۔ چنانچہ ان ہی دنوں میں قاضی زادۂ لشکر سے کہا کہ تم رات کو بحث میں نہیں آتے۔؟ عرض کی، حضور، آؤں تو سہی لیکن حاجی وہاں مجھ سے پوچھیں، عیسےٰ کیا صیغہ ہے تو کیا جواب دوں؟ لطیفہ اس کا بہت پسند آیا۔[۱۲]

منتخب التواریخ کے مصنف، ملا عبدالقادر بدایونی دربارِ اکبری میں شامل ہوئے تو حاجی ابراہیم سرہندی نے ان سے بھی اپنی عادت کے مطابق پنجہ آزمائی شروع کر دی ملا صاحب کو اکبر کی حمایت حاصل تھی۔ آزاد لکھتے ہیں :

"ملا صاحب کو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ حاجی ابراہیم کسی کو سانس نہیں لینے دیتا، یہ اس کا کلّہ توڑے گا۔ چنانچہ علم کا زور، طبیعت بے باک، جوانی کی اُمنگ، بادشاہ خود مدد کو پشت پر، اور بڈھوں کا اقبال بڈھا ہو چکا تھا۔ یہ حاجی سے بڑھ کر شیخ صدر کو ٹکریں مارنے لگے۔[۱۳]"

حاجی ابراہیم سرہندی کی عادات اور ان کے کردار اور انجام کے بارے میں مولانا آزاد رقم طراز ہیں :

حاجی ابراہیم، سرہند کے رہنے والے تھے، مگر بڑے جھگڑالو تھے، مباحثوں

---

[۱۱] دربارِ اکبری، ص ۳۸، ۳۹ [۱۲] ایضاً ص ۳۹ ۔
[۱۳] ایضاً ص ۳۹، ۴۰ ۔

میں حریف کا منہ بند کر دیتے تھے اور مغالطے کے بادشاہ تھے۔ ابھی یہ بات، ابھی وہ بات، ابھی یہاں، ابھی وہاں۔ اکبر نے چاہا کہ دستی مُہر پہ "اللہ اکبر" کھدوائے، حاجی صاحب مخالفت پہ کھڑے ہو گئے، اور یہ رو کنا کچھ دین داری کی رعایت سے نہ تھا، فقط تقریر کی زور آزمائی تھی۔ پھر بادشاہ کی رغبت دیکھ کر آپ ہی سرخ و زعفرانی لباس کے جواز کا بھی فتویٰ دے دیا۔ میر سید محمد میر عدل نے عصا تو اٹھایا تھا مگر بچ گئے۔ لفظ کم بخت، ملعون، پہ خیر گذر گئی، بھاگ گئے، ورنہ وہ مار بیٹھتے۔

آخر ۹۹۵ھ میں احمد آباد گجرات کے صدر ہو کر گئے۔ چند روز کے بعد دربار میں خبر پہنچی کہ خوب رشوتیں کھائی ہیں، مشائخ اور ائمہ مساجد سے ہزاروں روپیہ لیا ہے جس نے نہیں دیا اس کی مدد معاش سے وضع کر لیا ہے، اور جَور وؤں سے گھر بھر لیا ہے۔ انھیں بھی خبر لگ گئی، چاہتے تھے کہ دکن کو بھاگ جائیں، دربار میں خبر جا پہنچی، بادشاہی پیادوں نے جا لیا، پکڑے آئے، حکیم عین الملک کے حوالے ہوئے، پھر بھی رات کے دربار میں بلائے جاتے تھے۔ مگر اب یہاں دربار کا عالم اور ہو گیا تھا۔ انھوں نے رنگ دیکھ کر ایک دقیانوسی کِرم خوردہ رسالہ نکالا، شیخ محی الدین ابن العربی کی عبارت کے حوالے سے اس میں ایک عبارت لکھی یا لکھوا دی کہ حضرت امام مہدی کی بہت سی بیبیاں ہوں گی اور وہ داڑھی مُنڈے ہوں گے اور کئی اَتے پتے اور بھی ایسے لکھے کہ اکبر میں موجود تھے۔ اس سے یہ ثابت کرنے تھے کہ اکبر امام مہدی ہیں۔ یہ نسخہ نہ چلا، بادشاہ نے رنتھنبور کے قلعہ میں بھیج کر قید کر دیا۔ مُلا صاحب[۱۴] اکبر کی شکایتوں کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ وہاں اوجِ رفعت نے خواری کے گڑھے میں گرا دیا اور مطلب اپنا نکالا (یعنی مار ڈالا)۔

ابوالفضل لکھتے ہیں کہ حاجی نے پہرے والوں سے سازش کر کے کپڑے کے تھان کھول کر لٹکائے کہ کمند کی طرح اس پہ سے اتر جائیں۔ قضا نے دھکا دیا، اوپر سے گر پڑے اور صبح کو مرے ہوئے ملے[۱۵]

---

[۱۴] صاحب منتخب التواریخ عبدالقادر بدایونی مراد ہیں

[۱۵] دربارِ اکبری ص ۷۰۲

علامہ سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے بھی نزہۃ الخواطر میں حاجی ابراہیم سرہندی کا تعارف کرایا ہے اور سالِ وفات ۹۹۴ھ تحریر کیا ہے[۱۶] ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی منتخب التواریخ میں یہی سالِ وفات لکھا ہے۔ البتہ محمد حسین آزاد نے دربارِ اکبری میں جس انداز میں ان کی وفات کا واقعہ بیان کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ان کی وفات ۹۹۵ھ کو ہوئی۔ ہمارے خیال میں اس ضمن میں ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان صحیح ہے کیونکہ وہ ان کے معاصر تھے اور تمام واقعات کے عینی شاہد۔

حاجی ابراہیم سرہندی، بلاشبہ اپنے وقت کے عالم دین اور فقیہ تھے[۱۷] مگر افسوس ہے، مناظرہ بازی، زبان درازی، مکروفریب، رشوت خواری، بحث وجدل، ہر ایک سے پنجہ آزمائی اور علم کی کشتی اور عقل کے دنگل کے لیے کمربستہ ہوجانے کے شوق نے ان کو کسی کام کا نہ چھوڑا اور غلط کرداری کی بنا پر وہ زندگی کے ایسے موڑ پر جا کھڑے ہوئے جس سے اگلی منزل تباہی کے سوا اور کوئی نہ تھی۔ اہلِ علم کا اصل شیوہ تو سنجیدگی و متانت سے خدمتِ دین اور تبلیغِ کتاب وسنت ہے نہ کہ خصومت والزام تراشی کے مواقع پیدا کرنا اور دوسرے کی تذلیل وتوہین پر اتر آنا۔!

۷۔ شیخ ابراہیم جون پوری

شیخ ابرا[illegible]ن پوری حنفی المسلک تھے۔ بڑے فاضل شخص تھے اور اپنے عصر کے مشہور فقہا میں سے تھے۔ انھوں نے شاہ آباد میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے ساتھ علم کلام کے اس مسئلہ پر مناظرہ ومباحثہ کیا تھا کہ کسی شخص معیّن کے لیے یہ کہنا کہ یہ اہلِ جنت سے ہے یا اہلِ جہنم میں سے، جائز ہے یا نہیں؟ شیخ ابراہیم کا موقف یہ تھا کہ میرے اور اللہ کے درمیان یا میرے اور لوگوں کے درمیان تعلق ورابطہ کی جو نوعیت ہے

---

[۱۶] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۵، ۶۔ ان کے حالات کے لیے اذکارِ ابرار، ص ۳۸۴، ۳۸۵ بھی دیکھ

[۱۷] منتخب التواریخ ص ۳۲۶۔

اس کے پیشِ نظر میں کسی خاص اور معین شخص کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اہلِ جنت سے تعلق رکھتا ہے یا اہلِ جہنم سے۔[۱۸] اس بحث کی تفصیل شیخ محمد بن مبارک جون پوری کے حالات میں بیان کی گئی ہے۔

۸۔ قاضی ابراہیم سندھی

قاضی ابراہیم دربیلوی سندھی کی کنیت ابو عبداللہ تھی، دربیلہ کے رہنے والے تھے اور ان کا شمار سندھ کے جلیل القدر علما میں ہوتا تھا۔ ان کے بیٹے شیخ عبداللہ سندھی مکہ مکرمہ چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کی اولاد و اعقاب میں اللہ نے بڑی برکت عطا فرمائی۔[۱۹]

۹۔ شیخ ابو اسحاق لاہوری

شیخ ابو اسحاق بن حسین قادری لاہوری عالم اجل اور صالح بزرگ تھے۔ شیخ داؤد بن فتح اللہ جہنی وال سے اخذِ طریقت کیا تھا۔[۲۰] ان سے عرصہ تک منسلک رہے۔ بعدازاں لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اپنے دور کے عالم کبیر اور تفسیرِ قرآن میں ماہر تھے۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ان کا ذکر کیا ہے، وہ بڑے دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں:

شیخ ابو اسحاق لاہوری حضرت میاں شیخ داؤد کے خلیفہ تھے اور اپنی تیز رفتاری

---

[۱۸] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۷۔

[۱۹] تاریخ معصومی ص ۲۳۲۔ تحفۃ الکرام ص ۲۴۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۷۔ تذکرۃ علمائے ہند، ص ۲۶۱۔

[۲۰] شیخ داؤد کچھ عرصہ جہنی وال میں قیام پذیر رہنے کے بعد شیر گڑھ چلے گئے تھے جو ضلع ساہیوال (پنجاب) کا ایک قصبہ ہے۔ جہنی وال کو اب "چونیاں" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو ضلع قصور کی ایک تحصیل ہے۔

میں مشہور تھے۔ ان کے دل میں مرشد کی محبت جاگزین تھی۔ تغیراتِ زمانہ اور انقلاباتِ دوراں سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ ان کو دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی اور دل میں خدا طلبی کا جذبہ جاگ اٹھتا تھا۔ بلاشبہ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔

ان کے بس دو تین رفیق تھے۔ ان کے علاوہ نہ کسی سے ملتے اور نہ کسی کو اپنے ہاں بلاتے۔ پیری مریدی کا کوئی سلسلہ نہیں رکھا تھا۔ ہمیشہ ایک حجرے میں، جو ایک باغ میں تھا، گوشہ نشین رہتے۔ شیخ داؤد جھنی وال سے ملاقات کا اشتیاق ہوتا تو لاہور سے پیدل نکل جاتے اور ایک رات میں چالیس کوس کا فاصلہ طے کر کے شیر گڑھ پہنچ جاتے اور ان کو ملے بغیر واپس آجاتے۔

خود ملا عبدالقادر بدایونی بھی ان کی خدمت میں گئے تھے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

ایک سال میں بھی لاہور میں ان بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور ان کے ہاں ایک رات اور ایک دن مہمان رہا۔ دوسرے دن شیر گڑھ کے لیے صرف ایک حافظ کے ساتھ روانہ ہو گیا، حالاں کہ وہ زمانہ نہایت خطرناک تھا۔ راستے میں راہزن اور لٹیرے میرا راستہ روک لیتے اور حیران ہو کر پوچھتے کہ اس خطرناک جنگل میں تم تن تنہا کہاں جا رہے ہو۔ میں جیسے ہی جواب میں یہ کہتا کہ میاں شیخ ابو اسحاق کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اب شیخ داؤد کے پاس شیر گڑھ جا رہا ہوں تو وہ ان کا نام سن کر عقیدت و احترام سے پیش آتے، کھانے پینے کے لیے دودھ دہی وغیرہ لے آتے اور راستہ بتا کر احتیاط و حفاظت کے لیے کہتے کہ جہاں کوئی خطرناک آدمی ملے اس کو شیخ ابو اسحاق کا نام بتا دینا۔

اس سے آگے ملا عبدالقادر رقم طراز ہیں:

جس سال شیخ داؤد جھنی وال نے انتقال کیا، ان کی وفات کے کچھ ہی دن بعد پنجاب میں عام وبا پھوٹ پڑی تھی، اسی وبا میں تین چار ماہ کے اندر اندر شیخ کے تمام اہلِ خاندان اور مشہور خلفا جو تقریباً پچاس ساٹھ آدمی تھے، ایک کے بعد ایک اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کچھ ہی عرصہ بعد شیخ ابو اسحاق بھی انتقال فرما گئے۔[۲۱]

---

[۲۱] منتخب التواریخ ص ۲۹۴، ۲۹۵۔

مفتی غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیا میں لکھتے ہیں :

شیخ ابو اسحاق مروجہ علوم میں مہارت رکھتے تھے، تفسیر، حدیث اور فقہ کے عالم تھے اور اپنی خانقاہ میں ان علوم کی باقاعدہ تعلیم دیتے تھے۔ تمام عمر لوگوں کی ہدایت میں مصروف رہے اور خلقِ کثیر نے ان سے علمی اور روحانی فیوض حاصل کیے۔ ۵ محرم ۹۸۵ھ کو لاہور میں وفات پائی[۲۲]۔

مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے تاریخِ وفات ۶ محرم ۹۸۴ھ تحریر کی ہے[۲۳]۔

۱۰- شیخ ابوبکر اکبر آبادی

شیخ ابوبکر قرشی حنفی اکبر آبادی، عالم و فقیہ تھے اور اپنے دَور کے مشہور افاضل میں سے تھے۔ سلطان سکندر لودھی کے عہدِ حکومت میں ہندوستان کے مشہور شہر آگرہ میں آئے اور پھر وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ علمِ فقہ میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ امام محمد بن حسن شیبانی کی کتاب وصایا کی شرح لکھی۔ پھر اصول بزدوی کی شرح سپردِ قلم کی۔ آگرہ کے نواح میں جوگی پور کے مقام پہ وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے[۲۴]۔

۱۱- قاضی ابو سعید بھکری سندھی

قاضی ابو سعید بن قاضی زین الدین بھکری سندھی، فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے اور اپنے وقت کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ ان کا شمار دسویں صدی ہجری کے معروف سندھی اور ہندی علمائے کرام میں ہوتا ہے۔ علمِ تفسیر، علمِ حدیث، علمِ فقہ، اصولِ فقہ اور علومِ عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ ذکاوت و فطانت میں ضرب المثل تھے۔ فضیلت اور حاضر جوابی میں اُس دَور میں کوئی ان کا مدِّ مقابل نہ تھا[۲۵]۔

---

[۲۲] خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۱۳۲، ۱۳۳۔ [۲۳] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۸۰۷۔

[۲۴] اذکارِ ابرار، ص ۲۲۶ ۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۸، ۹۔

[۲۵] تحفۃ الکرام، ص ۳۴۴ ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۹

تذکرہ علمائے ہند میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

قاضی ابوسعید بھکری ولد قاضی زین الدین بوفور فضیلت وحضور قریحت از ممتازان روزگار بود۔[۲۶]

یعنی قاضی ابوسعید ولد قاضی زین الدین بھکری، وفورِ فضیلت اور حاضر جوابی میں اپنے عہد کے ممتاز بزرگوں میں سے تھے۔

۱۲۔ شیخ ابوالغیث حسینی بخاری

شیخ ابوالغیث حسینی بخاری، بہت بڑے فقیہ اور صالح عالمِ دین تھے۔ کبار مشائخ وعلما سے کسبِ فیض و اخذِ علم کیا اور مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ پھر ملوک وامرا کے مقربین و ندما میں شامل ہو گئے، مگر اس کے باوجود صلاح و تقویٰ کے زیور سے آراستہ تھے۔ بذل و سخا، حسنِ کردار، صداقت شعاری، آثارِ سلف صالحین کی اقتدا اور اوقاتِ معینہ میں عبادت گزاری وغیرہ میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اس کے ساتھ ہی درس وافادہ کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اللہ نے ان کو مال و دولت کی نعمت عطا کی، وجاہت وحشمت سے نوازا اور عز و شرف سے بہرہ ور فرمایا لیکن ساتھ ہی یہ توفیق خداوندی بھی شاملِ حال رہی کہ نمازِ باجماعت کے اس حد تک پابند تھے کہ کبھی تکبیرِ تحریمہ فوت نہیں ہوئی، حتیٰ کہ بیماری میں بھی باقاعدہ اس پر عمل پیرا رہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کا تذکرہ نہایت عقیدت و احترام سے کیا ہے۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

میر ابوالغیث بخاری بڑے پاک مشرب اور عالی ہمت بزرگ تھے۔ ان کے اخلاق پر فرشتوں کے اخلاق کا گمان ہوتا تھا، غنا کے پردے میں فقر کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ انھوں نے بہت سے علما و مشائخ سے استفادہ کیا تھا، سخاوت و بخشش، آزادہ روی، حسنِ معاشرت، صدقِ معاملت،

---

[۲۶] تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۱۔

اور میل جول میں اللہ کی کھلی نشانی تھے۔ احکامِ شریعت کی پابندی اور صوفیائے سلف و خلف کی پیروی پوری طرح کرتے تھے۔ اتباعِ سنت اور نماز باجماعت سے ایسا شغف تھا کہ مرض میں بھی باوجود اس کی شدت کے، تکبیر تحریمہ کبھی ان سے فوت نہ ہونے پائی۔ ان کی مجلس کبھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر اور بزرگانِ دین کی باتوں سے خالی نہ رہی۔ ان کی تاریخِ وفات "میرِ ستودہ سیر" سے نکلتی ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے اس تقویٰ شعار فقیہ اور عالمِ دین نے ۹۹۵ھ کو قولنج کے مرض سے لکھنؤ میں وفات پائی اور دار السلطنت دہلی میں اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ ان کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا۔[۲۷]

۱۳- شیخ ابو الفتح بن جمال الدین مکیؒ ثم ہندی

شیخ ابو الفتح بن جمال الدین عباسی مکیؒ ثم ہندی اکبر آبادی، اپنے زمانے کے معروف عالم اور فقیہ تھے۔ دراصل شروان کے باشندے تھے، لیکن طویل عرصہ تک مکہ مکرمہ میں سکونت پذیر رہنے کی وجہ سے مکیؒ مشہور ہو گئے تھے۔ سلطان سکندر لودھی کے عہدِ حکومت میں واردِ ہند ہوئے اور اکبر آباد (آگرہ) میں اقامت پذیر ہوئے، لہٰذا اکبر آبادی کہلائے۔

شیخ ابو الفتح سیر و سیاحت کے شائق تھے۔ اپنے وطن سے خشکی کے راستے عازمِ ہند ہوئے۔ جب دریائے سندھ کے کنارے پہنچے تو دیکھا کہ امیر بحر ایک غیر مسلم ہے۔ نہایت کبیدہ خاطر ہوئے اور کہا، جس ملک کے مسلمانوں کی عنانِ اختیار دوسروں کے ہاتھ میں ہو، ابو الفتح کو اس ملک میں رہنا زیب نہیں دیتا۔ لہٰذا قندھار لوٹ جانے کا ارادہ کیا۔ اتفاق سے ان دنوں فرماں روائے اقلیم ہند سلطان سکندر لودھی، اطرافِ ملتان کا دورہ کر رہا تھا۔ اس کو پتا چلا کہ ایک پرہیز گار عالم و فقیہ واردِ سندھ ہوا تھا اور اب وہ واپس

---

[۲۷] منتخب التواریخ ص ۳۲۱- تذکرہ علمائے ہند ص ۴- نزہۃ الخواطر، ج۴ ص ۱۰۹۔

جا رہا ہے، تو اس نے ایک عریضہ ارسالِ خدمت کیا اور نہایت عجز و انکساری کے ساتھ ہندوستان کے دار الخلافہ (آگرہ) تشریف لانے کی درخواست کی۔ شیخ نے سلطان اور ارکانِ حکومت کی نصیحت کی غرض سے سلطان سے ملاقات کی۔ وہ انتہائی محبت و عقیدت سے پیش آیا۔ شیخ نے اس کو اس سے بھی زیادہ منکسر و متواضع پایا، جس کا اندازہ اس کی تحریر سے ہوا تھا۔

سکندر لودھی، نیک دل اور علما و صلحا کا قدر دان حکمران تھا۔ شیخ ابوالفتح مکّی کا وہ بدرجۂ غایت احترام کرتا تھا۔ بعض لوگوں کو سلطان کے اس تعلقِ خاطر کی بنا پر شیخ سے حسد پیدا ہوگیا اور وہ شیخ کو اذیت پہنچانے اور سلطان کو ان سے بدگمان کرنے کے درپے ہوئے۔ چنانچہ ایک دولت مند حاسد نے شیخ کی طرف سے ان کے اندازِ تحریر سے بالکل ملتا جلتا خط سلطان کے ایک دشمن کے نام تحریر کیا۔ خط چونکہ باقاعدہ سازش کے تحت بھیجا گیا تھا، اس لیے منصوبے کو مکمل کرنے کے لیے چند راہ گیروں کو دے دیا گیا۔ کاتب نے راہ گیروں سے سازباز کر رکھی تھی، اس نے خط ان سے برآمد کر کے سلطان کو پہنچا دیا۔ سازش کی کڑیاں کچھ اس طرح ملائی گئی تھیں کہ خط دیکھتے ہی بادشاہ کو اس کی صحت کا یقین ہو گیا۔ اس نے وہی خط شیخ کو بھیجا اور کسی قدر شکوہ بھی کیا۔ شیخ نے جواب میں کہا، ابوالفتح اس قماش کا آدمی نہیں ہے کہ اس قسم کی دل آزار تحریر سے اپنے قلم کو ملوّث کرے۔ یہ مجھ پر افترا باندھا گیا ہے، مفتری بہت جلد اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ جائے گا۔ منقول ہے کہ ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس شخص کا ہاتھ ایک مست اونٹ نے اس طرح چبا ڈالا کہ وہ بے کار اور خشک ہو گیا۔

شیخ ابوالفتح کے حالات میں یہ واقعہ بھی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سکندر لودھی کے بعد تختِ ہند کا وارث جب ابراہیم لودھی بنا، تو ظہیر الدین بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ سلطان ابراہیم لودھی نے اس سے مقابلے کی زبردست تیاری کی اور قلمروئے ہند کے ہر طبقے کو لڑائی کے لیے آمادہ کیا۔ اس سلسلے میں اس نے جو نفری جمع کی، اس میں باقاعدہ سرکاری فوج کے علاوہ علما و فضلا اور فقرا بھی شامل تھے۔ علما و فضلا کے

لیے یہ حکم تھا کہ وہ شبینہ لشکر میں ہم رکاب رہیں۔ بزرگانِ دین میں سے سید رفیع الدین شیرازی بھی شاملِ لشکر تھے اور شیخ ابوالفتح بھی حکمِ شاہی کے مطابق بادلِ نخواستہ اس فوج میں شریک تھے۔ فوجیوں کا یہ بہت بڑا قافلہ دارالحکومت (آگرہ) سے کوچ کر کے دہلی پہنچا۔ وہاں بادشاہ کے حکمِ ثانی کے انتظار میں کئی دن ٹھہرنا پڑا۔ ایک روز مغرب اور عشا کے درمیان شیخ ابوالفتح مکی صحن میں ٹہل رہے تھے کہ یک بارگی سمتِ مغرب سے عجلت کے ساتھ لوٹے۔ ایک شخص نے جو وہاں کھڑا تھا، شیخ کے اس اچانک لوٹنے کو بلا وجہ قرار دیا، اور صورتِ حال سے آگاہ ہونے کی غرض سے دریافت کیا کہ ٹہلتے ٹہلتے اس طرح مغرب کی جانب لوٹنے کا آخر کیا سبب ہے؟ فرمایا، اللہ کے نزدیک اس طرف سے، اس لشکر پر خدائی آفت اور ازلی آشوب کا نازل ہونا مقدر ہو چکا ہے۔ لہٰذا یہاں سے بھاگنا ضروری ہے۔ دوسرے روز علی الصبح اپنے دوستوں کو آگاہ کر کے آگرہ کو روانہ ہو گئے۔

جب ابراہیم لودھی کا لشکر ظہیر الدین بابر سے مقابلہ کے لیے پانی پت پہنچا اور دونوں متحارب فوجیں میدانِ جنگ میں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو زبردست لڑائی ہوئی، سلطان ابراہیم مارا گیا، کثیر تعداد میں فوج قتل ہوئی اور بے شمار لوگ کھیت رہے۔

منقول ہے کہ سرزمینِ ہند کے اس عالمِ کبیر اور جلیل القدر فقیہ نے ایک سو چونتیس ۱۳۴ سال کی عمر پائی، اس طویل مدت میں خلقِ کثیر کو راہِ ہدایت پر لگایا، لاتعداد متلاشیانِ حق اور طالبانِ علم کو فیض پہنچایا۔ ۲۲ شعبان ۹۵۳ھ کو آگرہ میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔ نمازِ جنازہ شیخ رفیع الدین محدث شیرازی نے پڑھائی۔[۲۸]

۱۴۔ مفتی ابوالفتح بن عبدالغفور تھانیسری

مفتی ابوالفتح بن عبدالغفور بن شرف الدین عمری تھانیسری، حنفی المسلک تھے۔ اپنے عصر کے شیخ و امام اور عالم کبیر تھے۔ ان کی فضیلت و نبالت سب کے نزدیک مسلّمہ تھی۔

۲۸ے اذکارِ ابرار ص ۸۴۸، ۸۴۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۰۔

فقہ، اصولِ فقہ اور نحو کا علم قاضی محمد فاروقی سے حاصل کیا اور علوم حکمیہ کی تکمیل شیخ حسین بکری سے کی۔ پھر آگرہ گئے اور وہیں مستقل طور سے شیخ رفیع الدین محدث شیرازی کے جوار میں سکونت اختیار کر لی اور ان سے حدیث پڑھی۔ اس ہندی عالم و فقیہ نے پورے پچاس سال آگرہ میں مسندِ درس بچھائے رکھی۔ جن اکابر علما نے ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی، ان میں شیخ افضل محمد تمیمی، قاضی ناصر الدین، حاجی ابراہیم سرہندی، شیخ عبد القادر بدایونی، شیخ کمال الدین حسین اور دیگر بہت سے حضرات شامل تھے۔

مفتی ابو الفتح نے ۸ جمادی الاولیٰ ۹۷۶ھ کو وفات پائی، ان کے بعض شاگردوں نے تاریخِ وفات "موتِ مفتی" سے نکالی ہے۔[۲۹]

ملا عبد القادر بدایونی نے ان کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

شیخ ابو الفتح تھانیسری اپنے زمانے کے بڑے متبحر اور بلند مرتبت عالم تھے۔ حدیث کا علم مولانا سید میر رفیع الدین محدث سے حاصل کیا۔ میر صاحب ہی کے محلے میں آگرہ میں تقریباً پچاس سال تک علوم عقلیہ و نقلیہ کا درس دیتے رہے۔ ان کے درس سے بڑے ذہین اصحابِ علم پیدا ہوئے ہیں۔ میں نے اور میاں کمال الدین حسین نے بھی ان بزرگوار کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا ہے۔

مفتی ابو الفتح کے لڑکے بھی صاحبِ علم تھے اور آگرہ کی مسندِ افتا پر فائز تھے چنانچہ بدایونی لکھتے ہیں:

ان کے لڑکے شیخ عیسیٰ اب آگرہ میں مفتی کے عہدہ پر متعین ہیں[۳۰] اکبری عہد کے اس جلیل القدر فقیہ کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا۔

---

[۲۹] منتخب التواریخ ص ۳۲۳ — تذکرہ علمائے ہند ص ۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۲

[۳۰] منتخب التواریخ ص ۳۲۳۔

۱۵- شیخ ابوالفضل خطیب گاذرونی

شیخ ابوالفضل خطیب گاذرونی، عالمِ کبیر اور علامۂ دہر تھے۔ معقول و منقول اور اصول و فروع کے ماہر تھے۔ ان کا شمار اپنے عصر کے مشہور اساتذہ میں ہوتا تھا۔ شیراز میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ مُلا جلال الدین محمد اسعد صدیقی دوّانی وغیرہ علمائے وقت سے علم حاصل کیا۔ پھر واردِ ہند ہوئے اور سلطان محمود گجراتی کے عہدِ حکومت میں گجرات گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ شاہانِ گجرات نے ان کی بڑی سرپرستی کی۔ عرصہ تک احمد آباد میں درس و تدریس کے ذریعے تبلیغ علم میں مصروف رہے بہت سے لوگوں نے ان سے تحصیلِ علم کی، جن میں ابوالفضل اور فیضی کے والد مُلا مبارک بن خضر ناگوری بھی شامل ہیں۔ دیگر علوم کے ساتھ ساتھ اس عالمِ دین کی قرآن مجید پر خصوصیت سے نظر تھی اور اس کے مشکل مقامات کو حل کرنے میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ بعض تذکرہ نگار ان کو اصلاً شیراز کا باشندہ سمجھ کر شیرازی لکھتے ہیں اور بعض گاذرون کی طرف نسبت کر کے گاذرونی کہتے ہیں۔

بہت اچھے مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

۱- حاشیہ و تعلیقات علی تفسیر البیضاوی: تفسیر بیضاوی پر یہ ان کے بہترین حواشی ہیں۔ ان میں آیات کے شانِ نزول کی بھی وضاحت کی گئی ہے اور بعض علمی نکات و لطائف بھی بیان کیے گئے ہیں۔ تفسیر بیضاوی کا یہ نسخہ پشاور اور رام پور کے کتب خانوں میں موجود ہے۔

۲- حاشیہ علی شرح المواقف: یہ حاشیہ کتب خانہ پشاور میں موجود ہے، جو لائقِ مطالعہ ہے۔

۳- شرح الارشاد: یہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی مشہور تصنیف الارشاد کی شرح ہے، یہ کتاب علم نحو کے موضوع پر ہے۔ اس ہندی عالم دین نے ۹۵۹ھ میں وفات پائی۔[۱۵۱]

---

[۱۵۱] اذکار ابرار ص ۲۷۳- نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۲، ۱۳- عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ ص ۲۶۲، ۳۳۷، ۳۳۸-

۱۶۔ سیّد ابوالفضل حسینی استرآبادی

سیّد ابوالفضل حسینی استرآبادی، شیخِ وقت، فاضلِ دوران اور عالمِ کبیر تھے۔ شافعی المسلک تھے۔ یوں تو علم کے تمام گوشوں پر عبور رکھتے تھے، مگر علومِ حکمیہ کے تو خصوصیت سے ماہر تھے۔ علامہ جلال الدین محمد بن اسعد دوّانی کے شاگرد تھے۔ برِصغیر پاک و ہند میں تشریف لائے اور گجرات (کاٹھیاواڑ) میں مقیم ہو گئے۔ وہاں ان کے درس و تدریس کا غلغلہ بلند ہوا تو شہرتِ علم سے متاثر ہو کر بے شمار تشنگانِ علوم حاضر خدمت ہوئے اور اس نواح میں بہت جلد علما و طلبا کے لیے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اس دور میں اصحابِ علم کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا، جن میں شیخ عبدالعزیز بن محمد گجراتی کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔

فقہی اعتبار سے شافعی مسلک سے متعلق تھے اور ان کی عادت تھی کہ کتبِ شافعیہ میں جو آسان فقہی مسائل مرقوم ہیں، ان میں بھی اشکال کی ایک صورت پیدا کر دیتے تھے۔ مثلاً یہ مسئلہ سب کو معلوم ہے کہ سجدۂ سہو، اس وقت کیا جائے گا، جب نمازی سے سہواً نماز کا کوئی رکن ادا ہونے سے رہ جائے، مگر یہ کہتے تھے "اگر کوئی شخص عمداً نماز کا کوئی رکن ادا نہ کرے تو اس پر بھی سجدہ سہو لازم آتا ہے۔ اس پر بحث شروع کر دیتے، انھیں ہر چند یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی کہ سجدہ سہو کو اسی بنا پر "سہو" کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق نماز میں سہو ہو جانے سے ہے، عمد سے نہیں، لیکن وہ بدستور بحث جاری رکھتے اور کہتے، اگر کوئی رکن نماز ترک ہو گیا ہے تو سجدہ سہو لازم آتا ہے۔ وہ رکن سہواً ترک ہو گیا ہو یا عمداً اس کو ادا نہ کیا گیا ہو، دونوں صورتوں میں سجدہ سہو کرنا لازم ہے۔

اسی طرح اور بھی متعدد فقہی مسائل میں لوگوں کو الجھا دینے کے عادی تھے کتب فقہ بالخصوص شافعی فقہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔

افسوس ہے، دسویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کے اس فقیہ کی تاریخِ ولادت

اور تاریخِ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔[۳۶]

۱۷۔ شیخ ابو القاسم بن احمد مکیؒ

شیخ ابو القاسم کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ ابو القاسم بن احمد بن محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن عبد اللہ بن فہد الشرف محمد بن محب ابی بکر بن تقی ہاشمی شافعی مکی۔ اپنے اسلاف کی طرح ابن فہد کے نام سے معروف تھے۔ ہفتے کی رات ۱۲ ربیع الاول ۸۴۶ھ کو مکۂ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو دل میں طلبِ علم کے شوق نے انگڑائی لی اور قاہرہ، دمشق کی درس گاہوں کی راہ لی۔ وہاں کے اساتذہ سے کسبِ فیض کیا اور سند و اجازہ سے بہرہ ور ہو کر مکہ مکرمہ کو واپس لوٹے۔ پھر عازمِ ہند ہوئے اور گجرات کو، جو اُس دور میں مرکزِ علما و فقہا تھا، اپنا مسکن ٹھہرایا۔ وہاں طویل عرصہ تک مقیم رہے۔ بعد ازاں عمر کے آخری دور میں مانڈو تشریف لے گئے اور وہیں اس دنیائے فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھارے۔

شیخ ابو القاسم بن احمد مکیؒ نہایت اونچے درجے کے شافعی المسلک فقیہ تھے۔ مولانا سید عبد الحی حسنی لکھنوی، نزہۃ الخواطر میں محمد بن عمر آصفی کی تصنیف ظفر الوالہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شیخ ابو القاسم مکیؒ نے جب ساحلِ ہند پر قدم رکھا تو ان کے پاس صحیح بخاری کی شرح، فتح الباری کا ایک نسخہ تھا، جو اُن کے والد اور عم محترم کے ہاتھ کا مکتوبہ تھا۔ یہ نسخہ انھوں نے گجرات کاٹھیاواڑ کے ایک حکمران کو پیش کیا۔[۳۳] سلطان محمود شاہ بیگڑہ کی وفات کے بعد، گجرات سے مانڈو گئے اور اسّی سال سے زائد عمر پا کر ۹۲۵ھ میں فوت ہوئے۔[۳۴]

---

[۳۲] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۳، ۱۴۔

[۳۳] یہ نسخہ سلطان محمود شاہ بیگڑہ (متوفی ۲ رمضان المبارک ۹۱۷ھ) کو پیش کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے، فتح الباری کا یہ پہلا نسخہ تھا جو دیارِ ہند میں آیا اور اسے ایک شافعی المسلک فقیہ مکہ مکرمہ سے یہاں لائے۔

[۳۴] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۴، ۱۵۔

۱۸- قاضی ابوالمعالی بخاری

قاضی ابوالمعالی بخاری، شیخ عصر، عالم کبیر اور فقیہ زمان تھے۔ کبار فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ ان کے عہد میں فروع و اصول میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ فقہ حنفی پر ان کی وسعت نظر کا یہ عالم تھا کہ بقول مولوی رحمان علی کے:

"او در فقہ چناں دست گاہی داشت کہ اگر بالفرض و التقدیر، جمیع کتب فقہ حنفی از عالم بر افتادے، او از سر نو توانست نوشت[۳۵]"

یعنی وہ علم فقہ میں اس درجہ دست گاہ رکھتے تھے کہ اگر بالفرض فقہ حنفی کی تمام کتابیں دنیا سے ختم ہو جائیں تو وہ انھیں از سر نو لکھ سکتے تھے۔

مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی رقم طراز ہیں کہ فقہ پر انھیں اس درجہ عبور حاصل تھا کہ اس موضوع سے متعلق حسب المفتی کے نام سے انھوں نے ایک مبسوط و مفصل کتاب لکھی جو تقریباً ساٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری (پٹنہ۔ ہندوستان) میں موجود ہے۔ اس کا آغاز "الحمد للہ الذی جعل العلم ھدایۃ الی الدرجات العظمیٰ" الخ کے الفاظ سے ہوتا ہے[۳۶]۔

یہ نامور عالم و فقیہ، در اصل توران کے رہنے والے تھے، ۹۶۹ھ میں مغل حکمران جلال الدین اکبر کے عہد میں برصغیر پاک و ہند میں آئے اور آگرہ میں مقیم ہو گئے۔ آگرہ میں انھوں نے مسند درس و تدریس آراستہ کی، جس میں بے شمار حضرات نے اخذ علم کیا، ان کے شاگردوں میں اکبری عہد کے مشہور مورخ و عالم ملا عبدالقادر بدایونی بھی شامل تھے۔ انھوں نے اپنی معروف تصنیف منتخب التواریخ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

قاضی ابوالمعالی، عزیز بخاری کے داماد، شاگرد اور خلیفہ تھے۔ ان کو فقہ پر ایسا عبور تھا کہ اگر

۳۵- تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۔

۳۶- نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۶۔

فقہِ حنفی کی تمام کتابیں دنیا سے اٹھالی جائیں تو وہ از سرِ نو، ان سب کو لکھوا دیتے۔ انھوں نے عبداللہ خاں بادشاہِ توران کو فنِ منطق اور علمِ جدل، ختم کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ ماوراءالنہر سے ملا عصام الدین الفرائنی اور ان کے بدباطن طلبا ان ہی کی وجہ سے شہر بدر کیے گئے تھے۔ اس ہنگامہ کا سبب یہ ہوا کہ جب یہ علم بخارا اور سمرقند میں پھیلا تو خبیث اور شریر لڑکے جہاں بھی کسی سلیم الطبع صالح آدمی کو دیکھتے تو کہنے لگتے، "یہ تو گدھا ہے۔" (ھٰذا حمار) کیونکہ "لاحیوان" اس سے مسلوب ہے۔ منطق کی اصطلاح میں "نفی عام" چوں کہ "نفی خاص کو مستلزم" ہے، لہٰذا اس سے سلبِ انسانیت لازم آتا ہے۔ اس قسم کے منطقی مغالطے جب کثرت سے پھیل گئے تو قاضی ابوالمعالی نے والیِ توران عبداللہ خاں کو اس کے سدِّ باب پر آمادہ کیا اور اس گروہ کا اخراج کرادیا اور منطق و فلسفہ کی تعلیم پر پابندی عائد کر دی۔ اسی زمانے میں قاضی ابوالمعالی کے مخالفوں نے یہ روایت بھی ان کی طرف منسوب کی، کہ وہ کہتے ہیں جس کاغذ پر منطق لکھی ہو، اس سے استنجا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے[۳۷]۔

اس کے ساتھ ہی ملا عبدالقادر لکھتے ہیں:

قاضی ابوالمعالی ہمیشہ ہر نماز کے بعد حلقہ میں ذکر کیا کرتے اور مرید بناتے تھے۔ وہ ۹۶۹ھ کو آگرہ آئے تھے۔ میں نے شرح وقایہ کے پہلے چند سبق ان سے پڑھے۔ بلاشبہ وہ اس فن میں بحرِ بے پایاں تھے[۳۸]۔

مولانا محمد حسین آزاد نے دربارِ اکبری میں "شیخ عبدالقادر بدایونی امامِ اکبر شاہ" کے عنوان کے ضمن میں قاضی ابوالمعالی کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

قاضی ابوالمعالی بخاری کو جب عبداللہ خاں ازبک نے جلاوطن کیا تو وہ بھی آگرہ آئے۔ ان کے جلاوطن کرنے کا قصہ بھی عجیب ہے۔ خود لکھتے ہیں کہ جب علمِ منطق توران میں پہنچا تو دیکھتے ہی دیکھتے لوگ بڑے شوق سے متوجہ ہوئے مگر مصالحہ ایسا تیز لگا کہ سب فلسفی فیلسوف ہوگئے۔ جب کسی نیک بخت صاحبِ دل کو دیکھتے تو اس کی ہنسی کرتے اور کہتے، "گدھا ہے گدھا"۔ لوگ منع کرتے تو کہتے کہ ہم دلیل منطقی سے ثابت کر دیتے ہیں۔ دیکھو ظاہر ہے کہ یہ لاحیوان ہے اور

۳۷ھ منتخب التواریخ ص ۳۲۹، ۳۳۰ ۳۸ھ ایضاً

حیوان عام ہے، انسان خاص ہے۔ جب حیوانیت اس میں نہیں تو انسانیت جو کہ اس سے خاص ہے، وہ بھی نہیں۔ پھر گدھا نہیں تو کیا ہے۔ جب ایسی ایسی باتیں حد سے گزر گئیں تو مشائخ صوفیا نے فتویٰ لکھ کر عبداللہ خاں کے سامنے پیش کیا، اور منطق کا پڑھنا پڑھانا حرام ہو گیا۔ اس میں قاضی ابوالمعالی، ملا عصام، ملا مرزا جان اور اکثر شخص بدعقیدہ ہو کر وہاں سے نکالے گئے[۳۹]

اس سے آگے ملا عبدالقادر بدایونی کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں:

(ملا عبدالقادر) کہتے ہیں کہ چند سبق شرح وقایہ کے میں نے بھی قاضی ابوالمعالی سے پڑھے اور حق یہ ہے کہ اس علم میں دریائے بے پایاں تھے۔ نقیب خاں بھی اس میں شریک ہوئے[۴۰]

مسائلِ فقہ پر مشتمل ان کی تصنیف حسب المفتی ہے، جس کے نسخے بانکی پور، رام پور، قاہرہ اور انڈیا آفس لندن کی لائبریریوں میں موجود ہیں[۴۱]

دسویں صدی ہجری کے اس عظیم اور جیّد عالمِ دین کی تاریخِ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

۱۹- شیخ ابو یزید برہان پوری

شیخ ابو یزید بن لشکر محمد برہان پوری، شیخ صالح اور فقیہِ وقت تھے۔ مشائخ عشقیہ شطاریہ میں سے تھے۔ اپنے والد اور شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی سے اخذِ فیض کیا۔ پھر مسندِ مشیخت پر فائز ہوئے۔ خلقِ کثیر کو فیض پہنچایا۔ عبادت گزار، زاہد، قانع، عفیف اور متوکّل علی اللہ تھے۔ تمام دنیوی علائق سے منقطع ہو کر عبادتِ الٰہی میں مصروف ہو گئے تھے۔ ۹۹۰ھ میں فوت ہوئے[۴۲]

---

[۳۹] قاضی ابوالمعالی کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں، کیوں کہ وہ تو بہت بڑے فقیہ تھے اور خود اہلِ منطق کی اس قسم کی مغالطہ آمیزیوں سے شاکی تھے۔ ان ہی نے تو عبداللہ خاں سے اس کی شکایت کی تھی۔ ان کے توران سے نکلنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ علمائے منطق ان کے شدید مخالف ہو گئے تھے۔

[۴۰] دربارِ اکبری، ص ۴۲۵۔

[۴۱] عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ، ص ۳۰۱۔

[۴۲] اذکارِ ابرار، ص ۳۹۳، ۳۹۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۷۔

۲۰- مولانا اثیر الدین کاہانی

مولانا اثیر الدین بن عبد العزیز ابہری ثم کاہانی سندھی، اپنے وقت کے معروف علما اور اصحابِ صلاح و تقویٰ میں سے تھے۔ محدث اور شیخ تھے۔ درحقیقت ہرات کے رہنے والے تھے، وہاں سے ۹۲۸ھ میں اپنے والدِ مکرم شیخ عبد العزیز کے ساتھ بلادِ سندھ میں آئے اور ایک گاؤں "کاہان" میں سکونت پذیر ہو گئے، جو اس زمانے میں سیوستان کے نواح میں اقلیم سندھ میں واقع تھا۔ تمام علوم میں ماہرِ کامل تھے۔ مروجہ کتبِ حدیث اپنے والدِ محترم سے پڑھیں۔ ہر وقت درس و افادہ میں مصروف رہتے۔ بلادِ سندھ کے بے شمار طلبا نے ان سے اخذِ علم کیا۔[۴۳]

میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے تحفۃ الکرام میں ان کا اور ان کے والد ماجد کا ذکر کیا ہے۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

مخدوم عبد العزیز محدث ابہری اور ان کے فرزند تبحر اور تحقیق و تدقیق میں یگانہ اور اقلیمِ علم کے شہنشاہ، جام فیروز کے زمانے میں شاہ اسماعیل صفوی کی بغاوت کی وجہ سے اپنے دونوں گوہرانِ عالی (یعنی) سراسر فضل و سرتاپا ہنر فرزندوں، مولانا اثیر الدین جن کی فضیلت و کمال کا غلغلہ حدِ آسمان سے بھی اوپر جا پہنچا تھا اور مولانا یار محمد جو جامعیتِ علوم میں یگانہ روزگار تھے، کے ساتھ ہرات سے موضع کاہان میں تشریف فرما ہوئے اور موالیدِ ثلاثہ کی مانند اس سرزمین کو اشاعتِ علم سے سرور روح کا چشمہ بنا دیا۔ پھر وہ ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہے اور کتابِ حیات کے مطالعہ سے یہیں آنکھیں بند کیں۔ شرح مشکوٰۃ شریف اور اکثر کتبِ مروجہ کے حواشی جیسی عجیب و غریب تصنیفات یادگار چھوڑ گئے۔[۴۴]

---

[۴۳] ماثر رحیمی ج ۲، ص ۲۷۵۔

[۴۴] تحفۃ الکرام ص ۲۴۴۔ نیز دیکھیے نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۷۔

محمد معصوم بھکری نے بھی ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی روایت کے مطابق وہ ۹۱۸ھ میں شاہ اسمٰعیل صفوی کی بغاوت کی وجہ سے وارد کابان ہوئے نیز یہ کہ ان کی شرح مشکوٰۃ مکمل نہیں ہوسکی اور اس کا مسودہ ان کے کتب خانے میں موجود ہے۔[۴۵]

۲۱۔ شیخ احمد بن ابو الفتح غازی پوری

شیخ احمد بن ابو الفتح غازی پوری شہر غازی پور میں پیدا ہوئے، جو ہندوستان کے صوبہ یوپی میں واقع ہے۔ وہیں پلے بڑھے اور اپنے والدِ ماجد شیخ ابو الفتح اور دیگر علمائے عصر سے کسبِ علم کیا۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ پر کامل عبور رکھتے تھے۔ تذکرہ نگاروں نے انھیں بہت بڑے فقیہ و عالم اور شیخ قرار دیا ہے۔ بعد کو موضع زمانیہ میں سکونت اختیار کرلی تھی، جو اعمالِ غازی پور میں ایک قریہ ہے۔ درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے اور یہی ان کا اصل مشغلہ تھا۔[۴۶]

۲۲۔ قاضی احمد بن اسماعیل ظفر آبادی

قاضی احمد بن اسماعیل حسینی واسطی ظفر آبادی، احمد نور کے نام سے معروف تھے۔ عالم و فاضل تھے۔ فقہِ حنفی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ فہمِ حدیث میں بھی شہرت رکھتے تھے۔ ظفر آباد کے منصبِ قضا پر فائز تھے۔ تصوّف و سلوک سے بھی لگاؤ تھا اور اس سلسلے میں اپنے والدِ مکرم سے بیعت تھے۔ تصنیف و تالیف اور درس و تدریس ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ تصوّف کے موضوع پر رموز المعانی ان کی تصنیف ہے۔ اپنے نام سے ایک قریہ آباد کیا، جس کو احمد نور کے نام سے موسوم کیا۔ مغل حکمران جلال الدین اکبر کے عہدِ حکومت میں ۹۹۵ھ میں وفات پائی۔ "گلزار ارم یافتند" مادۂ تاریخ ہے۔[۴۷]

---

[۴۵] تاریخ معصومی فارسی ص ۱۰۶ [۴۶] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۸ بحوالہ عاشقیہ۔

[۴۷] تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۹۹۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۸۔

۲۳۔ شیخ احمد بن اسحاق سندھی

شیخ احمد بن اسحاق سندھی، ارضِ سندھ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ شیخ عبدالرشید سندھی سے علم حاصل کیا اور مسندِ تدریس کو زینت بخشی۔ سرزمینِ سندھ کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ نہایت صالح و عفیف، متقی و پرہیز گار اور متدین شخص تھے۔ ان کے بہت سے کشوف و کرامات اور عجیب و غریب واقعات مشہور ہیں۔ ۹۳۶ھ کو سندھ کے ایک مقام ہالہ کنڈھ میں فوت ہوئے[۴۸]

۲۴۔ شیخ احمد بن اسماعیل مندوی

شیخ احمد بن اسماعیل قادری مندوی، اپنے وقت کے عالم و محدث تھے۔ حدیث، فقہ اور دیگر علوم کے ماہر تھے۔ حرمین شریفین کا سفر کیا اور طویل عرصہ تک مشہور شافعی المسلک عالم شیخ محمد بن ابو الحسن البکری سے انسلاک ولزوم اختیار کیے رکھا اور ان سے اخذِ علم بھی کیا[۴۹]

نہ تو ان کی کسی تصنیف کا پتا چل سکا ہے اور نہ تاریخ ولادت و وفات کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکے ہیں۔

۲۵۔ شیخ احمد بن بدرالدین مصری

شیخ احمد بن بدرالدین عباسی مصری ثم ہندی گجراتی، ان کا لقب شہاب الدین تھا۔ شافعی المسلک تھے۔ جید عالم، بہت بڑے محدث اور اپنے عصر کے شیخ تھے۔ تقویٰ و صالحیت میں بھی بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ ان کے علم و فضل کی فراوانیوں کی وجہ سے اس دور کے

---

[۴۸] تاریخ معصومی ص ۲۹۹۔ تحفۃ الکرام ص ۱۶۱، ۴۶۲، ۴۶۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۸۔

[۴۹] اذکارِ ابرار، ص ۴۴۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۸۔

علمائے کرام ان کی انتہائی توقیر کرتے تھے۔

یہ عالمِ دین جمعہ کی رات ۹۰۲ھ کو مصر میں پیدا ہوئے اور ہوش سنبھالتے ہی حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ اپنے دور کے مشاہیر مشائخ وفضلا کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا جن میں شیخ الاسلام زین الدین زکریا انصاری، علامہ شیخ برہان الدین بن ابو شریف، شیخ الامام نورالدین مکی، شیخ کمال الدین طویل، شیخ زین الدین عزبی اور شیخ نورالدین ملتجی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہیں۔ ۹۳۶ھ میں زبید میں شیخ الاسلام ابو العباس طنبدادی بکری سے ملے اور ان سے اخذِ علم کیا۔

شیخ احمد مصری مذاہبِ اربعہ اور ان کی فقہیات پر عبور رکھتے تھے۔ ان کے محفوظات ومسودات میں سے جو علمی چیزیں ان کے بعد دستیاب ہوئیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ فقہ سے متعلق نووی کی المنہاج پر حواشی وتعلیقات۔

۲۔ شاطبیہ، جو قرأت کے بارے میں ہے۔

۳۔ حدیث کے موضوع پر مقدسی کی العمدہ پر حواشی۔

۴۔ نووی کی اربعین پر حواشی۔

۵۔ الاجرومیہ، جو علمِ نحو کے موضوع پر ہے۔ ۶۔ مختصر ابی شجاع پر حواشی۔

یہ شافعی محدث وفقیہ، علمِ حرف یعنی حروف کے محلِ استعمال اور ان کی خصوصیات علمِ فلکیات اور علمِ میقات میں بھی یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ علم وفضل کی اس فراوانی کے ساتھ ساتھ خشیتِ الٰہی، ورع وتقویٰ، انکسار وتواضع، لوگوں سے اختلاط اور میل جول سے احتراز، مواقعِ شہرت سے گریز، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے تمسک، مسلکِ سلف کی پابندی اور قرآن وحدیث پر عمل، ان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔

ان کے والد بزرگوار شیخ بدرالدین مصری کے بارے میں یہ حکایت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ وہ ملک شام میں قیام فرما تھے کہ شدید مرض میں مبتلا ہو گئے اور بحالتِ مرض میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام وفرامین اور آپ کی رسالت اور نبوت کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے ملتجی صحت ہوئے۔ چنانچہ عالمِ رؤیا میں آنحضرتؐ کی زیارت ہوئی۔ آپؐ ان سے فرما

رہے ہیں، "ابو احمد اٹھ کھڑے ہو جاؤ، تمھیں اس مرض سے اللہ نے شفایاب کر دیا ہے"۔

اس وقت ان کے کوئی ایسا بچہ نہ تھا جس کا نام احمد ہو اور ان کی بیوی مصر میں تھیں، جو حالتِ حمل میں تھیں۔ چند روز بعد بچے کی ولادت کی اطلاع آئی، اس بچے کا نام انھوں نے احمد رکھا اور یہ وہی احمد ہیں جن کا اسمِ گرامی سرِ عنوان ہے۔

شیخ احمد کو بے شمار اشعار یاد تھے، جو اکثر مجلسوں میں سناتے تھے اور ان کا پس منظر بھی بیان فرماتے تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ ۹۲۳ھ کے لگ بھگ میں مکہ مکرمہ میں مقیم تھا کہ وہاں میں نے عبداللہ باکثیر سے یہ واقعہ سنا، وہ کہتے تھے کہ مکہ مکرمہ میں ایک مصوفی عالم تشریف لائے۔ ایک روز انھوں نے حرم شریف میں وعظ کہنا شروع کیا۔ انھوں نے پہلے الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ پڑھا۔ پھر وعظ کا آغاز مندرجہ ذیل اشعار سے کیا اور کہا کہ بچپن میں میرے والد نے مجھے یہ اشعار سنائے تھے:

اذا شئت ان تحی سلیما من الاذی — و ذنبك مغفور و عرضك صین

فلا ینطق منك اللسان بسوءة — فعندك سوءات وللناس اَلسن

وعینك ان اھدت الیك معایبًا — فغمض وقل یا عین للناس اعین

وعاشر بمعروف وسامح من اعتدیٰ — ولا تدفع الّا بالّتی ھی احسن

اگر تم اذیتوں اور تکلیفوں سے محفوظ رہنا چاہتے ہو اور یہ خواہش رکھتے ہو کہ تمھارے گناہ بخشے جائیں اور تمھاری عزت مصئون رہے۔

تو اس کی صورت یہ ہے کہ (کسی کے بارے میں) تمھاری زبان سے برائی کی کوئی بات نہ نکلنے پائے، کیوں کہ اگر تم لوگوں کی برائیوں سے واقف ہو تو لوگ بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔

اگر تمھاری آنکھیں کسی کے عیوب تمھارے سامنے ظاہر کریں تو خاموش ہو، اور آنکھوں سے کہو کہ لوگوں کے پاس بھی آنکھیں موجود ہیں۔

نیکی کی بات کرو اور زیادتی کرنے والے سے درگزر کرو اور لوگوں سے بہترین انداز سے گفتگو کرو۔

وہ ان اشعار کی مکمل تصویر تھے۔

کان واللہ فقیھا عالما ولہ عرض مصئون ما انثلم
غیر لا یدری مدارات الوریٰ ومدارات الوریٰ امر مھم

بخدا وہ فقیہ اور عالم تھے۔ ہر قسم کے انہدام سے ان کی عزت محفوظ تھی۔ وہ اس بات کی پرواہ نہ کرتے تھے کہ لوگ کیا سلوک کرتے ہیں اور لوگوں کا سلوک بہت بڑی چیز ہے۔

شیخ احمد بن بدرالدین شافعی مصری نے ۴ رمضان المبارک ۹۹۲ھ کو احمد آباد میں وفات پائی۔[۵۰]

۲۶۔ شیخ احمد بن جعفر گجراتی

شیخ احمد بن جعفر بن محمود حسینی سندھی گجراتی، ۸۷۰ھ کو گجرات میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے والدِ مکرم شیخ جعفر اور دیگر علمائے عصر کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد طویل عرصہ تک تدریس اور افادہ طلبا میں مصروف رہے۔ پھر حرمین شریفین کا قصد کیا اور حج و زیارت سے بہرہ ور ہوئے۔ وہاں سے واپس آکر پھر گجرات میں مسندِ تدریس کو رونق بخشی اور عمر بھر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اپنے دور کے شیخ و عالم اور ماہرِ تجوید تھے۔ قرأت و تجوید اور علوم دینیہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ دسویں صدی ہجری کے اس ہندی عالمِ دین سے بے شمار علما و طلبا نے استفادہ کیا۔ پیر کے دن ۱۶ صفر ۹۴۴ھ کو وفات پائی۔[۵۱]

۲۷۔ شیخ احمد بن خلیل بیجاپوری

شیخ احمد بن خلیل بیجاپوری، عالم و فاضل اور محدّث تھے۔ اساتذہ ہند سے تعلیم

---

[۵۰] النور السافر، ص ۴۰۴ تا ۴۰۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۹، ۲۰

[۵۱] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۰، ۲۱ بحوالہ مرآت احمدی

حاصل کی، پھر حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت سے بہرہ ور ہوئے، بعد ازاں وہاں کے ائمۂ عصر سے علمِ حدیث پڑھا اور مراجعت فرمائے ہند ہوئے۔ یہاں آکر عادل شاہ بیجاپوری کے ندماء و مقربین میں شامل ہو گئے۔ وہ ان سے اس قدر قرب و ربط رکھتا تھا کہ سفر و حضر میں اپنے سے جدا نہ ہونے دیتا۔ اس محدث و فقیہ نے عید الفطر کی رات ۹۸۰ھ کو موضع کندر میں وفات پائی جو اعمال بلگام میں واقع ہے۔ ان کے بعض شاگردوں نے لفظ "فرشتہ" سے ان کی تاریخِ وفات نکالی ہے[۵۲]

۲۸۔ شیخ احمد بن زین الدین جون پوری

شیخ احمد بن زین الدین برونوی جون پوری، جون پور کے نواح میں ایک مقام "برونہ" کے رہنے والے تھے۔ صالح عالم دین اور فقیہِ عصر تھے۔ بہت ہی نیک اور پرہیزگار تھے۔ شیخ معروف بن عبدالواسع جون پوری کے شاگرد تھے، اور شیخ معروف مولانا اللہ داد کے تلمیذ و مرید تھے، جو مدارک التنزیل، ہدایہ، کافیہ اور شافیہ کے شارح تھے۔ شیخ احمد نے اخذِ طریقت بھی شیخ معروف سے کیا اور لمبی مدت تک ان سے وابستہ رہے یہاں تک کہ مرتبۂ کمال کو پہنچے۔

اکثر علومِ مروّجہ میں ماہر تھے۔ متبع شریعتِ مطہرہ اور زاہد و قانع بزرگ تھے۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کے تحائف و ہدایا قبول نہ کرتے اور اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔ ان کے شیخ نے کچھ رقم دے دی تھی، اس سے تجارت کرتے اور جو نفع حاصل ہوتا، اس سے گزر بسر کرتے تھے۔ ان کے یہ اقوال مشہور ہیں:

الزم الفقراء فان الخیر فیھم

واسأل العلماء فان الحق معھم

کہ فقراء سے وابستہ رہو، خیر ان ہی میں ہے۔

---

[۵۲] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۲

امورِ دینیہ میں علما سے سوال کرو، اس لیے کہ حق ان ہی کے ساتھ ہے۔
یکم جمادی الاخریٰ ۹۶۳ھ کو بروندہ میں انتقال کیا۔[۵۳]

۲۹۔ شیخ احمد بن ضیاء الدین مندوی

شیخ احمد بن ضیاء الدین حسینی مندوی، مشہور عالم وفقیہ تھے اور تصوّف وطریقت سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ سراج العاشقین کے لقب سے ملقب تھے۔ شیخ سلیمان بن عفان مندوی کے فیض یافتہ تھے۔ عابد و زاہد، قلیل الطعام، قلیل النوم، راضی برضائے الٰہی اور متوکل علی اللہ تھے۔ ۲۹ محرم ۹۸۸ھ کو فوت ہوئے۔[۵۴]

۳۰۔ شیخ احمد بن عبدالقدوس گنگوہی

شیخ احمد بن عبدالقدوس گنگوہی حنفی المسلک تھے اور علم وفقاہت میں معروف! تصوّف وسلوک سے بھی گہرا لگاؤ تھا اور مشہور مشائخِ وقت میں سے گردانے جاتے تھے۔ اپنے والدِ بزرگ وار شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے فیض یافتہ تھے۔ سماعِ غنا، تواجد، اور وحدت الوجود کے قائل تھے اور اس باب میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا نقطہ نظر بھی یہی تھا۔ حلّتِ غنا اور اثباتِ وحدت الوجود سے متعلق انھوں نے الگ الگ رسالے تصنیف کیے۔ لیکن ان مسائل میں ان کے بیٹے شیخ عبدالنبی محدث گنگوہی صدر الصدور نے ان کی مخالفت کی اور حرمتِ سماع پر ایک رسالہ تصنیف کیا جس میں اپنے والد اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مسلک کی سخت تردید کی۔ اس پر شیخ عبدالقدوس نے ان کو گھر سے نکال دیا اور وہ دہلی چلے گئے۔ بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر کو ان کی علمی رفعت کا پتا چلا تو اس نے ان کو ہند کی وزارتِ عظمیٰ پر متمکن کیا اور صدر الصدور کے منصب سے

---

۵۳ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۲، ۲۳۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸

۵۴ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۳ بحوالہ اخبار الاصفیاء۔

نوازا۔ شیخ احمد بن عبدالقدوس نے ۹۷۲ھ میں وفات پائی [۵۵]

۳۱۔ شیخ احمد بن عبدالملک لاہوری

شیخ احمد بن عبدالملک لاہوری فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے۔ نہایت فاضل آدمی تھے اور حدیث و فقہ کے ماہرین میں سے تھے۔ بعض درسی کتابیں شیخ منصور لاہوری سے پڑھیں اور امہات الکتب کے لیے شیخ عبداللہ بن شمس الدین سلطان پوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان ہی کے ساتھ لاہور آئے اور پھر یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ سراپا دانا، فنافی اللہ، پیکرِ زہد اور بدرجہ غایت پابندِ شریعت تھے۔ ہمیشہ تدریس و افادہ میں مصروف رہے۔ جمعہ کے روز ۱۰ محرم ۹۶۶ھ کو فوت ہوئے۔[۵۶]

۳۲۔ شیخ احمد بن مجدالدین شیبانی

شیخ احمد بن مجدالدین بن تاج الدین شیبانی نارنولی، امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی کی نسل سے تھے۔ نارنول میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ شیخ حسن بن خالد ناگوری اور شیخ بایزید بن قیام الدین اجمیری سے تحصیل کی اور عرصہ تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔ شیخِ وقت اور بہت بڑے عالم تھے۔ کتابوں پر عبور و استحضار کا یہ عالم تھا کہ اٹھارہ سال کی عمر میں مسندِ تدریس پر فائز ہو گئے تھے۔ نارنول سے اجمیر چلے گئے تھے۔ جب رانا سانگا اجمیر پر حملہ آور ہوا اور اس نے مسلمانوں کو قتل اور ان کے اموال و دولت کو لوٹنا شروع کیا تو ۹۲۲ھ کو وہاں سے نکلے اور نارنول چلے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں ٹھہرے، پھر ناگور منتقل ہو گئے۔ وہیں سفرِ آخرت کو روانہ ہوئے۔ بڑے فاضل، متقی اور متورع بزرگ تھے۔ ہمیشہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

---

۵۵ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۳ بحوالہ اخبار الاصفیاء۔

۵۶ ایضاً، ص ۲۳، ۲۴۔

میں مصروف رہتے اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے۔ ان کا معمول تھا کہ آدھی رات کو اٹھ جاتے اور ذکر و عبادت اور تہجد میں مصروف ہو جاتے۔ چاشت کے وقت تک کسی سے بات نہ کرتے۔ اس کے بعد ظہر تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔ پھر عصر تک اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔ عصر کے بعد وعظ و تذکیر کے انداز میں مدارک التنزیل کا درس دیتے۔ درس کے وقت ان پر رقت و بکا کا غلبہ طاری رہتا اور قلب کی دنیا بدلی ہوئی نظر آتی۔ مدارک التنزیل کے درس کا وہی انداز تھا جو ان کے بزرگوں اور اساتذہ کا تھا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کسی بڑے سے بڑے کی بھی پرواہ نہ کرتے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے، جو وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ کم عمری کے دور میں طلب معاش کے سلسلے میں اپنے چند متعلقین کے ساتھ مانڈو گئے۔ شیخ محمود دہلوی وہاں کے شیخ الاسلام اور حکومت کی طرف سے علما کے صدر الصدور تھے۔ جماعت کھڑی ہوئی تو شیخ محمود نے اللہ اکبر کہہ کر امام سے پہلے ہی نماز کے لیے ہاتھ باندھ لیے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو شیخ الاسلام سے کسی نے بھی کچھ نہ کہا۔ شیخ احمد کو یہ بات ناگوار گزری، وہ آگے بڑھے اور شیخ الاسلام سے کہا، آپ کی نماز نہیں ہوئی، اس لیے کہ امام کے تکبیر کہنے سے پہلے ہی آپ نے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیے تھے۔

مانڈو کی شاہی رسم یہ تھی کہ لوگ پوری طرح زمین کی طرف جھک کر اور انگوٹھا زمین پر رکھ کر شیخ الاسلام کو سلام کرتے تھے، لیکن شیخ احمد شیبانی اور قاضی ادریس دہلوی جو ایک زبردست عالم تھے، شاہی رسم کے مطابق سلام نہیں کرتے تھے، وہ برملا کہتے تھے کہ یہ بدعت ہے۔ یہ دونوں شریعت کے مطابق السلام علیکم کہتے اور بادشاہ کے برابر بیٹھتے تھے۔

بادشاہ نے عدل و انصاف کے تقاضوں کو بطریق احسن پورا کرنے کی غرض سے قاضی ادریس کو اجمیر کا قاضی مقرر کیا تھا اور چار گاؤں انعام میں دیئے تھے اور مسند افتا شیخ احمد کے سپرد تھی۔ ان کے اسلاف بھی اس مسند پر فائز تھے۔

اس عالم دین نے ۲۵ صفر ۹۲۷ھ کو انتقال کیا۔[۵۵]

---

۵۵ اخبار الاخیار ص ۱۸۴ تا ۱۸۶ — اذکار ابرار ص ۲۲۸ — نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۴، ۲۵

۳۴۔ شیخ احمد بن محمد نہروالا

شیخ احمد بن محمد بن قاضی خان عدنی خرقانی۔ ان کی کنیت ابوالعباس تھی اور لقب علاء الدین۔ یہ ابو العباس علاء الدین احمد نہروالی گجراتی کے نام سے معروف تھے۔ مفتی قطب الدین محمد نہروالی کے والد تھے جو مکہ مکرمہ کے منصب افتا پہ فائز تھے، ان کے جدِ امجد کا نام قاضی خاں تھا، مگر یہ وہ قاضی خاں نہیں ہیں، جو مشہور فتاویٰ (قاضی خاں) کے مصنف ہیں، بلکہ یہ علمائے نہروالا میں سے ہیں۔

شیخ احمد بن محمد ۸۷۰ھ میں پیدا ہوئے اور نہروالا کے فاضل علما سے علم حاصل کیا۔ پھر عازم حرمین شریفین ہوئے اور وہاں ائمہ حدیث کی ایک بڑی جماعت سے کتب احادیث پڑھیں۔ یہ صحیح بخاری کی سند عالی کے حامل تھے جس کا سلسلہ صرف چھ واسطوں سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے، جو درج ذیل ہے:

شیخ احمد بن محمد نے صحیح بخاری حافظ نور الدین ابوالفتوح احمد بن عبداللہ طاؤسی نزیل گجرات سے پڑھی جو صلاح و تقویٰ سے متصف تھے۔ انھوں نے شیخ یوسف ہروی سے پڑھی جو سہ صد سالہ کے نام سے معروف تھے یعنی انھوں نے تین سو سال عمر پائی۔ انھوں نے محمد بن شاد بخت فرغانی سے پڑھی جو ایک معمر بزرگ تھے۔ انھوں نے سمرقند کے ایک بہت بڑے بزرگ شیخ ابولقمان یحییٰ بن عمار بن مقبل بن شاہان ختلانی سے پڑھی جنھوں نے ایک سو تینتالیس ۱۴۳ سال عمر پائی۔ انھوں نے شیخ محمد بن یوسف فربری سے سماعت کی۔ انھوں نے خود جامع صحیح بخاری امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ سے پڑھی۔

شیخ ابوالعباس احمد علاء الدین نہروالی، نہایت صالح، عالم دین اور اپنے دور کے معروف محدّث تھے۔ مکہ مکرمہ میں اقامت اختیار کر لی تھی، آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔

شیخ احمد کے بیٹے قطب الدین محمد کا بیان ہے کہ جب تک میرے والد کی بینائی قائم رہی وہ ہر سال قربانی کے دن رمی سے فوراً بعد جمرہ عقبہ سے مکہ مکرمہ آجاتے، بیت اللہ کی طرف رُخ کر کے حطیم میں بیٹھ جاتے اور طواف کرنے والوں کو دیکھتے رہتے۔ وہ نمازِ مغرب تک وہیں بیٹھتے۔ مغرب کے بعد بیت اللہ کا طواف اور سعی کرتے۔ پھر منیٰ میں واپس چلے جاتے۔

فرمایا کرتے اولیاء اللہ کے لیے ضروری ہے کہ ہر سال حج کریں اور افضل پر عمل پیرا ہوں، اور افضل یہ ہے کہ یوم النحر کو دن کے پہلے حصے میں طوافِ زیارت کے لیے آئیں ۔ میں بھی یہی کرتا ہوں اور حطیم میں بیٹھ کر طواف کرنے والوں کو دیکھتا رہتا ہوں، شاید کہ میری نظر کسی ایسے نیک آدمی پر پڑ جائے یا اس کی نظر مجھ پر پڑ جائے، جس کی وجہ سے میں اللہ کے نزدیک کامیاب قرار پا جاؤں ۔ بینائی ختم ہونے کے بعد بھی وہ معمول کے مطابق وہیں آکر بیٹھ جاتے اور فرماتے، میں تو کسی کو دیکھ نہیں سکتا، لیکن ممکن ہے کسی مردِ صالح کی نظر مجھ پر پڑ جائے اور میں اللہ کا صالح بندہ بن جاؤں ۔ ان کی وفات ۹۴۹ھ کو مکہ مکرمہ میں ہوئی۔[۵۸]

۳۴ ۔ شیخ احمد بن محمد بہاری

شیخ احمد بن محمد بن طیب حنفی بہاری، عالم و فقیہ تھے اور ان کا شمار اپنے زمانے کے نامور فقہا میں ہوتا تھا ۔ قصبہ بہار کے قریب ایک قریہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی ۔ اپنے والدِ گرامی شیخ محمد بن طیب سے جو اس دور کے عالم دین اور مشہور اساتذہ میں سے تھے اور شیخ بدھا طیب کے نام سے معروف تھے، کسبِ علم کیا۔[۵۹]

سرزمین ہند کے دسویں صدی ہجری کے اس فقیہ کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا ۔ معلوم ہوتا ہے یہ مصنف نہ تھے بلکہ مسائلِ فقہ پر عبور رکھتے اور طلبا کو اس کی تعلیم دیتے تھے۔

۳۵ ۔ مفتی احمد بن محمد سندیلوی

مفتی احمد بن محمد حسینی سندیلوی، شیخِ وقت، عالم و فقیہ اور اصولی تھے ۔ مسلکاً حنفی تھے ۔ اپنے عصر کے ان فقہا و اصولیین میں سے تھے جو اس ضمن میں خاص شہرت کے حامل تھے ۔ صوبہ یو پی کے شہر سندیلہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما

[۵۸] الاعلام باعلام بیت الحرام ص ۹ ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۵، ۲۶ ۔ یادِ ایام ص ۶۲۔

[۵۹] لطائف قدوسی ص ۷۴، ۸۴ ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۶۔

پائی۔ اپنے والد بزرگوار اور دیگر علمائے وقت سے علم حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے شہر سندیلہ کی مسندِ افتا پر فائز ہوئے اور ایک عرصہ تک اس پر متمکن رہے [۶۰]۔

ان کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہوسکا۔ غالباً یہ مصنف نہ تھے۔ البتہ فقہی مسائل پر مہارت رکھتے تھے اور صاحبِ فتویٰ تھے۔

۳۶۔ شیخ احمد سرہندی

شیخ احمد سرہندی حنفی مسلک کے حامل تھے۔ عالم و فقیہ تھے اور ان حضرات میں سے تھے جو اس زمانے میں سرزمین پاک و ہند میں فقہ و اصول کے بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ تمام عمر مسندِ تدریس بچھائے رکھی اور بے شمار لوگوں کو علم فقہ کی تعلیم دی۔ مسائل فقہی پر اس درجہ عبور تھا کہ افتا میں مرجعِ خلائق ہوئے۔ ۹۸۶ھ میں وفات پائی [۶۱]۔

۳۷۔ شیخ احمد فیاض امیٹھوی

شیخ احمد فیاض امیٹھوی بڑے عالم متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ اپنے عہد کے مشہور فقہا میں سے تھے۔ تفسیر، حدیث، سیرت اور تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ کثیر المطالعہ، کثیر الدرس اور فصیح البیان تھے۔ بات چیت کا انداز بڑا پیارا، اور دھیما تھا۔ عذوبتِ لسان میں ممتاز تھے۔ علائق دنیوی سے منقطع ہو کر درس و افادہ میں مشغول ہو گئے تھے، اور دین و تقویٰ کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ تکلفات سے قطعی دور تھے۔ قناعت و زہد ان کا شیوہ، اور مسلمانوں کی خیر خواہی ان کا پیشہ تھا۔

---

[۶۰] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۷۔ بحوالہ عاشقیہ۔

[۶۱] اذکارِ ابرار، ص ۵۰۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۰۔

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ دین سے محبت کا یہ عالم تھا اور قوتِ حفظ اس درجہ تیز تھی کہ بہت زیادہ معمر ہو گئے تھے اور چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی تھی مگر قرآن مجید ایک سال کے عرصہ میں حفظ کر لیا تھا۔ اکثر درسی کتابیں پڑھانے میں مشغول رہتے۔ کوئی شاگرد پڑھتے ہوئے غلطی کر جاتا تو محض یادداشت سے ٹوک دیتے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ میں جب ان سے ملنے گیا تو شرح وقایہ کا درس دے رہے تھے۔

نماز میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کے سختی سے قائل تھے۔ ان کے ہم عصر اور ہم شہر ایک اور عالم دین شیخ نظام الدین امیٹھوی تھے، جو میاں نظام الدین امیٹھوی کے نام سے مشہور تھے، وہ فاتحہ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ شیخ احمد فیاض اس باب میں ان سے بحث کرتے، ان کی تردید فرماتے اور کہتے کہ جب حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں امام کی اقتدا میں سورہ فاتحہ پڑھنے کو واجب ٹھہرایا گیا ہے تو آپ اس سے کیوں روکتے ہیں؟ اور حدیث پر کیوں عمل پیرا نہیں ہوتے[۶۲]

مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے انھیں حنفی المسلک قرار دیا ہے[۶۳]

برصغیر پاک و ہند کے دسویں صدی ہجری کے اس عظیم المرتبت فقیہ اور متقی و زاہد عالم دین کی نہ تو کسی تصنیف کا علم ہو سکا ہے اور نہ تاریخِ ولادت و وفات کا پتا چل سکا ہے۔

۳۸۔ سید احمد ملتانی

سید احمد ملتانی حنفی فقہ، اصول، کلام اور علوم عربیہ کے جید علما میں سے تھے۔ سلطان سکندر لودھی کے عہدِ حکومت میں دہلی آئے اور مختلف مشائخ سے ملے۔ پھر شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی صحبت اختیار کی۔ ان سے عوارف المعارف اور

۶۲ھ منتخب التواریخ ص ۷-۳۰ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴ — نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۳۱۔

۶۳ھ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۳۱۔

عرائس البیان وغیرہ کتب تصوف کا درس لیا۔ اپنے مرشد اور استاذ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی طرح یہ بھی وحدت الوجود کے قائل تھے مگر علم و فضل اور رفقاہت میں یگانہ تھے۔ شیخ رکن الدین بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے لطائف قدوسی میں ان کا ذکر کیا ہے۔[۶۴]

۳۹۔ شیخ اسحاق بن کاکو لاہوری

شیخ اسحاق بن کاکو عمری لاہوری، شیخ وقت اور جلیل القدر عالم تھے۔ مشہور بزرگ فریدالدین مسعود اجودھنی (گنج شکر) کی اولاد سے تھے۔ لاہور میں پیدا ہوئے وہیں پرورش پائی اور اپنے والد شیخ کاکو (متوفی ۸۸۲ھ) سے اخذ علم کیا۔ شیخ کاکو، شیخ پیر محمد لاہوری کے فیض یافتہ تھے، پیر محمد کے علاوہ انھوں نے دیگر علمائے عظام سے بھی تعلیم حاصل کی۔[۶۵]

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں شیخ اسحاق کا ذکر بڑے عقیدت مندانہ انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

شیخ اسحاق کے والد کا نام شیخ کاکو تھا۔ لاہور کے لوگ شیخ اسحاق کے معتقد ہیں۔ وہ بڑے صاحب علم، متوکل اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ کبھی کسی کے دروازے پر نہیں گئے، نہ کسی سے کسی شئ کے طالب ہوئے۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مصروف رہتے۔ صوفی مشرب ہونے کے باوجود تمام علوم میں ماہر کامل تھے۔ ہر آن اللہ کی یاد میں مشغول رہتے۔ جب تک ان سے کوئی بات پوچھی نہ جاتی، اس وقت تک از خود بات نہ کرتے تھے۔

ایک دن ایک نامعقول شخص نے راستہ چلتے ہوئے ان کو پکڑ لیا اور کھیر کا ایک دیگچہ ان کے سر پہ رکھ دیا اور کہا، اس کو میرے ساتھ لے چل۔ حضرت نے بلا تامل و انکار اسے

---

۶۴ لطائف قدوسی ص ۵۴، ۵۵ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۳۲۔

۶۵ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۳۲، ۳۳۔

سر پہ اٹھا لیا اور بازار سے لے کر اس کے مکان تک پہنچا دیا۔ اسی دن سے اس کے دل سے کھوٹ نکل گیا اور وہ دنیاداری ترک کر کے ایک عالم دین بن گیا۔

ملا عبدالقادر مزید لکھتے ہیں :

مَیں نے ۹۹۵ھ میں شیخ موصوف سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ ایک دن میں نے شیخ فیضی سے، جسے ان ہی دنوں ملک الشعرا کا خطاب ملا تھا، مذکورہ بالا واقعہ بیان کیا۔ فیضی، جیسا کہ اس کی عادت تھی وہ ماضی وحال کے تمام علما و مشائخ کا مذاق اڑاتا تھا۔ حضرت کی بھی مذمت کرنے لگا۔ اس کی باتوں پر مَیں صبر کر کے خاموش ہو رہا۔ ٹھیک یاد نہیں وہی رات تھی یا دوسری، مَیں نے خواب میں دیکھا کہ شیخ ابوالفضل ایک جنگل میں کھڑا ہوا ہے اور ایک پرانے کھنڈر میں جس کی بس دو تین دیواریں کھڑی تھیں، شیخ اسحاق ان توپچیوں کی جماعت میں ہیں جو ہر چاند رات کو بادشاہی اعزاز میں بندوقیں سر کرتے ہیں انھوں نے بندوق اٹھا کر میری طرف چلا دی اور میرے چاروں طرف چنگاریاں بکھر گئیں ــــ یہ دیکھ کر مجھ پر خوف طاری ہو گیا اور مَیں جاگ اٹھا۔ دوسرے ہی دن شیخ کی خدمت میں نذر لے کر گیا، جسے انھوں نے قبول فرما لیا۔ مَیں نے اپنا خواب کا یہ قصہ بیان کیا تو کچھ نہ کہا، بس دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

وہ لاہور کے بہت سے مشہور علما کے استاذ ہیں، جیسے شیخ سعداللہ بنی اسرائیل جو اپنے زمانے کے بے مثل عالم ہیں اور شیخ منور وغیرہ۔

بدایونی آگے چل کر رقم طراز ہیں :

شیخ اسحاق کاکو جوانی میں شکار کے بڑے شوقین تھے، چنانچہ سبق پڑھانے سے جب فارغ ہوتے، باز، عقاب وغیرہ لے کر شکار کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور شکارگاہ میں پیدل ہی گھومتے رہتے۔ انھوں نے سَو سال سے زیادہ عمر پائی۔ ۹۹۶ھ میں انتقال فرمایا[۶۶]

---

[۶۶] منتخب التواریخ ص ۲۹۵، ۲۹۶۔ نیز ملاحظہ ہو طبقاتِ اکبری ج ۲ ص ۴۶۰، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۔

مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے ملا عبدالقادر بدایونی کے حوالے سے یہ سن وفات بھی لکھا ہے اور ساتھ ہی اخبار الاصفیا کے حوالے سے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ وہ ۲۹ ربیع الاول ۹۹۷ھ کو فوت ہوئے [۶۷]

۴۰۔ شیخ اسماعیل بن ابدال لاہوری

شیخ اسماعیل کا سلسلۂ نسب آٹھ واسطوں سے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک منتہی ہوتا ہے جو یہ ہے:

اسماعیل بن ابدال بن نصر بن محمد بن موسیٰ بن عبدالجبار بن ابو صالح بن عبدالرزاق بن شیخ عبدالقادر شریف جیلانی۔ یہ عالم اجل اور شیخ وقت تھے۔ اپنے عصر کے علمائے مشاہیر میں گردانے جاتے تھے۔ فقہ، اصولِ فقہ، کلام اور علوم عربیہ میں ان کو بہرۂ وافر حاصل تھا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد سے یہ پہلے بزرگ ہیں جو برصغیر پاک وہند میں تشریف لائے۔ ان سے قبل اس خاندان کے کسی بزرگ نے ہندوستان کا قصد نہیں کیا، اگر کیا بھی تو سکونت اختیار نہیں کی۔ یہ دارالسلطنت دہلی میں آئے اور عرصہ تک وہاں قیام پذیر رہے۔ پھر تھنبور منتقل ہو گئے اور وہیں فوت ہوئے۔ ان سے بے شمار علما و مشائخ نے کسبِ فیض اور اخذِ علم کیا، جن میں شیخ محمد بن حسن جون پوری، شیخ عبدالملک بن عبدالغفور پانی پتی المعروف بہ شیخ امان اللہ پانی پتی، علامہ جمال الدین لاہوری اور شیخ عبدالرزاق ساکن جھنجانہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

شیخ اسماعیل بن ابدال نے ۹۹۴ھ میں وفات پائی۔ تاریخ وفات ان اشعار سے نکلتی ہے۔

شد چو اسماعیل از دار البعث — مسکنِ خود یافت در دار السلام
رحلتش آمد عیاں ممتازِ وقت — نیز "اسماعیل مخدوم انام"
۹۹۴ھ — ۹۹۴ھ

[۶۷] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۳

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان کا سالِ وفات ۹۰۶ھ تحریر فرمایا ہے[۶۸]
شیخ اسماعیل بن ابدال کی نسبت لاہور کی طرف ہے اور یہ لاہوری مشہور ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لاہور میں رہے ہیں، مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ لاہور کب آئے اور کس زمانے میں یہاں سکونت پذیر ہوئے۔

۱۴۱۔ شیخ اسماعیل بن عبداللہ لاہوری

شیخ اسماعیل بن عبداللہ بن محمد حسنی اُچی ثم لاہوری، شیخ وقت، صالح عالم دین، نامور فقیہ اور نہایت متقی تھے۔ شہر اُچ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے والدِ گرامی شیخ عبداللہ سے تعلیم حاصل کی۔ پھر جلال الدین اکبر کے عہدِ حکومت میں واردِ لاہور ہوئے، اس نے ان کو ہزار بیگہ خراجی زمین عطا کی اور انھوں نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔
خزینۃ الاصفیا میں مفتی غلام سرور لاہوری رقم طراز ہیں کہ بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر ان کا بہت معتقد تھا۔ اس نے ان کو لاہور بلایا اور یہاں رہنے کی درخواست کی۔ علاقہ فیروز پور میں گزارے کے لیے ہزار بیگہ زمین بھی عطا کی۔

اکبر بادشاہ مشتاقِ دیدارِ پُرانوار آن جناب شد، و آن حضرت را در لاہور طلبیدہ، از غایت اعتقاد یک ہزار بیگہ زمینِ زرعی در علاقہ فیروز پور گزرانید و حضرتِ سید در لاہور بمقام لکھی محلہ ...... سکونت اختیار کرد۔

مگر وہ چوں کہ بدرجہ کمال مستغنی المزاج اور فقیر منش تھے، اس لیے زمین قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ جلال الدین اکبر کے عہد میں ۹۷۸ھ کو لاہور میں فوت ہوئے۔[۶۹]

---

[۶۸] اخبار الاخیار، ص ۲۰۸ — خزینۃ الاصفیا، ج ۱ ص ۱۳۵، ۱۳۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۳۶

[۶۹] خزینۃ الاصفیا، ج ۱ ص ۱۲۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۳۷

۴۲۔ شیخ اسماعیل بن محمد ملتانی

شیخ اسماعیل بن ابراہیم فتح اللہ ربیعی اسماعیلی ملتانی ثم بیدری، احمد آباد (بیدر) میں پیدا ہوئے، وہیں تربیت پائی اور اپنے والدِ گرامی شیخ ابراہیم سے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا۔ ایک عرصہ تک ان کی صحبت و ملازمت میں اور تصوّف و معرفت سے اس درجہ بہرہ یاب ہوئے کہ مرتبہ بلند کو پہنچے۔ بہت بڑے عالم، پرہیزگار اور فقیہ تھے۔ والد ماجد کی وفات کے بعد سلطان عماد شاہ نے ان کو علاقہ برار میں تشریف لانے کی دعوت دی جو انھوں نے قبول کر لی اور وہاں اس نے ایک قریہ عطا کیا، جس کا نام پتھری تھا وہیں اقامت پذیر ہو گئے اور وہیں ۱۳ رمضان ۹۸۵ھ کو وفات پائی[۱]

۴۳۔ علامہ اسماعیل نقشبندی لاہوری

شیخ علامہ اسماعیل لاہوری، حدیث اور فقہ کے جیّد علماء میں سے تھے اور حدیث میں سند عالی رکھتے تھے۔ کتاب و سنت کی کتابیں ایران میں شیخ الاسلام سیف الدین شہید ہروی اور شیخ جمال الدین عطاء اللہ حسینی محدّث سے پڑھیں۔ ۹۸۰ھ کو لاہور میں فوت ہوئے[۲]

۴۴۔ شیخ اللہ بخش گیلانی لاہوری

شیخ اللہ بخش بن محمد بن زین العابدین بن عبدالقادر حسنی اوچی لاہوری، مشہور عالم و فقیہ اور برصغیر پاک و ہند کے معروف مشائخ میں سے تھے، لاہور آئے اور یہیں اقامت گزین ہو گئے۔ اپنے دور کے مقتدائے خلائق تھے۔ خلقِ کثیر نے ان سے

---

[۱] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۷

[۲] اذکار ابرار، ص ۴۹۸ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۳۸

اخذِ فیض کیا۔ لاہور سے عازم بنگال ہوئے اور بنگال میں ہی ۹۹۴ھ کو وفات پائی۔[۱۵۲]

۴۵۔ شیخ اللہ بخش گجراتی

شیخ اللہ بخش چشتی گجراتی، فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں سے تھے اور متقی و صالح بزرگ تھے۔ طویل عرصہ تک درس و تدریس اور افادۂ طلبا میں مصروف رہے۔ پھر بحث و اشتغال سے کنارہ کش ہو کر سلوک و تصوف کی وادیوں میں آ گئے تھے۔ طریقۂ عشقیہ شطاریہ سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے شیخ محمد غوث گوالیاری سے اخذِ فیض کیا اور خاصی مدت تک ان سے منسلک و ملازم رہے۔ ایامِ تصوف میں صاحب وجد و حال بزرگ تھے، لیکن زندگی کے آخری دنوں میں ان کے اندر پھر انقلاب و تغیر کی لہر اٹھی اور قرآن و حدیث کے مطالعہ کو زندگی کا نصب العین ٹھہرا لیا اور شب و روز اسی میں بسر ہونے لگے۔ انھوں نے ۱۲ ربیع الثانی ۹۷۰ھ کو وفات پائی۔[۱۵۳]

۴۶۔ شیخ اللہ داد[۱۵۴] بن عبد اللہ جون پوری

شیخ اللہ داد بن عبد اللہ جون پوری دیارِ ہند میں اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی اور شیخ عبد الملک

---

[۱۵۲] اخبار الاخیار، ص ۲۰۶ بضمن حالات سید زین العابدین ــ خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۱۳۶ ــ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۳۹۔

[۱۵۳] اذکارِ ابرار ص ۴۰۱، ۴۰۲ ــ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۳۹

[۱۵۴] تذکرہ نگاروں نے ان کا نام الہداد لکھا ہے، لیکن درحقیقت یہ لفظ اللہ داد ہے، اس لیے آئندہ ہم اسے اللہ داد ہی لکھیں گے۔

جون پوری سے تعلیم حاصل کی جو اس دور کے جلیل القدر عالم اور ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے تلمیذ تھے۔ ان کو صرف ایک واسطے سے قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ حصولِ علم کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور علم و افتا اور تحقیق و تدقیق کی بلند منزلوں پہ پہنچے۔

میر سید غلام علی آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، مآثر الکرام اور وفیات الاعلام میں ان کا ذکر کیا ہے، اور ان کے اساتذہ میں شیخ عبداللہ تلنبی او شیخ عزیزاللہ تلنبی کے اسمائے گرامی درج کیے ہیں، لیکن نزہتہ الخواطر میں مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی اس سے اختلاف کرتے ہیں، ان کے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ شیخ عبداللہ تلنبی اور شیخ عزیزاللہ تلنبی دونو بزرگ سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں تلنبہ (ملتان) سے دہلی گئے اور یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ اللہ داد جون پور کی مسندِ تدریس پر فائز تھے اور ان کا شمار اس نواح کے کبار اساتذہ میں ہوتا تھا۔ لہٰذا ایسی صورت میں دہلی جا کر ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں کسی تذکرہ میں یہ بھی مرقوم نہیں ہے کہ انھوں نے تلنبہ جا کر ان سے استفادہ کیا ہو۔ البتہ ان دونوں بزرگوں سے ان کا لِقا ثابت ہے اور ایک دوسرے سے بحث مباحثہ کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ سکندر لودھی نے اپنی قلمرو کے تمام علما کو جمع کیا۔ ایک جانب سے تلنبہ کے شیخ عبداللہ اور شیخ عزیزاللہ اور دوسری طرف سے شیخ اللہ داد اور ان کے لڑکے شیخ بھکاری نے علمی مباحثہ کیا، جس سے معلوم ہوا کہ پہلے دو بزرگ تقریر میں اور دوسرے دو تحریر میں سب سے فائق تر ہیں۔ اگر یہ دونوں بزرگ ان کے استاذ ہوتے تو ان سے بحث و مناظرہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا، اس لیے کہ استاذ کے احترام کا تقاضا یہی ہے۔

شیخ اللہ داد جون پوری، تفسیر، فقہ، اصولِ فقہ اور علمِ نحو میں بے نظیر تھے اور ان علوم میں ان کے زمانے میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ وہ بیک وقت کئی خوبیوں کے حامل تھے، صاحبِ افتا بھی تھے، عظیم مصنف بھی تھے اور بلند مرتبے کے مصنف اور شارح بھی تھے

ان کی علمی ہمہ گیری اور وسعتِ مطالعہ کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر، فقہ اور نحو تینوں علوم کی بلند پایہ کتابوں پر حواشی تحریر کیے اور ان کی شرحیں لکھیں جس کی تفصیل یہ ہے :

۱- تفسیر مدارک التنزیل پر حواشی لکھے اور اس کے مشکل مقامات کی شرح سپرد قلم کی- یہ حواشی پوری تفسیر کے نہیں ہیں، بلکہ سورت نمبر ۱، ۱۱۳ اور ۳۷ کے ہیں- یہ کتاب انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے-

۲- ہدایہ کی شرح-

۳- اصول بزدوی کی شرح اور تعلیق-

۴- کافیہ پر حواشی اور اس کے اہم مقامات کی عقدہ کشائی-

۵- کافیہ کی شرح-

۶- حاشیہ علیٰ شرح جامی-

۷- قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی شرح کافیہ جو ایک بہترین شرح ہے اور حواشی ہندیہ کے نام سے معروف ہے، اس پر حواشی-

ان کے یہ علمی اور تدریسی و تصنیفی کارنامے ان کے اساتذہ و شیوخ کی زندگی میں نمایاں ہوکر اہلِ علم کے سامنے آگئے تھے-

شیخ اللہ داد، فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے اور بعد کو تصوف اور طریقت سے بھی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا، تصوف اور طریقت سے لگاؤ کی بھی ایک عجیب وجہ ہوئی- وہ یہ کہ اس زمانے کے مشہور بزرگ اور صوفی حامد شاہ مانک پوری جون پور میں تشریف لائے اور شیخ اللہ داد کے ہمدم و رفیق شیخ حسن طاہر ان کے مرید ہو گئے- شیخ اللہ داد کو یہ بات ناگوار گزری اور اپنے اس دوست سے کہا کہ تم نے حامد شاہ مانک پوری کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو کر طلبائے علم کے علمی وقار کو نقصان پہنچایا ہے- شیخ حسن طاہر نے شیخ حامد شاہ کے مرتبہ علم اور روحانیت کی بڑی تعریف کی مگر وہ اپنی رائے پر قائم رہے- بالآخر حسن طاہر نے کہا کہ آپ میرے ساتھ چلیے اور حامد شاہ کے علم و تحقیق

کا امتحان کر لیجیے ـــــــ شیخ اللہ داد نے ہدایہ کے چند مشکل مقامات ذہن میں مجتمع کیے اور ان کے حل و کشود کے لیے ان کی مجلس میں جا پہنچے۔ گفتگو ہوئی تو انھوں نے باتوں باتوں میں ہدایہ کے ان مقامات کی اس انداز سے تشریح کی کہ وہ حیران رہ گئے اور اسی وقت ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔

شیخ اللہ داد جون پوری نے ۹۲۳ھ کو جون پور میں وفات پائی۔[۷۵]

۴۷۔ مولانا اللہ داد بن کمال الدین لکھنوی

مولانا اللہ داد بن کمال الدین بن محمد بن محمد اعظم حسینی لکھنوی، شیخ وقت اور فاضل شخص تھے۔ ان کا شمار اس دور میں سرزمین ہند کے مشہور علما میں ہوتا تھا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے، وہیں بچپن کا زمانہ گزرا، اسی شہر میں شباب کی منزلیں طے کیں اور اسی کی فضا میں کہولت اور بڑھاپے کو پہنچے۔ لکھنؤ ہی کے علما سے اخذِ علم کیا اور پھر وہیں درس و افتا کی مسند پر فائز ہوئے اور کتابیں تصنیف کیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں، ان سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

وہ نہایت صاحبِ تصرف، ذہین، مستعد اور دانش مند عالم دین تھے۔ فقہ، اصولِ فقہ اور علوم عربیہ میں تو بالخصوص اس زمانے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ علم نحو میں انھوں

---

۷۵ اخبار الاخیار، ص ۱۹۷ ـــــ منتخب التواریخ ص ۸۶ ـــــ حدائق الحنفیہ ص ۳۶۴، ۳۶۵ ـــــ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۴۱، ۴۲ ـــــ خزینۃ الاصفیا ص ۴۱۲ ـــــ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۶۳۰، ۶۳۱ ـــــ مآثر الکرام ص ۷۶ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان ص ۴۳ ـــــ کشف الظنون ج ص ـــــ فضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب ص ۱۹۶ ـــــ ابجد العلوم ص ۸۹۴، ۸۹۵ ـــــ تجلی نور حصہ دوم از مولوی نور الدین جون پوری ص ۳۹، ۴۰۔

نے ایک رسالہ لکھا، جس کا نام ایک مقتدر حاکم کے نام پر "قبطون" رکھا تھا۔ اس کی عبارت انتہائی پُرتکلف تھی۔ میں حسین خاں کے عہدِ حکومت میں جب لکھنؤ گیا تو ان سے ملاقات کی۔ ان کی تصانیف میں دو چیزیں بڑی عجیب و غریب اور نادر تھیں۔ ان میں سے ایک رسالہ تھا، جس کا طول چودہ سطر کا تھا اور عرض بھی اتنی ہی سطور کا تھا۔ اس کے حاشیوں پر بھی مضمون تحریر تھا۔ اس رسالے میں چودہ علوم کے احکام و مسائل درج تھے۔ دوسرا ایک اور رسالہ تھا، جو مقاماتِ حریری کی طرز پر لکھا گیا تھا۔ اس کے پانچ حصے تھے۔ اس کا نام انھوں نے قیطون رکھا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ میری اور بھی تصانیف ہیں۔

بدایونی اس سے آگے مزید لکھتے ہیں:

ان کے چچازاد بھائیوں کا بیان ہے کہ یہ چودہ علوم پر مشتمل رسالہ اور رسالہ قیطون در اصل حکیم زبرقی کی تصانیف ہیں جو قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے زمانے میں جون پور آیا تھا اور بعض مسائل کے بارے میں ان سے اس کا مشہور مناظرہ و مباحثہ ہوا تھا اور وہ فحولِ علمائے عصر میں سے تھا۔ پھر وہ دونو رسالے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے شیخ اعظم لکھنوی کے کتب خانے میں پہنچے، شیخ اعظم شیخ اللہ داد کے والد تھے[۱۷] اور انھیں اہلِ علم کی طرف سے امام اعظم ثانی (امام ابوحنیفہ) کا خطاب ملا تھا۔ ان کی وفات کے بعد یہ رسالے وراثتاً میاں اللہ داد لکھنوی کے قبضے میں آئے اور آخر دم تک ان کے پاس رہے۔ انھوں نے ان کی تصنیف کو اپنی طرف منسوب کر لیا۔

---

[۱۷] شیخ اعظم ثانی لکھنوی، مولانا اللہ داد لکھنوی کے پردادا تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے شیخ اعظم ثانی بن شیخ ابوالبقا بن موسیٰ بن شیخ ضیاء الدین کرمانی۔ اپنے عصر کے متبحر عالم اور علوم ظاہری و باطنی میں یگانہ تھے۔ علمِ فقہ میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا اور فقہی مسائل کے متعلق بڑی صاف اور مدلل گفتگو کرتے تھے۔ اس علم سے متعلق کئی رسائل کے مصنف تھے۔ ان کے پردادا ہلاکو خاں کے زمانے میں کرمان سے برصغیر پاک و ہند میں آئے اور شاہ سمرقندی سے ملاقات کی غرض سے لکھنؤ پہنچے اور ان ہی کی وجہ سے اس شہر میں متوطن ہو گئے تھے۔ (تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳، ۲۴)

منتخب اللباب میں خافی خاں لکھتے ہیں کہ جب جلال الدین اکبر نے جون پور کا عزم کیا اور خان زمان خاں کی طرف روانہ ہوا تو لکھنؤ بھی گیا۔ وہاں اس نے مولانا اللہ داد سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور اس کا تذکرہ شیخ عبدالنبی گنگوہی سے کیا، انھوں نے ان کے فضل و کمال کی تعریف کی تو انھیں مولانا کی خدمت میں بھیجا اور پیغام دیا کہ بادشاہ ان سے ملاقات کا خواہاں ہے۔ وہ گئے مگر مولانا نے بادشاہ کے پاس جانے اور ان سے ملنے سے انکار کر دیا ـــــ نماز کا وقت آیا تو بادشاہ جامع مسجد میں گیا اور وہاں ان سے ملاقات کی۔ بادشاہ نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر ان سے منصبِ افتا پر فائز ہونے کی درخواست کی، جس کو منظور کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ ۹۸۰ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد وہ عمر بھر اسی منصب پر فائز رہے۔ انھوں نے ۹۹۱ھ میں وفات پائی[۷۵]

ب

۴۸۔ شیخ بایزید سندھی

میرک بایزید بن ابو سعید بن میر علی شاہ عرب شاہی سبزواری ثم سندھی سکھری، شیخِ عصر اور عالم و فقیہ تھے۔ ان کا شمار اس دور کے مشہور فضلا میں ہوتا تھا۔ اصلاً سبزوار کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے قندھار آئے، پھر شاہی بیگ ارغون قندھاری کے ساتھ ارضِ سندھ میں داخل ہوئے اور سکھر اور بھکر دو شہروں کے شیخ الاسلام مقرر کیے گئے۔ اس زمانے میں سکھر میں سکونت اختیار کر لی تھی[۷۶]

---

۷۵ منتخب التواریخ ص ۷، ۳۰۸، ۳۰ ـــــ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵، ۲۶ ـــــ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۴۲، ۴۳

۷۶ تحفۃ الکرام ص ۲۰۴ ـــــ نزہۃ الخواطر، ج ۱ ص ۴۸۔

۴۹- شیخ بدرالدین گجراتی

شیخ بدرالدین بن جلال الدین گجراتی حنفی المسلک تھے۔ گجرات میں پیدا ہوئے وہیں پلے بڑھے اور اپنے والد مکرم شیخ جلال الدین سے علم حاصل کیا۔ شیخ جلال الدین نے اپنے باپ شیخ محمد سے اور شیخ محمد نے اپنے باپ علامہ شیخ کمال الدین دہلوی سے اخذِ علم کیا ــــ شیخ بدرالدین عالم و فقیہ، صحیح العقیدہ صوفی اور صاحبِ کشوف و کرامات بزرگ تھے[۲] افسوس ہے، ان کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔

۵۰- شیخ بدرالدین حسینی اکبرآبادی

شیخ بدرالدین بن جلال الدین اکبرآبادی ۹۴۳ھ کو اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے اور شیخ جلال الدین بن عبداللہ اکبرآبادی اور شیخ ابوالفتوح بن عبدالغفور تھانیسری سے اخذِ علم کیا۔ بہت بڑے عالم و فقیہ تھے اور اپنے دور کے فحول علما میں سے تھے تصوّف و طریقت سے بھی تعلق تھا۔ اپنے والد شیخ جلال الدین اکبرآبادی کے بعد مسندِ مشیخت پر متمکن ہوئے۔ نہایت قانع، عفیف اور زیورِ صلاح و تقویٰ سے آراستہ تھے پچپن ۵۵ سال کی عمر پاکر ۲۹ ربیع الاول ۹۹۸ھ کو فوت ہوئے[۳]

۵۱- شیخ برہان الدین کالپوی

شیخ برہان الدین بن تاج الدین کالپوی، شیخِ صالح اور فقیہ وقت تھے اور کبار مشائخ میں شمار کیے جاتے تھے۔ شیخ عبدالملک بن ابراہیم کالپوی سے اخذِ علم کیا اور عرصہ تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔ پھر لوگوں سے منقطع ہو کر گھر میں گوشہ گیر ہو کر بیٹھ گئے۔ زندگی کے آخری دم تک گھر سے باہر نہیں نکلے۔ حتیٰ کہ دفن بھی گھر ہی میں کیے گئے

۲ھ نزہتہ الخواطر، ج ۴، ص ۵۱ بحوالہ مجمع الابرار

۳ھ اذکار ابرار، ص ۳۸۲، ۳۸۳ ــ نزہتہ الخواطر، ج ۴ ص ۵۱

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں بڑے احترام سے ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کے الفاظ کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے :

شیخ برہان الدین بڑے زاہد، متوکل، گوشہ نشین اور مستغنی بزرگ تھے۔ کہتے ہیں، وہ میاں اللہ داد کی صحبت میں، جن کا سلسلہ ایک واسطے سے سید محمد جون پوری سے ملتا ہے، صرف تین دن رہے اور فقر و غنا کا وہ فیض حاصل کیا کہ درجۂ کمال کو جا پہنچے۔ نہایت عبادت گزار اور صاحبِ حضور تھے۔ تقریباً پچاس سال تک گوشت بلکہ بہت سی چیزوں کا کھانا پینا ترک کیے رکھا، صرف تھوڑے سے دودھ اور مٹھاس پر گزر کرتے رہے۔ آخری عمر میں تو پانی تک ترک کر دیا تھا۔ نظر بظاہر بس ایک روحانی اور نورانی مجسمہ دکھائی دیتے تھے۔ کالپی میں ان کا حجرہ نہایت تنگ و تاریک تھا۔ اس حجرے میں وہ ہمیشہ ذکر و فکر اور مراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔ عربی علوم نہیں پڑھے تھے[۴۵] پھر بھی قرآن مجید کی تفسیر اس بلاغت کے ساتھ بیان کرتے کہ حیرت ہوتی تھی، ان کی صحبت میں دلوں کو کھول دینے والا اثر تھا۔

ملا عبدالقادر، ان سے خود اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

میں جب چنار کے سفر سے لوٹا، ۹۶۷ھ کا کوئی مہینہ تھا اور عبداللہ ازبک کا دور دورہ تھا، ایک رات شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا، بڑی پہنچی ہوئی باتیں کیں اور اپنے ہندی اشعار جو وعظ و نصیحت، تصوف اور توحید و تجرید کے مضامین پر مشتمل تھے، سنائے۔

دوسرے دن مہر علی سلدوز جو درویش دوستی کی صفت کے باوجود پورا ترکی تھا اور مردم آزاری اور ستم رانی سے باز نہیں آتا تھا، میرے ساتھ شیخ کی ملاقات کے لیے گیا۔ عجیب اتفاق ملاحظہ ہو، کہ جب وہ چلنے لگا تھا تو اس نے اپنے خدمت گاروں اور ملازموں کی خوب پٹائی کی تھی، اور ان کو مغلظ گالیاں دی تھیں۔ جب ہم شیخ کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے سب سے پہلے جو

---

[۴۵] مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر میں انھیں فقیہ قرار دیا ہے ظاہر ہے، اگر وہ عربی علوم کے عالم نہ تھے تو فقیہ کیوں کر ہو گئے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ علوم عربیہ میں بہت زیادہ عبور اور مہارت نہ رکھتے ہوں۔

بات بیان کی وہ یہ حدیث تھی:

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے، جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

یہ حدیث پڑھ کر انھوں نے اس کے نکات کی بڑی عالمانہ اور دلکش پیرایہ میں تشریح کی۔ اس سے مہر علی پر ایسا اثر ہوا کہ وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے کیے پر نادم اور شرمندہ ہو کر توبہ کرنے لگا۔ شیخ سے دعا کی درخواست کی۔ کچھ نذرانہ بھی پیش کیا، جو شیخ نے قبول نہ کیا۔

بدایونی آخر میں لکھتے ہیں:

شیخ ممدوح کی عمر سو سال ہوئی ہے۔ ۹۷۰ھ میں رحلت فرمائی۔ میں نے ان کی تاریخ اس مصرع سے نکالی ہے ؎

دل گفت کہ شیخ اولیا بود[۵۵]

۵۲۔ قاضی برہان الدین گجراتی

قاضی برہان الدین نہروالی گجراتی، شیخ شہاب الدین گجراتی کی اولاد سے تھے، شیخ وقت، عالم و فاضل اور محدث و فقیہ تھے۔ ان کا شمار ان مشہور اساتذہ میں ہوتا تھا جنھوں نے پہلے پہل علاقہ گجرات میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور علوم کی نشر و ذیوع کا ذریعہ بنے۔ تمام عمر درس و افادہ میں مصروف رہے اور بے شمار تشنگانِ علوم نے ان سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ ان کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ برصغیر پاک و ہند کے دسویں صدی ہجری کے نامور عالم، عظیم فقیہ اور مشہور معلم و مدرس تھے[۵۶]

---

۵۵ منتخب التواریخ ص ۲۷۹، ۲۸۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۵۴، ۵۵۔ اذکار ابرار، ص ۳۰۵

۵۶ یادِ ایام ص ۷۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۵۵ بحوالہ ظفر الوالہ

۵۳۔ مولانا برہان الدین ملتانی

مولانا برہان الدین ملتانی حنفی المسلک تھے۔ فاضل بزرگ تھے اور فقہ، اصولِ فقہ اور علومِ عربیہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ مشرقی پنجاب کے مشہور شہر حصار میں مسندِ تدریس پر فائز تھے۔ ان میں بے شمار علما و طلبا نے اخذِ علم کیا۔ شیخ عبداللہ بن بہلول سندیلوی گجراتی نے بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو کر حصار میں تفسیر اور بعض کتب درسیہ پڑھی تھیں۔ بعد ازاں ان کے ساتھ مولانا نے گجرات کا سفر بھی کیا تھا۔[۵۷]

۵۴۔ شیخ بلال محدّث سندھی

شیخ بلال سندھی عالمِ کبیر اور محدثِ وقت تھے۔ تفسیر اور حدیث کے بہت اونچے مرتبے کے علما میں سے تھے۔ شریعتِ مطہرہ کے بدرجہ غایت پابند اور عامل کتاب و سنت تھے۔ تصوّف و طریقت میں بھی بہرہ وافر حاصل تھا، اس ضمن میں ان سے بہت سے کشوف و کرامات کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔[۵۸]

۵۵۔ شیخ بہاء الدین انصاری جینیدی

شیخ بہاء الدین بن ابراہیم بن عطاء اللہ انصاری شطاری جینیدی، مشرقی پنجاب کے شہر جینید کے رہنے والے تھے، جو ریاست جینید کا دارالخلافہ تھا۔ ان کی جائے پیدائش بھی جینید تھی، اور نشوونما بھی اسی شہر میں ہوئی۔ بہت بڑے عالم، شیخ، فقیہ، علوم عربیہ اور اصولِ فقہ کے ماہر کامل تھے۔ متعدد مشائخ و علما اور بزرگانِ دین کی صحبت و ملازمت میں رہے اور اس سلسلے میں بہت سے بلاد و

---

۵۷ اذکار ابرار، ص ——— نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۵۶

۵۸ اذکارِ ابرار، ص ۳۷۵ ——— نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۵۶

قصبات میں گھومے پھرے۔ حج و زیارت کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے اور حرم شریف میں شیخ احمد الشریف جیلانی شافعی سے طریقۂ قادریہ کے مطابق اخذِ فیض کیا۔ بعد ازاں مراجعت فرمائے ہند ہوئے اور حاکمِ مالوہ سلطان غیاث الدین خلجی کے عہد میں مانڈو آئے۔ وہاں عرصہ تک قیام فرما رہے۔ پھر احمد آباد کے شہر بیدر کا سفر کیا۔ اذکار و اشغال کے موضوع پر شیخ ابراہیم بن معین الدین ایرجی کے لیے ایک رسالہ بھی تصنیف کیا۔ ۹۲۱ھ میں وفات پائی۔ ان کی قبر الہٰ آباد میں ہے [۵۹]

۵۶۔ شیخ بہاء الدین عمری جون پوری

شیخ بہاء الدین کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ بہاء الدین بن خلق اللہ بن مبارک بن احمد بن ابو الخیر بن نصر اللہ بن محمود بن محمد بن شیخ حمید الدین عمری ناگوری ثم جون پوری، اپنے وقت کے فقیہ، عالم، محدث اور شیخ تھے۔ شیخ محمد بن عیسیٰ جون پوری کے شاگرد تھے۔ علومِ عالیہ میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ تصوّف و طریقت سے بھی دلچسپی تھی اور اس سلسلے میں شیخ حامد شاہ مانک پوری کے فیض یافتہ تھے۔ گنج ارشدی میں شیخ غلام رشید کے بیان کے مطابق سات سال شیخ حسین بالادستی کے ساتھ رہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب شیخ حسین جون پور میں مقیم تھے۔ ان کے بالادست تشریف لے جانے کے بعد سترہ سال شیخ محمد بن عیسیٰ جون پوری کی صحبت و ملازمت میں بسر کیے۔ پھر شیخ حامد شاہ مانک پوری سے منسلک ہو گئے۔ نو سال ان کی خدمت میں گزارے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد مشائخ اور بزرگانِ دین سے استفاضہ کیا۔

بعد ازاں عازم حرمین شریفین ہوئے اور تین سال مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے۔ یہ تین سال انھوں نے سب سے علیحدگی و انزوا اختیار کر کے جبل ابی قبیس پر بسر کیے۔ جبل ابی قبیس سے صرف نماز کے اوقات میں نیچے اترتے اور مسجد حرام میں نماز ادا کرتے۔

---

[۵۹] اخبار الاخیار، ص ۱۹۸ تا ۲۰۰ ــــ نزہتہ الخواطر، ج ۴ ص ۵۹، ۶۰

ان کی عمر سو سال سے متجاوز ہو چکی تھی لیکن بینائی بالکل صحیح تھی اور اس عمر میں بھی عینک استعمال کرنے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ مکہ مکرمہ میں حدیث پڑھی اور عالی سند حاصل کی۔ وہاں طریقہ نقشبندیہ کے مطابق شیخ کمال الدین اسماعیل شروانی سے کسب فیض کیا۔ اور کافی عرصہ ان کی صحبت میں رہے۔ شیخ کمال الدین اسماعیل شروانی، شیخ کبیر عبید اللہ احرار کے فیض یافتہ تھے۔

شیخ بہاء الدین جون پوری کی حدیث سے محبت اور دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ دن رات حدیث کی مختلف کتابوں کے مطالعہ میں مصروف رہتے۔

ان کی ایک تصنیف بھی ہے، جس کا نام ارشاد السالکین ہے، یہ کتاب اپنے موضوع میں نہایت مفید اور عمدہ کتاب ہے۔

اس عالم دین نے ۲۶ رمضان کو، ایک روایت کے مطابق ۴ جمادی الاولیٰ ۹۱۱ھ کو وفات پائی [۱۰]

۵۷- شیخ بہاء الدین گجراتی

شیخ بہاء الدین بن معز الدین بن شہاب الدین خطابی گجراتی، شیخ صالح اور فقیہ تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بھائی نفیل بن خطاب قریشی کی اولاد سے تھے۔ احمد آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طریقت بھی تھے۔ انھوں نے عمر کا طویل حصہ سیر و سیاحت میں بسر کیا۔ ہندوستان سے باہر بھی گئے۔ ہند میں واپس آکر آٹھ سال گجرات میں مقیم رہے۔ پھر برہان پور چلے گئے اور وہاں بہت بڑی خانقاہ تعمیر کی اور تمام عمر اسی خانقاہ میں عبادتِ الٰہی میں گزار دی۔ ۹۱۲ھ میں وفات پائی [۱۱]

---

[۱۰] اخبار الاخیار، ص ۱۹۷، ۱۹۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۶۰، ۶۱ — تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۲۶۴، ۲۶۵

[۱۱] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۶۲، ۶۳ بحوالہ گلزار ابرار

پ

۵۸- شیخ پیر محمد گجراتی

شیخ پیر محمد کا سلسلۂ نسب مشہور صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص تک پہنچتا ہے جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ وہ سلسلۂ نسب یہ ہے: پیر محمد بن جلال الدین بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن ابراہیم بن جعفر بن جلال بن محمود بن عبداللہ بن عبدالحمید بن عبدالرحمن بن عثمان بن مصعب بن ابان بن عامر بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔

شیخ پیر محمد رحمۃ اللہ علیہ موضع جانپانیر میں پیدا ہوئے جو اعمالِ گجرات میں واقع تھا۔ وہیں نشو و نما پائی اور اپنے زمانے کے اساتذہ سے اخذِ علم کیا۔ پھر حرمین شریفین کا سفر کیا اور حج و زیارت سے متمتع ہوئے۔ واپس آئے تو شیخ محمد غوث گوالیاری سے طریقت و تصوف کی تعلیم حاصل کی، ایک عرصہ تک ان سے منسلک رہے اور ان کے بعد مسندِ مشیخت پر فائز ہوئے۔ شیخ پیر محمد گجراتی عالم و فقیہ بھی تھے اور سلوک و تصوّف سے بھی وابستگی رکھتے تھے۔ انھوں نے ۹۶۹ھ کو وفات پائی۔[1]

ت

۵۹- شیخ تاج الدین مندوی

شیخ تاج الدین یوسف بن کمال الدین قرشی رنتھنبوری ثم مندوی مالوی ۸۸۵ھ کو رنتھنبور میں پیدا ہوتے اور وہیں پلے بڑھے۔ شیخِ وقت، صالح عالمِ دین اور فقیہِ زمان تھے۔ اس کے ساتھ ہی طریقت و صلاح میں بھی ایک مقام رکھتے تھے اور مشہور مشائخ میں سے تھے۔ حصولِ علم سے فارغ ہوئے تو مانڈو تشریف لے گئے۔ وہ سلطان ناصر الدین شاہ خلجی کا عہد تھا۔ سلطان ان سے نہایت اکرام و توقیر سے پیش آیا،

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۶۶ بحوالہ تاریخ دکن از عبدالجبار آصفی۔

عزت سے ٹھہرایا اور ہر ممکن طریق سے ان کی امداد کی۔ شیخ تاج الدین مندوی نے ۹۵۰ھ میں انتقال کیا۔[1]

۶۰۔ مولانا تقی الدین پنڈوی

وزیر کبیر مولانا تقی الدین بن عین الدین پنڈوی، محدث اور فقیہ تھے۔ سلطان مبارک نے ازراہِ تکریم ان کو "ملّا" کا لقب دیا تھا، ان کے والد مولانا عین الدین کو مجلس مختار اور ان کے دادا کو مجلس سرور کا خطاب عطا کیا تھا۔ وہ علاقہ بنگال میں نصرت شاہ اور ان کے والد حسین شریف مکی کے عہد میں طویل مدت تک منصبِ وزارت پر متمکن رہے۔ بنگال کے مختلف شہروں میں انھوں نے بہترین اور یادگار عمارتیں تعمیر کیں، جن میں شہر سنار گاؤں میں ایک بہت بڑی مسجد بھی ہے۔ یہ مسجد انھوں نے ۹۲۹ھ میں تعمیر کی تھی۔ اس کے آثار ابھی تک باقی ہیں۔[2]

ج

۶۱۔ شیخ جعفر بن میران سندھی

شیخ جعفر بن میران بوبکانی سندھی بلادِ سیوستان کے ایک شہر بوبک میں پیدا ہوئے اور خالص علمی ماحول میں پرورش پائی۔ اپنے دور کے عالمِ کبیر اور شیخ تھے۔ ان کا شمار علاقہ سندھ کے مشہور فقہا میں ہوتا تھا۔ ان کے والد شیخ میران بوبکانی کا سلسلہ درس جاری تھا جس میں بے شمار علما و طلبا نے استفادہ کیا۔ مستفیدین کی جماعت میں شیخ طاہر بن یوسف سندھی برہان پوری بھی شامل ہیں۔

شیخ جعفر نے اپنے باپ (شیخ میران) سے تحصیل کی۔ جہاں یہ علومِ شرعیہ میں

---

[1] اذکارِ ابرار ص ۲۴۹ تا ۲۵۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۶۸، ۶۹

[2] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۶۸، ۶۹

معلومات تامہ رکھتے تھے، وہاں حکمت، فلسفہ، ادب و انشا، منطق و نجوم و جفر میں بھی ماہر تھے۔ لیکن آخر عمر میں ان علوم سے دلچسپیاں ختم کردی تھیں اور کتب حدیث و تصوّف کے مطالعہ میں منہمک ہوگئے تھے۔ یہاں یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ تصوّف میں کامل اشتغال کے باوجود مسائل شرعیہ میں میلان طبع شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی آرا و تحقیقات کی طرف تھا۔

شیخ جعفر بوبکانی مخدوم نوح کے ہم عصر تھے، جامع کمالات اور مقتدر عالم دین تھے۔ تحفۃ الکرام میں مخدوم نوح اور شیخ جعفر کے بارے میں یہ واقعہ مرقوم ہے کہ ایک روز مخدوم نے کہا: "میں نے اللہ تعالیٰ کو ان آنکھوں سے دیکھا ہے"۔ شیخ جعفر نے جواب دیا: "ان آنکھوں سے نہ دیکھا ہوگا۔ اس کیفیت کو واضح کرنے کے لیے آپ کو چاہیے کہ جب ایسی حالت آپ پر طاری ہو تو کسی خادم کو اپنی آنکھیں بند کرنے کا حکم دیں۔ اگر اس کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کا دیدار قائم رہے تو پھر یقین کیجیے کہ یہ آنکھ، وہ ظاہری آنکھ اور یہ دیدار، وہ عام دیدار نہیں ہے"۔

مخدوم نوح نے یہ تجربہ کرنے کے بعد فرمایا: "اگر جعفر نہ ہوتا تو نوح کافر ہو جاتا۔"

شیخ جعفر بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصنیفات میں شامل ہیں:

۱۔ المتانۃ فی مرمۃ الخزانۃ۔ ان کی یہ تصنیف فقہی اور علمی اعتبار سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا اصل باعث گجرات کے ایک عالم دین قاضی جگن گجراتی (متوفی ۹۲۰ھ) کی تصنیف، خزانۃ الروایات ہے۔ یہ کتاب فروع حنفیہ کو محیط ہے، لیکن محققین کے نزدیک یہ کتاب غیر مستند، غیر معتبر اور ناقابل اعتماد ہے اور رطب و یابس کا پلندہ ہے۔ علامہ مخدوم جعفر بوبکانی نے المتانۃ کی تصنیف کے وقت اس کتاب کو سامنے رکھا اور وہ تمام مواد اس سے نکال دیا جو سند و اعتبار کے نقطۂ نظر سے قطعی ناقابل اعتنا ہے۔ اس کے بجائے انھوں نے مفتی بہا مسائل اور قوی روایات کا اضافہ فرمایا۔ اس محنت و کاوش کے بعد یہ کتاب

المتانتہ فی مرمتہ الخزانۃ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اب اس کتاب کو بجا طور پر کبارِ اعلامِ فقہ کے نزدیک معتبر اور مستند قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۲ء (۱۳۸۱ھ) میں سندھی ادبی بورڈ کراچی (لجنۃ احیاء الادب السندی) کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس پر مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی سندھی نے مبسوط اور معلومات افزا مقدمہ تحریر کیا ہے۔ یہ خالص فقہی نوعیت کی کتاب ہے۔ اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ جعفر بوبکانی شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہ کے افکار و آرا سے بہت متاثر تھے۔

۲۔ حل العقود فی طلاق السنود: یہ علامہ ممدوح کی ایک عجیب و غریب تصنیف ہے۔ اس میں باشندگانِ سندھ کے طلاق دینے کے طریقے اور شرعی احکام بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بعض قدیم کتب خانوں میں موجود ہے۔ اس سے دسویں صدی ہجری کے سندھی تمدن اور زبان پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

۳۔ الصادق المنصف المحق بالدلائل التی ھی بالتقدیم احری واحق: یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔

۴۔ حاصل النہج۔ یہ فارسی زبان میں ایک رسالہ ہے۔

۵۔ نھج التعلیم۔

۶۔ عجالۃ النافعین۔

۷۔ حل العقود۔

افسوس ہے، شیخ جعفر بوبکانی کے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے [1]

---

[1] تحفۃ الکرام ص ۴۵۹، ۶۰۴ مقدمۃ المتانۃ فی مرمۃ الخزانۃ (از مولانا ابوسعید غلام مصطفےٰ سندھی)۔ اذکار ابرار، ص ۴۳۷، ۳۷۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۶۹، ۷۰، ۳۔ تاریخ معصومی ص ۲۷۸۔ کشف الظنون ج ۱ ص ۷۰۲۔ النافع الکبیر ص ۱۲۔ یادِ ایام ص ۵۴۔ برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ ص ۲۲۲، ۲۲۳۔

۶۲ - قاضی جگن گجراتی

قاضی جگن گجراتی حنفی المسلک تھے، معروف عالم و شیخ اور مشہور فقیہ تھے۔ علاقۂ گجرات کے ایک قصبہ "کن" کے رہنے والے تھے۔ فقہِ حنفی کے مسائل پر مشتمل ان کی ایک مبسوط اور مفصل تصنیف ہے، جو خزانۃ الروایات کے نام سے موسوم ہے۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس کو غیر مستند اور غیر معتبر کتاب قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ قاضی موصوف نے مسائل جمع کرنے اور روایاتِ غریبہ کو اکٹھا کرنے میں عمر کھپا دی۔ اس کتاب کا آغاز انھوں نے کتب العلم سے کیا ہے، کیوں کہ ان کو اشرف العبادات کی حیثیت حاصل ہے۔

کے بارے میں حاجی خلیفہ کے الفاظ یہ ہیں:

خزانۃ الروایات فی الفروع - للقاضی جکن الحنفی الهندی، الساکن کن من الگجرات وهو مجلد اوله الحمد لله الذی خلق الانسان وعلمه البیان الخ ذکر فیه انه افنی عمره فی جمع المسائل وغریب الروایات وابتدأ بکتب العلم لانه اشرف العبادات[۲]

مولانا عبد الحی فرنگی محلی لکھنوی نے بھی اس کتاب کے متعلق اظہارِ رائے کیا ہے وہ فرماتے ہیں۔

انه من الکتب الغیر المعتبرة، لانه مملو من الرطب والیابس مع ما فیه من الاحادیث المخترعة والاخبار المختلفة[۳]

یعنی یہ کتاب (خزانۃ الروایات) کتب غیر معتبرہ میں سے ہے، اس لیے کہ یہ رطب و یابس سے بھری ہوئی ہے، اس میں موضوع احادیث اور مختلف فیہ روایات درج کی گئی ہیں۔

---

[۲] کشف الظنون ج ۱ ص ۷۰۲ [۳] النافع الکبیر ص ۱۲

بہر حال قاضی جگن گجراتی کی یہ تصنیف جو خزانۃ الروایات کے نام سے معروف ہے اور مسائلِ حنفیہ کو محیط ہے، اہلِ علم کے نزدیک ناقابلِ اعتماد اور غیر مستند ہے۔ علامہ مخدوم جعفر بوبکانی سندھی نے اپنی کتاب "المتانۃ" کی تصنیف کے وقت اس کتاب کو پیشِ نگاہ رکھا اور اس سے غیر معتبر مسائل اور غیر مستند مواد کو نکال دیا اور اس کے بجائے مفتیٰ بہا مسائل اور قوی روایات کا اضافہ کیا۔ انھوں نے اس میں سے ایک نئی فقہی کتاب تصنیف کی، جس کا نام المتانۃ فی مرمۃ الخزانہ رکھا۔ اس کا ذکر علامہ جعفر بوبکانی کے ترجمہ میں کیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں جو کتبِ فقہیہ معرضِ تحریر میں آئیں، یہ کتاب ان سب کے مندرجات و اقتباسات کا مجموعہ ہے اور مرتب نے ان کتابوں کا عام طور پر حوالہ دیا ہے۔ اس کی ترتیب بھی اس نوع کی دوسری کتابوں جیسی ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ شروع میں کتاب العلم کے عنوان سے ایک مقدمہ تحریر کیا گیا ہے۔ مصنف نے یہ واضح کیا ہے کہ فقہ کے مطالعے اور دینی مسائل کی تحقیق سے ان کو تمام عمر گہری دلچسپی رہی اور اس کے نتائج کو انھوں نے ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔

کتاب العلم میں انھوں نے علم اور علما کی فضیلت بیان کی ہے۔ وہ خود حنفی تھے۔ اس لیے امام ابوحنیفہؒ کے اوصاف و فضائل پر بھی ایک مقالہ قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے فتاویٰ اور مفتی سے متعلق فنی نکات کی بھی تشریح کی ہے اور اصولِ فتاویٰ کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ شرطِ اولیں یہ ہے کہ فتاویٰ قرآن اور حدیث سے اخذ کردہ دلائل قطعیہ پر مبنی ہوں۔ اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو پھر فتاویٰ امام ابوحنیفہؒ کے فیصلوں اور اس کے بعد امام ابویوسف اور امام محمد کے فیصلوں کے مطابق ہوں۔ اگر امام ابوحنیفہ اور ان کے دونوں شاگردوں کی آرا میں اختلاف ہو تو پھر مفتی کو اختیار ہے کہ جس رائے کو چاہے راجح ٹھہرائے لیکن اگر کسی شاگرد کی رائے استاد کی رائے کے مطابق نہ ہو تو پھر ان کی رائے کو ترجیح دی

جائے۔ بجز اس صورت کے کہ مستند فقہا نے استصلاح کے پیش نظر دونوں شاگردوں میں سے کسی ایک کی رائے کو قبول کیا ہو۔ اگر مفتی کو کوئی مستند حدیث مل جائے اور وہ اس کے اطلاق کے بارے میں مطمئن ہو تو پھر امام ابوحنیفہ کی رائے نظر انداز کر دی جائے، کیوں کہ خود ان کا یہ مشہور قول ہے کہ اگر میری رائے مستند حدیث کے خلاف ہو تو اس کو نظر انداز کر دو[۴]

قاضی جگن گجراتی کے سالِ ولادت کا تو علم نہیں ہو سکا، البتہ ان کا سنِ وفات ۹۲۰ھ ہے۔ یہ چار بھائی تھے اور چاروں منصبِ قضا پر متعین تھے[۵]

مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی "یادِ ایام" میں قاضی جگن کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

قاضی جگن گجرات کے بہت بڑے عالم تھے، مگر ان کا نام و نسب تک محفوظ نہیں۔ قاضی چلپی نے کشف الظنون میں لکھا ہے کہ قاضی جگن گجرات کے قصبہ کن میں رہتے تھے۔ حیف ہے کہ ایک شخص قسطنطنیہ میں بیٹھ کر بتائے کہ یہ کہاں کے رہنے والے تھے اور خود گجرات والے اتنا بھی نہ جانتے ہوں۔ فقہ حنفی میں ان کی کتاب خزانۃ الروایات بہت مشہور کتاب ہے مگر علمائے احناف اس کی روایتوں کو معتبر نہیں سمجھتے۔ تقریباً ۹۲۰ھ میں انھوں نے رحلت کی[۶]

۶۳۔ شیخ جلال الدین اکبر آبادی

شیخ جلال الدین بن عبداللہ بن یوسف اکبر آبادی، ۹۲۳ھ میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور اپنے والد مکرم شیخ عبداللہ بن یوسف سے علوم عربیہ، فقہ اور

---

[۴] عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ ص ۹۱۔

[۵] ملاحظہ ہو: مقدمہ المتانہ فی مرمۃ الخزانۃ ـــ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۸۲۔ یادِ ایام ص ۶۲ ـــ برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ ص ۲۲۵۔

[۶] یادِ ایام ص ۶۲۔

نحو کی تعلیم حاصل کی منطق وحکمت کے لیے علامہ ابوالبقا بن عبداللہ خراسانی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ابھی بیس سال کی عمر کو نہیں پہنچے تھے کہ فارغ التحصیل ہو گئے اور مسندِ تدریس کو زینت بخشی۔ ان کی علمی شہرت دُور دراز تک پھیل گئی اور ان کا شمار اپنے عصر کے کبیر اور مشہور علما میں ہونے لگا۔ جن حضرات نے ان سے اخذِ علم کیا، ان کی تعداد بہت وسیع ہے، ان میں قاضی جلال الدین ملتانی، شیخ افضل محمد انصاری، شیخ بدرالدین بن جلال الدین حسینی اور خلق کثیر شامل ہے۔ اس شیخِ وقت اور عالمِ دین نے ۱۶ ذی القعدہ ۹۶۱ھ کو اکبر آباد (آگرہ) میں وفات پائی۔[۵۷]

دسویں صدی ہجری کے اس عالم وفقیہ کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔

۶۴۔ شیخ جلال الدین جماکی دہلوی

شیخ جلال الدین بن فضل اللہ دہلوی، دارالسلطنت دہلی میں پیدا ہوئے۔ ظاہری علوم کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد شیخ سماء الدین ملتانی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، طویل مدت تک ان کی صحبت میں رہے اور تصوّف وطریقت سے بہرہ ور ہوئے۔ پھر بغداد، مصر، دمشق، شیراز، ہرات، بلادِ اندلس، اردستان اور خراسان وغیرہ کا سفر کیا اور ائمہ فن سے ملاقات کی، جن میں شیخ جلال الدین محمد بن اسعد دوّانی، مولانا عبدالرحمٰن جامی، شیخ عبدالغفور لاری، محمد حنفی، احمد اندلسی اور نظام الدین شیرازی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اس اثنا میں وہ حجاز بھی گئے، حج وزیارت سے مشرف ہوئے اور شیخ شہاب الدین احمد ابن حجر ہیثمی مکّی سے علم حاصل کیا۔ پھر مراجعت فرمائے ہند ہوئے اور سب اطراف سے منقطع ہو کر گھر میں بیٹھ گئے اور زہد وعبادت کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔

---

۵۷ اذکارِ ابرار، ص ۱۳۱، ۲۶۸، ۲۶۹ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۷۰، ۷۱۔

بڑے عالم وفاضل بزرگ تھے۔ شاعر بھی تھے، جمالی تخلص کرتے تھے مغل بادشاہ ہمایوں ان کا بہت معتقد تھا اور ان کی دین داری اور تقویٰ وصلاح سے انتہائی متاثر تھا۔ اس نے کئی دفعہ ان کو عہدۂ صدارت پیش کیا مگر انھوں نے قبول نہیں فرمایا۔ فارسی میں ان کا ایک دیوان بھی ہے جس کا نام مہر و ماہ ہے، ان کی تصانیف میں مرآۃ المعانی اور سیر العارفین شامل ہیں۔ سیر العارفین مختلف مشائخ کے حالات اور سوانح پر مشتمل ہے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

مارا زخاک کویت پیراہن است برتن
آں ہم زآب دیدہ صد چاک تا بدامن

اس عالم دین اور معروف شاعر نے ۱۰ ذی القعدہ ۹۴۲ھ کو وفات پائی۔[۵۸]

۶۵۔ شیخ جلال الدین تھانیسری

شیخ جلال الدین بن محمود عمری تھانیسری، مرد صالح اور کبار مشائخ میں سے تھے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ بحث و اشتغال کو اس انداز سے مطمح نظر ٹھہرایا کہ ابنائے عصر میں درجۂ امتیاز کو پہنچے۔ طویل عرصے تک درس و افادہ میں مصروف رہے اور ساتھ ہی مسند افتا و تصنیف پر فائز ہوئے۔ پھر شیخ عبد القدوس گنگوہی کے حلقۂ طریقت میں داخل ہوئے اور تصوّف و سلوک کی منزلیں طے کرنے لگے۔ اس میں اتنا آگے بڑھے کہ سب امور میں قطع علائق کر کے کلیتہً زہد و عبادت میں منہمک ہو گئے۔ انھوں نے نوّے برس عمر پائی۔ اس اثنا میں ریاضت و عبادت کے سوا ان کا کوئی کام نہ تھا۔ آخری عمر میں بہت کمزور ہو گئے تھے، چلنے پھرنے کی ہمت نہ رہی تھی اور ہر وقت تکیے پر ٹیک لگا کر بیٹھے رہتے تھے، مگر جوں ہی کان میں اذان کی آواز پڑتی، جسم میں طاقت لوٹ آتی، فوراً کھڑے ہو جاتے اور

---

[۵۸] مفتاح التواریخ ص ۱۵۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۷۱، ۷۲

تعدیلِ ارکان کے ساتھ نماز ادا کرتے۔

ارشاد اللطائف کے نام سے ان کی ایک تصنیف بھی ہے جو سلوک و تصوّف کے موضوع پر مشتمل ہے، اس میں انھوں نے گمراہ اور جاہل صوفیا کی سخت الفاظ میں مذمت کی ہے۔ مدعیانِ تصوّف کو زہد و اتقا اور عبادتِ الٰہی پر کاربند رہنے کی تاکید کی ہے اور کہا ہے کہ وہ سلف صالحین کے مسلک پر عمل پیرا ہوں، اصولِ شریعت کو ملحوظ رکھیں، تلاوتِ قرآن مجید کا التزام کریں، نوافل و سنن باقاعدہ پڑھتے رہیں، فرائض کی ادائیگی میں زیادہ سے زیادہ سعی کریں اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کا اہتمام کریں، کیوں کہ صوفیا کی اصل ذمہ داری یہی ہے۔

انھوں نے پچانوے[۹۵] سال عمر پا کر ۱۴ ذی الحجہ ۹۸۹ھ کو تھانیسر میں وفات پائی۔[۹]

۶۶- شیخ جلال الدین برہان پوری

شیخ جلال الدین برہان پوری، متوکل کے نام سے معروف تھے، علما و فقہا اور کبار مشائخ میں سے تھے۔ شیخ شرف الدین بن عبدالقدوس گجراتی برہان پوری سے کسبِ فیض کیا اور ایک مدت تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔ حتیٰ کہ مرتبۂ مشیخت کو پہنچے۔ ان سے سید ابراہیم بھکری اور بہت سے لوگوں نے استفاضہ کیا۔ ایک روایت کے مطابق ۹۸۳ھ میں، ایک روایت کے مطابق ۹۸۸ھ ہجری میں فوت ہوئے۔[۱۰]

دسویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا۔

---

[۹] تذکرہ علمائے ہند ص ۴۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۷۲، ۷۳ — اخبار الاخیار ص ۲۸۵ اذکارِ ابرار، ص ۵۷۹، ۵۸۰ — انوار العارفین ص ۴۲۶ — خزینۃ الاصفیا ص ۴۳۹، ۴۴۰ — طبقاتِ اکبری ص ۳۹۳، ۳۹۴ —

[۱۰] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۷۳

۶۷۔ قاضی جلال الدین ملتانی

قاضی جلال الدین ملتانی، حنفی المسلک تھے، فاضل کبیر، متبحر عالم اور شیخ عصر تھے۔ ان کا شمار اس دور کے کبار علما میں ہوتا تھا۔ بھکر میں پیدا ہوئے اور ملتان میں نشو و نما پائی۔ حصولِ علم کے لیے آگرہ گئے اور شیخ جلال الدین بن عبداللہ اکبر آبادی سے درسی کتابیں پڑھیں۔

ایک روایت کے مطابق پہلے گجرات گئے اور علامہ شیخ وجیہ الدین بن نصر اللہ علوی گجراتی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، پھر عازم آگرہ ہوئے اور وہاں ایک مدت گوشۂ خمول میں بسر کی اور عرصہ تک تجارت میں مصروف رہے۔ پھر سب طرف سے منقطع ہو کر درس و افادہ کو مقصدِ حیات قرار دے لیا۔ بہت عرصہ تک اکبر آباد میں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اہلِ علم میں ان کے فضل و کمال کا لوہا مانا گیا۔

اس زمانے میں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر ہندوستان پر دادِ حکمرانی دیتا تھا۔ قاضی کمال الدین یعقوب کردی جو فقہ و اصول میں عدیم النظیر تھے، منصب قاضی القضات پر متمکن تھے۔ اکبر نے قاضی موصوف کو اس منصب سے علیحدہ کر کے شیخ جلال الدین کو ان کی جگہ قاضی القضات مقرر کیا۔ وہ خاصا عرصہ اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ بعد ازاں اکبر نے ان کو معزول کر کے دیگر علما کے ساتھ بلادِ دکن میں بھیج دیا تھا۔

دیانت و امانت میں بے مثل تھے، مگر ان کا لڑکا نہایت بد دیانت تھا، اس منصب سے ان کی علیحدگی کا باعث وہی لڑکا تھا، ورنہ اکبر ان سے بہت مطمئن تھا۔ باشندگانِ دکن نے ان کی آمد کی خبر سنی تو نہایت خوش ہوئے اور بڑی تعظیم سے پیش آئے مگر دکن میں سکونت اختیار نہیں کی۔ دکن سے بیجاپور تشریف لے گئے اور وہاں کے حاکم نے ان کی بڑی تکریم کی۔ انھوں نے بیجاپور ہی میں ۹۹۹ھ میں انتقال کیا۔[۱]

۱۔ منتخب التواریخ ص ۳۰۵ — تذکرۂ علمائے ہند ص ۴۱، ۴۲، نزہۃ الخواطر ج ۴، ص ۷۴۔

لیکن ملا عبدالقادر بدایونی ان کے انتقال کے بارے میں لکھتے ہیں:

بزیارت بیت اللہ الحرام مشرف شدہ ہماں جا دعوتِ حق را لبیک اجابہ داد۔[۱۲] { کہ حج کے لیے گئے اور وہیں وفات پا گئے }

۶۸۔ شیخ جلال الدین بدایونی

سید شریف جلال الدین حسینی بدایونی، بدایون میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ پھر عازمِ دہلی ہوئے اور وہاں شیخ عبداللہ بن الٰہ داد (اللہ داد) عثمانی تلنبی سے منطق و حکمت کی کتابیں پڑھیں۔ پھر آگرہ گئے اور وہاں شیخ رفیع الدین محدث صفوی شیرازی سے حدیث کی تکمیل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد واپس بدایوں آئے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جو تمام عمر جاری رہا۔ بہت بڑے عالم اور محدث تھے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے اخذِ علم کیا، جن میں شیخ عبداللہ بدایونی، سید محمد امروہوی اور بہت سے لوگ شامل ہیں۔[۱۳]

دسویں صدی ہجری کے اس عالم کی نہ تو تاریخ ولادت و وفات کا علم ہو سکا ہے اور نہ کسی تصنیف کا۔

۶۹۔ شیخ جلال الدین کالپوی

شیخ جلال الدین صوفی، کالپی کے باشندے تھے، جلال واصل کے نام سے مشہور تھے، حنفی المسلک تھے اور اپنے زمانے کے صالح عالم دین اور نیک فقیہ تھے۔ نسلاً مولانا خواجگی نحوی سے تعلق رکھتے تھے۔ طریقت سے بھی لگاؤ تھا، اس سلسلے میں صاحبِ جواہر خمسہ شیخ محمد غوث عطاری شطاری کے فیض یافتہ تھے۔

---

[۱۲] منتخب التواریخ ص ۳۰۵

[۱۳] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۷۵۔ منتخب التواریخ ص ۸۶

تصوف سے دلچسپی کے بعد وجد و حال کی کیفیت کا غلبہ ہو گیا تھا۔ بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر ان کا معتقد تھا اور ان سے حُسنِ ظن رکھتا تھا۔ ۹۹۰ھ کے لگ بھگ کالپی میں فوت ہوئے[۱۴]

۷۰- شیخ جمال الدین بن محمود گجراتی

شیخ جمال الدین بن محمود بن علم الدین بن سراج الدین عمری گجراتی، گجرات میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی، اپنے والد شیخ محمود اور چچا زاد بھائی نصیر الدین بن مجد الدین گجراتی سے اخذِ علم کیا۔ ان کے آبا و اجداد کا شمار علما و فضلا میں ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بھی ان ہی کے نقشِ قدم پر چلے اور جامع علم و معرفت ہوئے۔ نہایت صالح متقی اور فقیہ عصر تھے۔ شاعر بھی تھے۔ فارسی میں ان کا ایک دیوان بھی ہے۔ ان کی تصنیفات میں سے ایک کتاب مذاکرہ ہے جو فارسی زبان میں ہے اور حقائق و معارف پر مشتمل ہے۔

اس عالم و فقیہ بزرگ کو ۹ ربیع الاول ۹۰۴ھ کو ایک روایت کے مطابق ۹۰۸ھ کو کفارِ ہند نے احمد آباد میں شہید کر دیا تھا[۱۵]

۷۱- مفتی جمال الدین بن نصیر الدین دہلوی

مفتی جمال الدین بن نصیر الدین بن سماء الدین دہلوی، خانوادۂ علم و صلاح سے تعلق رکھتے تھے، اپنے والد شیخ نصیر الدین اور بڑے بھائی شیخ عبد الغفور سے تعلیم حاصل کی۔ پھر دہلی میں درس و افادہ میں مصروف ہو گئے، فقہی اعتبار سے حنفی المسلک تھے۔ نہایت عالم و فاضل شخص تھے۔ اسی بنا پر دار السلطنت دہلی میں مفتی احناف کے منصب بلند پر فائز ہوئے۔ کنبو برادری کے فرد تھے اور میاں جمال خاں مفتی دہلی کے نام سے معروف

---

۱۴ منتخب التواریخ ص ۳۲۶ — اذکار ابرار، ص ۵۹۲ — نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۵۹

۱۵ انوار العارفین ص ۳۷۹، ۳۸۰ — نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۷۷۔

تھے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔ علومِ عربیہ کے دقیق اور پیچیدہ مسائل کے حل و کشود میں ماہر تھے، علومِ عقلی و نقلی دونوں پر عبور تھا۔ بالخصوص تفسیر، فقہ، اصول اور کلام میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ نہایت زاہد، قانع، حلیم الطبع اور شریف النفس تھے، ملوک و سلاطین اور وزرا و امرا کے دروازوں پر کبھی دستک نہیں دی۔ اس کے باوجود اس طبقے میں انتہائی عزت و تعظیم کے حامل تھے۔ شب و روز درس و افادہ میں مشغول رہتے۔ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ سکاکی کی مفتاح العلوم کی شرح سپردِ قلم کی اور اس کی دونوں شرحوں پر بہترین محاکمہ کیا۔ عضدی کی شرح لکھی اور شروع سے آخر تک چالیس مرتبہ اس کا درس دیا۔ انوار الفقہ کی شرح ضبطِ تحریر میں لائے۔ علمِ نحو کی مشہور کتاب شرح جامی پر مفصل و بسیط حاشیہ لکھا جس کا آغاز: الحمد للہ المرفوع شأنہٗ، المنصوب برہانہٗ، المجرد سلطانہٗ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے، جن میں اکثر اچھے عالم اور محقق بزرگ تھے۔

دسویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ نے نوّے۹۰ سال عمر پاکر ۹۸۴ھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[۱۶]

۷۲۔ شیخ جمال الدین برہان پوری

شیخ جمال الدین برہان پوری، صالح عالمِ دین اور اپنے دَور کے محدّث تھے۔ برہان پور میں شیخ ابراہیم کی مسجد میں مسندِ تدریس پر فائز تھے۔ مشہور محدّث شیخ طیب بن یوسف سندھی، جب برہان پور تشریف لائے اور سندھی پورہ میں اقامت گزین ہوئے، جو شیخ ابراہیم کی مسجد سے ایک میل کی مسافت پر واقع تھا تو انھوں نے ان کی آمد کو مغتنم جانا اور باوجودیکہ عوام و خواص میں عظیم مرتبہ کے حامل تھے، روزانہ ان کی

۱۶؎ منتخب التواریخ ص ۳۰۴، ۳۰۵ — طبقات اکبری ص ۳۹۱ — المشاہیر ص ۷۶ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۳، ۴۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۷۷، ۷۸

خدمت میں حاضر ہونے اور علمی استفادہ کرنے لگے۔ چنانچہ ان سے باقاعدہ شروع سے آخر تک صحیح بخاری پڑھی[۱۷]

دسویں صدی ہجری کے اس عالمِ حدیث و فقہ نے برہان پور میں وفات پائی افسوس ہے، ان کی ولادت و وفات کی تاریخ کا علم نہیں ہو سکا۔

۷۳۔ شیخ جمال محمد گجراتی

شیخ جمال محمد بن ملک چاند گجراتی، گجرات میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ جمو جی کے عرف سے معروف تھے اور گجرات (کاٹھیاواڑ) کے مشہور علما و مشائخ میں سے تھے۔ ان کا شمار علمِ حدیث کے بہت بڑے علما میں ہوتا اور انھیں محدّث کہا جاتا تھا۔ حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ حج سے واپس آکر عرصہ تک گجرات میں مقیم رہے، پھر برہان پور میں تشریف لے گئے اور وہاں جاکر باقاعدہ مسندِ تدریس آراستہ کی، تفسیر اور حدیث کے جلیل القدر عالم تھے۔ روزانہ صبح سے شام تک تدریس میں مصروف رہتے۔ ۹۹۸ھ کو برہان پور میں انتقال کیا[۱۸]

۷۴۔ مفتی جنید قریشی ملتانی

مفتی جنید بن بہاء الدین قریشی ملتانی، اکبر آبادی، شیخ وقت، فقیہِ عصر اور عالمِ زمان تھے۔ عہدِ علم و فضل میں پیدا ہوئے اور صلاح و تقویٰ کے ماحول میں پرورش پائی۔ اپنے والد شیخ بہاء الدین سے علم حاصل کیا۔ پھر ان کی جگہ افتا و تدریس کی مسند پر متمکن ہوئے۔ جہاں بہت بڑے عالم و فاضل تھے، وہاں جود و سخا اور حلم و کرم میں بھی بے نظیر تھے۔ ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا، کھانے کے وقت مہمانوں کو

---

[۱۷] اذکارِ ابرار، ص ۳۹۹ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۷۸۔

[۱۸] ” ” ” ص ۴۳۸، ۴۳۹ــــ ” ” ” ۷۹

اپنے ساتھ لاتے۔ ہر شخص کی سفارش کرتے، اس کے کام آتے اور ہر ممکن طریق سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتے۔

ایک روایت کے مطابق ۴ شعبان ۹۹۸ھ کو، اور ایک روایت کے مطابق ۹۹۹ھ کو اکبر آباد (آگرہ) میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے[۱۹]

چ

۷۵۔ شیخ چندن اکبر آبادی

شیخ چندن اکبر آبادی، فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے جید علما میں سے تھے۔ طریقت و تصوف سے بھی لگاؤ تھا۔ اس سلسلے میں شیخ سماء الدین دہلوی سے مستفیض ہوئے۔ نہایت نیک، متقی اور عالم و فاضل بزرگ تھے۔ ان کا ایک قول ہے:

حببت الی اربعۃ اشیاء، العلم والعمل والحیات والعافیۃ۔

مجھے چار چیزیں محبوب ہیں۔ علم، عمل، زندگی اور عافیت[۱]

نہ ان کی تاریخ ولادت و وفات کا علم ہو سکا اور نہ کسی تصنیف کا ہی پتا چل سکا ہے۔

۷۶۔ شیخ چندن جون پوری

شیخ چندن جون پوری، جلیل القدر عالم حدیث اور بہت بڑے فقیہ تھے۔ درس و افادہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ نصیر الدین جھونسوی کا اسم گرامی قابلِ ذکر ہے، جنھوں نے ان سے جون پور میں تمام درسی کتابیں پڑھیں[۲]

۷۷۔ شیخ چندن مندسوری

شیخ چندن بن بدھا بن جھجو مندسوری متقی اور پرہیز گار عالم دین تھے۔ تصوف سے

---

[۱۹] اذکارِ ابرار، ص ۹۰۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۷۹۔

[۱] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۸۱ — [۲] ایضاً۔ بحوالہ گنج ارشدی

بھی تعلق رکھتے تھے اور سلسلہ چشتیہ سے منسلک تھے۔ شیخ صدر الدین چشتی سے اخذِ فیض کیا تھا۔ سندِ تدریس پر فائز تھے۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے کسبِ علم کیا تھا۔ نایاب اور عمدہ کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا اور ایسی بہترین کتابیں ان کے کتب خانے میں موجود تھیں جو اور کسی کے پاس نہ تھیں۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ اگر کسی ایسے شخص میں جمع کتب اور مطالعہ کا شوق دیکھتے جو ان کو خریدنے کی استطاعت نہ رکھتا تو اس کو بلا تامل اور بلا کسی معاوضے کے کتابیں دے دیتے۔ اصلاً سکندرہ کے رہنے والے تھے لیکن ان کے دادا اچھجو وہاں سے مندسور چلے گئے تھے، لہذا مندسور ہی کو اصل وطن قرار دے لیا تھا اور وہیں اقامت گزین تھے۔ ۲۳ رمضان المبارک ۱۵۲ھ کو فوت ہوئے۔[۳۵]

ح

۷۸۔ مولانا حاتم سنبھلی

مولانا حاتم بن ابو حاتم سنبھلی حنفی، دیارِ ہند کے نامور علما میں سے تھے، شیخِ وقت اور عالم کبیر تھے۔ مختصرات سے فارغ ہونے کے بعد مشہور عالم و محقق شیخ عزیز اللہ تلنبی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور پھر ان سے اس طرح وابستگی اختیار کی کہ معقول و منقول کی تمام کتب درسیہ ان ہی سے پڑھیں۔ ان سے اخذِ طریقت بھی کیا۔ پھر شیخ علاء الدین دہلوی کی خدمت میں گئے۔ ان سے بھی فیضِ تصوف و سلوک حاصل کیا۔ بعد ازاں ہندوستان کے صوبہ یو پی کے مردم خیز شہر سنبھل میں سندِ تدریس بچھائی اور پورے چالیس سال درس و افادہ میں مصروف رہے۔ اس طویل مدت میں ان سے بے شمار تشنگانِ علم نے اپنی علمی تشنگی بجھائی اور سیرابیٔ ذہن و فکر کا سامان فراہم کیا۔

---

[۳۵] اذکارِ ابرار، ص ۲۶۰، ۲۶۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۸۱۔

فاضلِ کبیر کثیر الدرس، عبادت گزار، پیکرِ متانت اور حلیم الطبع تھے۔ ان کا حلقہ درس بہت وسیع تھا اور دور دراز سے شائقینِ علم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے استفادہ کرتے اور ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہونے کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ ان کے تلامذہ کی وسیع و کثیر جماعت میں ارضِ ہند کے مشاہیر میں سے سید محمد امروہوی، ملا عبدالقادر بدایونی، شیخ ابوالفتح خیرآبادی، شیخ عثمان بنگالی اور بہت سے علما شامل ہیں۔

مُلا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں: کہ ۹۶۰ھ میں جب میری عمر صرف بارہ سال کی تھی، میں اپنے والدِ ماجد کے ساتھ سنبھل میں ان کی خدمت میں گیا۔ ان کی خانقاہ میں قصیدہ بردہ کا درس ختم کر کے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے تبرکاً فقہ حنفی کی کتاب کنز الدقائق کے چند سبق پڑھائے اور مجھے اپنے خاص مریدوں میں داخل کیا۔ میرے والد سے فرمایا، ہم نے آپ کے بیٹے کو اپنے استاذ شیخ عزیز اللہ تلنبی کی طرف سے کلاہ اور شجرہ دیا ہے تاکہ یہ علومِ ظاہری سے مستفید ہو۔[۴۹]

دوسری جگہ بدایونی ان کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"یہ میاں عزیز اللہ تلنبی کے شاگرد ہیں، معقول و منقول میں ان جیسا جامع عالم کوئی اور نہ تھا۔ خاص طور سے علم حدیث، اصول، فقہ اور علوم عربیہ میں بے نظیر تھے۔ مشہور ہے کہ شرح مفتاح اور مطول، انھوں نے اول سے آخر تک چالیس مرتبہ پڑھائی تھی۔ دوسری منتہی کتابیں بھی اسی طرح پڑھاتے رہے۔"

"ملا علاء الدین لاری، شرح عقائد نسفی پر ایک حاشیہ بڑے دعوی سے لکھ ان کے پاس لے گئے، انھوں نے مطالعہ کے بعد اس پر ایسے اعتراضات وارد کیے کہ ملا علاء الدین سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔"

"میاں صاحب کو فقہ میں امام اعظم ثانی کہنا چاہیے۔ ریاضت و مجاہدہ بھی

---

[۴۹] منتخب التواریخ ص ۲۷۸۔

بہت کرتے تھے، تقویٰ و صلاح سے آراستہ تھے۔ ان علمی کمالات کے ساتھ عرصہ تک مقتدر حاکم بھی رہے۔"

"خان خاناں بیرم خاں کے زمانے میں ایک مرتبہ میں پانچ سال بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس زمانے میں شیخ مبارک کے ہاں میں بھی پڑھتا رہا تھا۔ اس ملاقات کے موقع پر میں نے ان کو شیخ مبارک کا ایک استفتا پیش کیا۔ پہلے تو وہ اس طویل غیر حاضری کے زمانے کے حالات پوچھتے رہے۔ پھر فرمایا:

"شیخ مبارک کس طرح کے عالم ہیں؟"

میں نے عرض کیا۔ "علمیت، تقویٰ، فقر و مجاہدہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بے مثل و بے نظیر ہیں" اس زمانے میں شیخ موصوف ان باتوں کے بڑے پابند تھے۔ فرمایا۔ "ہم نے ان کی بڑی تعریف سنی ہے، لیکن وہ مہدوی مشہور ہیں۔ آخر اس کی کیا حقیقت ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "وہ میر سید محمد جون پوری کی بزرگی اور ولایت کے قائل ہیں، ان کی مہدویت کے قائل نہیں ہیں"۔

فرمایا۔ "میر سید محمد کے کمالات میں کیا شک ہو سکتا ہے"۔

اس مجلس میں میاں حاتم کے شاگرد میر سید محمد عدلی بھی موجود تھے انھوں نے دریافت کیا۔

"پھر ملا مبارک کو لوگ مہدوی کیوں کہتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "وہ چوں کہ سب کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اس لیے لوگ ان کو مہدوی سمجھنے لگے ہیں"۔

اس پر انھوں نے کہا "ایک دفعہ عبدالحی خراسانی، خان خاناں کے سامنے شیخ مبارک کی بہت مذمت کر رہا تھا، اس کی کیا وجہ تھی؟"

لے منتخب التواریخ ص ۲۷۸

میں نے کہا۔" شیخ مبارک نے ایک مرتبہ اس کو ایک خط کے ذریعے کچھ نصیحتیں کی تھیں، اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ مسجد میں جا کر نماز با جماعت پڑھا کرو۔ بس یہ بات اسے ناگوار گزری اور اس نے یہ گمان کیا کہ شیخ مہدوی ہیں اور مجھ کو رافضی سمجھنے لگے ہیں۔"

میرا یہ جواب سن کر میر سید محمد عدلی نے کہا۔" عبدالحی خراسانی کا اپنے فرض پر یہ استدلال تو صرف اسی صورت میں صحیح ہوتا جب کہ وہ اس منطقی کلیہ پر پورا اترے کہ وہ تو نماز با جماعت ادا نہیں کرتا اور جو کوئی نماز با جماعت ادا نہ کرے، وہ رافضی ہے لہٰذا تو رافضی ہوا۔ حالانکہ اس کلیہ کا کبریٰ ممنوع ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی منطقی کلیہ پر پوری نہیں اترتی کہ شیخ امر بالمعروف کرتے ہیں اور جو کوئی امر بالمعروف کرے وہ مہدوی ہے۔"

اس گفتگو کے بعد میاں حاتم سنبھلی نے فرمایا۔" میں شیخ مبارک کے اس استفتا پر مہر کر دوں گا، لیکن میرے پاس ایک اور استفتا آیا ہے، جس پر تمام علما کے دستخط ہیں۔ مجھے اس پر کچھ شبہات ہیں، تم اسے شیخ بہاء الدین کے پاس لے جاؤ، جو بڑے محقق اور مفتی ہیں، اور ان سے کہو کہ سفر کی وجہ سے میرے پاس کتابیں نہیں ہیں، اگر آپ اس روایت کو، جس کی بنیاد پر آپ نے اس استفتا پر دستخط کیے ہیں، بعینہٖ بھیج دیتے تو بہتر ہوتا۔ آپ نے فتویٰ دیا ہے کہ مصیبت کے عالم میں لوگ اپنے بچوں کو فروخت کر سکتے ہیں۔

اس فتویٰ کے سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ روایت صرف "فتاویٰ ابراہیم شاہی" میں ملتی ہے، فقہ کی دوسری کتابوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، اور فتاویٰ ابراہیم شاہی کو علما کے نزدیک معتبر کتاب نہیں سمجھا جاتا کہ اس کی بنا پر فتویٰ دیا جا سکے۔ اس کے جواب میں اگر آپ یہ کہیں کہ مفتی مرجوحہ روایات میں سے کسی روایت کو ترجیح دے سکتا ہے تو میں کہوں گا کہ ابراہیم شاہی کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ حالتِ اضطراری میں اَبَوَین کے لیے اولاد کی بیع کرنا جائز ہے۔

ظاہر ہے "اَبَوَین" کا لفظ باپ اور دادا دونوں پر مشتمل ہے، چنانچہ نکاح کے

سلسلے میں جس کے ابوین مسلمان ہوں، وہ اس کا کفو ہے، یعنی جس کے آبا، شرفِ اسلام سے مشرف ہوئے۔ اس لیے یہاں بالاتفاق ابوین سے باپ اور دادا مراد ہے، نہ کہ ماں اور باپ۔ ! ہم اس روایت میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اولاد کی بیع کا دونوں کو اکٹھے بطریق اجتماع اختیار حاصل ہے، نہ کہ فرداً فرداً کسی ایک کو۔ انفرادی حیثیت سے بیع کی آخر کیا دلیل ہو سکتی ہے"۔

اس سے آگے بدایونی لکھتے ہیں:

میاں حاتم نے شیخ مبارک کا استفتا تو اپنے پاس رکھ لیا اور مذکورہ استفتا مجھے دے دیا۔ یہ استفتا میں نے شیخ مبارک کو دکھایا تو انھوں نے میاں حاتم کی فقاہت کی بہت تعریف کی اور کہا "ان کو دعا و سلام کے بعد میری طرف سے کہنا کہ ہم نے بھی اس مشکل کی وجہ سے اس پر مہر نہیں کی تھی"۔

پھر جب میں نے وہ استفتا شیخ بہاء الدین کو دکھایا تو فرمایا "چوں کہ دوسرے مفتیوں نے اس پر تصدیقی دستخط کر دیے تھے، اس لیے میں نے ان پر بھروسہ کیا اور زیادہ غور نہ کیا، بے شک مجھ سے سہو ہو گیا۔

شیخ بہاء الدین کے اس اعترافِ غلطی پر بدایونی لکھتے ہیں: "یہ بھی شیخ بہاء الدین کی حق بینی، حق پرستی، نیک نفسی اور انصاف پسندی تھی کہ باوجود اس عظمت و کمال کے انھوں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی"۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے ایک جگہ ان کا سالِ وفات ۹٦۹ھ تحریر کیا ہے۔ اور تاریخ وفات "درویش دانشمند" سے نکالی ہے[۵]۔ دوسری جگہ ۹٦۸ھ درج کیا ہے اور تاریخ اللہ کے فرمان: عند ملیك مقتدر سے نکالی ہے[٦]۔

یہاں ایک تو اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ انسان اگرچہ کسی بھی بڑی سے

---

[۵] منتخب التواریخ ۲۷۸،

[٦] ایضاً ص ۳۰۱، ۳۰۲۔ نیز ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند ص ۵۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۸۳

بڑی مصیبت میں مبتلا ہو، اولاد کو فروخت نہیں کر سکتا۔ قرن اوّل سے لے کر اب تک کتنی ہی مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ اسلام کی بعض نہایت اونچی اور متقی شخصیتوں کو سخت مصائب و آلام کے دور سے گزرنا پڑا مگر کسی نے یہ حرکت نہیں کی کہ اس سے مخلصی حاصل کرنے کے لیے اپنی اولاد کو بیچ ڈالا ہو، کیوں کہ یہ انسانیت کے منافی فعل ہے۔ فقہِ اسلامی تو رہی ایک طرف، کوئی معمولی سے معمولی اخلاق بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ بلاشبہ دو مقامات پر قرآن میں اَبَوَیہ کا لفظ بہ سبیل تغلیب باپ اور دادا کے لیے آیا ہے۔ مثلاً سورۂ یوسف میں ہے:

..... کَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ط (آیت: ۶)

حضرت اسحٰق علیہ السلام حضرت یوسف کے دادا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے پردادا ہیں۔

یا سورۃ الاعراف میں ہے: يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ یہاں اَبَوَيْكُمْ کا منطوق آدم و حوا ہیں۔

لیکن متعدد مقامات پر قرآن میں لفظ ابوین ماں اور باپ کے لیے آیا ہے۔ نہ کہ باپ اور دادا کے لیے۔ اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ (سورۃ النساء آیت ۱۱)

یہاں لفظ اَبَوَيْهِ سے ماں باپ مراد ہیں۔

۲۔ اسی آیت میں وَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ۔ یہاں بھی اَبَوٰهُ سے ماں باپ ہی مراد ہیں۔

۳۔ وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ ..... (الکہف: ۸۰)

لفظ اَبَوٰهُ کا اطلاق ماں اور باپ پر ہوا ہے۔

۴۔ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ (یوسف: 99)

۵۔ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ (یوسف: ۱۰۰)

سورۂ یوسف کی ان دونوں آیتوں میں اَبَوَيْهِ کا لفظ ماں اور باپ کے بارے

میں استعمال ہوا ہے۔

اسی طرح حدیث میں ہے: اَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ وَیُنَصِّرَانِہٖ وَیُمَجِّسَانِہٖ۔ یہاں لفظ اَبَوَاہُ سے مراد ماں اور باپ ہیں۔

ان سطور کا مقصد یہ ہے کہ شیخ حاتم سنبھلی بلاشبہ بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے، مگر ان کی یہ بات صحیح نہیں کہ قرآن میں اَبَوَیْن کا لفظ ماں باپ کے لیے نہیں آتا، باپ دادا کے لیے آتا ہے۔ اٰباء کا لفظ البتہ قرآن میں آبا و اجداد کے لیے استعمال ہوا ہے۔

۷۹۔ قاضی حبیب اللہ گھوسوی

قاضی حبیب اللہ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: حبیب اللہ بن احمد بن ضیاء الدین بن یحییٰ بن شرف الدین بن نصیر الدین بن مفتی حسین عثمانی اصفہانی ثم گھوسوی جونپوری۔ ایک روایت کی رو سے ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابان بن عثمان کی طرف اور ایک روایت کی رو سے حضرت عمر بن عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منتہی ہوتا ہے۔ شیخ عصر، عالم دین اور اپنے علاقے کے عظیم المرتبت فقیہ تھے۔ اس نواح میں علوم عربیہ اور فقہ و اصول کے جلیل القدر علما میں سے تھے۔ اعمالِ جون پور میں ایک قصبے کا نام گھوسی تھا، حکومتِ وقت کی طرف سے انھیں وہاں کے قاضی مقرر کیا گیا تھا۔ تمام عمر اس منصب پر فائز رہے۔ تصوّف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا اور اس سلسلے میں شیخ علی بن قوام الدین جون پوری سے اخذِ فیض کیا تھا[۵]۔

۸۰۔ شیخ حسام الدین متقی ملتانی

شیخ حسام الدین متقی ملتانی، نہایت نیک اور صالح عالم دین تھے۔ ملتان میں

---

[۵] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۸۵۔ بحوالہ عاشقیہ۔

فروکش تھے۔ ان کے تقویٰ و تدین کا یہ عالم تھا کہ لفظ "متقی" ان کے نام کا مستقل جز بن گیا تھا۔ کھانے پینے میں احتیاط کا یہ حال تھا کہ ان کے پاس خراجی زمین تھی جس میں خود کاشت کرتے تھے اور اپنے ہاتھ سے کام کر کے سامانِ اکل و شرب فراہم کرتے تھے۔ اس زمین کا خراج بھی باقاعدہ حکومت کو ادا کرتے تھے، لیکن جب ملتان کے سیاسی حالات خراب ہو گئے اور علاقے میں فتنہ و فساد پھیل گیا، تو خراجی اور دوسری زمینیں ایک دوسری سے مختلط ہو گئیں اور دونوں میں امتیاز باقی نہ رہا تو یہ زمین چھوڑ دی اور کوئی دوسرا ذریعہ معاش اختیار کر لیا۔

مشکوک و مشتبہ چیزوں کے استعمال سے اور ایسے مقامات پر جانے اور ان سے فائدہ اٹھانے سے پرہیز کرتے تھے، جہاں ان کے نقطۂ نظر سے کوئی اشتباہ پایا جاتا ہو۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے مقبرہ کے سایہ میں نہیں بیٹھتے تھے اور صاف لفظوں میں کہتے تھے کہ یہ عمارت بیت المال کی رقم سے بنائی گئی ہے، جو سب مسلمانوں کا مشترکہ مال تھا اور ان سے پوچھے بغیر صرف ایک شخص کی قبر پر خرچ کر دیا گیا ہے۔ یہ ان کے مال کا ضیاع ہے۔ لہٰذا اس کے سایہ میں بیٹھنا اور کسی صورت میں بھی اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بڑے جری تھے، اس ضمن میں نہ کسی قسم کی ملامت کی پرواہ کرتے تھے، نہ کسی سے خوف زدہ ہوتے اور نہ کسی کی رو رعایت کے قائل تھے۔

مشتبہات سے دامن کشاں رہتے، اگر بے خبری میں کبھی مشتبہ لقمہ حلق سے نیچے اتر بھی جاتا تو پیٹ میں ثقالت اور ذہن میں انقباض کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ ایک مرتبہ کھانا کھایا تو یہی صورتِ حال پیش آئی اور سخت تکلیف سے دوچار ہوئے۔ چنانچہ اسی حال میں گھر گئے اور تحقیق کی، تو پتا چلا کہ خادم چولھا بنانے اور آگ جلانے کے لیے پڑوسی کی ایک اینٹ اٹھا کر لایا تھا۔ اسی وقت پڑوسی کے گھر گئے، اس کو اینٹ کا معاوضہ دیا اور اس سے معافی مانگی۔ پھر کہیں ثقالت و انقباض کی کیفیت

سے مخلصی حاصل ہوئی۔

ایک مرتبہ ایک شخص غلطی سے ان کے جوتے پہن کر گھر لے گیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ جوتے شیخ حسام الدین متقی کے ہیں۔ اسی وقت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کو جوتے پیش کیے اور معذرت طلب کی۔ شیخ نے یہ کہہ کر اس کو جوتے بھی واپس کر دیے اور ان کی قیمت بھی عطا کی کہ میں نے اپنی ہر شے اللہ کی راہ میں وقف کر دی ہے تاکہ اگر کوئی شخص ان کو میری اجازت کے بغیر اپنے تصرف اور استعمال میں لے بھی آئے تو گنہ گار نہ ہو۔

ملتان کے اس جید عالم دین، پابند شریعت اور پرہیز گار بزرگ نے ۹۶۰ھ میں وفات پائی۔[۵۹]

۸۱۔ شیخ حسن بن احمد گجراتی

شیخ حسن بن احمد بن نصیر الدین عمری ابو صالح محمد گجراتی، علامہ شیخ کمال الدین دہلوی کی اولاد سے تھے۔ ۹۲۳ھ کو احمد آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں کے علما سے علم حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے والد شیخ احمد اور چچا شیخ جمال الدین سے اخذِ طریقت کیا۔

تفسیر، فقہ، اصول، علومِ عربیہ اور تصوف کے عالمِ کبیر تھے اور علوم کی ان تمام شاخوں پر کامل عبور رکھتے تھے۔ ۹۴۱ھ میں مسندِ سلوک اور مشیخت پر فائز ہو گئے تھے۔

متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن میں قرآن حکیم کی ایک تفسیر بھی ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آیات کے باہم ربط و تعلق کو واضح کیا گیا ہے

---

[۵۹] اخبار الاخیار، ص ۲۱۳، ۲۱۴ — تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۴ — خزینۃ الاصفیا ص ۴۲۶، ۴۲۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۸۶۔

اور اس ضمن میں نہایت محنت اور احتیاط کا ثبوت دیا ہے۔ علاوہ ازیں تفسیر بیضاوی پر حواشی و تعلیقات سپردِ قلم کیں۔ پھر نزہۃ الارواح پر بڑا عمدہ اور لطیف حاشیہ لکھا۔

اس جلیل القدر عالم و فقیہ اور مصنف نے ۲۸ ذی القعدہ ۹۸۱ھ یا ماہ شوال ۹۸۲ھ میں انسٹھ سال کی عمر پا کر داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[۹]

۸۲۔ شیخ حسن بن حسام الدین نارنولی

شیخ حسن بن حسام الدین چشتی نارنولی اپنے دور کے عالم اور فقیہ تھے۔ قاضی تاج الدین ہروی کی نسل سے تھے۔ نارنول میں پیدا ہوئے۔ وہیں پرورش پائی اور اپنے والد شیخ حسام الدین سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ شیخ شمس الدین نارنولی سے فیضِ طریقت حاصل کیا۔ پھر شیخ نظام الدین کی خدمت میں گئے اور طویل عرصہ تک ان کی صحبت سے مستفیض ہوتے رہے۔ بعد ازاں لاہور تشریف لے آئے اور وہیں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ چالیس سال تک لاہور میں ان کا سلسلۂ تدریس جاری رہا۔ اس اثنا میں ان سے بے شمار لوگوں نے استفادہ و استفاضہ کیا۔

یہ عالم و فقیہ اور صاحبِ طریقت و سلوک بزرگ ۹۹۸ھ میں سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔[۱۰]

۸۳۔ شیخ حسن بن طاہر جون پوری

شیخ حسن بن طاہر بن کمال الدین عباسی جون پوری، عالمِ دین اور فقیہ تھے۔

۹۔ انوار العارفین ص ۳۸۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۸۷ — اذکار ابرار، ص ۳۲۱ — یادِ ایام ص ۶۳۔

۱۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۸۸ بحوالہ اخبار الاصفیا۔

تصوف سے بھی تعلق رکھتے تھے اور بلادِ ہند کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ اصل وطن ملتان تھا لیکن ان کے والد شیخ طاہر حصولِ علم کی غرض سے ملتان سے بہار چلے گئے تھے۔ انھوں نے وہیں شیخ محمد بن طیب کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی، وہیں شادی کی، اور وہیں شیخ حسن پیدا ہوئے۔ پھر جون پور تشریف لے گئے۔ حسن نے جون پور میں نشوونما پائی۔ بچپن ہی میں حصولِ علم کی راہ پر گامزن ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں جون پور میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے تلامذہ کی مسندِ درس بچھی ہوئی تھی۔ حسن نے ان ہی سے تحصیل کی اور شیخ محمد بن عیسیٰ جون پوری کی بیٹی سے ان کی شادی ہوئی۔ ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد شیخ حامد بن ابو حامد چشتی مانک پوری سے اخذِ طریقت کیا۔ شیخ حامد نے اپنے اس مرید کو کمال الحق کے لقب سے ملقب کیا۔ شیخ ان کی نیکی اور رشد و سعادت سے بہت متاثر تھے اور کہا کرتے تھے، حسن قیامت کے روز میری مغفرت کے لیے حجت ثابت ہوگا۔

یہ عالمِ کبیر اور فقیہ عارف، سلطان سکندر لودھی کے عہد میں جون پور سے آگرہ چلے گئے تھے۔ وہاں خاصی مدت قیام پذیر رہنے کے بعد دہلی تشریف لے گئے تھے۔ دہلی میں انھوں نے اپنے اہل و عیال سمیت بجی منڈل میں سکونت فرمائی جو سلطان تغلق کے محلات میں سے ایک محل کا نام تھا۔

ان کی تصنیفات میں ایک کتاب مفتاح الفیض ہے اور علمِ توحید اور سلوک کے موضوع سے متعلق کچھ رسائل کا بھی پتا چلتا ہے۔ انھوں نے جمعہ کے روز ۲۴ ربیع الاول ۹۰۹ھ کو دہلی میں وفات پائی۔[۱۱۱]

۸۴- شیخ حسن بن عبداللہ کالپوی

شیخ حسن بن عبداللہ قریشی کالپوی اپنے دور کے مشہور افاضل میں سے تھے،

---

[۱۱۱] اخبار الاخیار، ص ۱۹۵، ۱۹۶۔ خزینۃ الاصفیا، ص ۴۰۹، ۴۱۰۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۷۔

اور صالحیت و علمیت دونوں اوصاف سے متصف تھے۔ کالپی میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور اساتذۂ عصر سے تعلیم پائی۔ حدیث کی سند شیخ عبدالنبی محدث گنگوہی سے حاصل کی۔ طریقت کے لیے شیخ برہان الدین انصاری کی خدمت میں حاضر ہوئے بہت بڑے عالم، زیورِ صالحیت سے مزین اور متقی تھے۔ شعر و شاعری کا بھی شوق رکھتے تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ صوفیا کی مجالسِ غنا میں جاتے تو عقل و دین اور سکون و اعتدال کے ساتھ جاتے اور ان میں خالص توحید کی باتیں کرتے۔ تدریس افادہ ان کا اصل کام تھا، زیادہ تر اسی میں مصروف رہتے۔ ۹۸۹ھ کو راہیِ جنت الفردوس ہوئے[۱۲]

۸۵۔ شیخ حسن بن موسیٰ گجراتی

شیخ حسن بن موسیٰ گجراتی کی ولادت گجرات میں ہوئی اور وہیں ابتدائی تربیت کی منزلیں طے کیں۔ اللہ کے نیک بندوں میں سے تھے اور صلاح و تقویٰ سے آراستہ عالمِ دین تھے۔ حدیث، فقہ اور علم نحو کی تحصیل اپنے عصر کے نامور اساتذہ سے کی۔ بعد ازاں شیخ جلال الدین بن احمد بن جعفر حسینی رفاعی سے طریقت و سلوک کا درس لیا۔ ۹۴۱ھ میں مغل حکمران سلطان نصیر الدین ہمایوں نے گجرات فتح کیا تو شیخ حسن وہاں سے مانڈو چلے گئے، وہیں شادی کی اور اللہ نے اولاد بھی دی۔ گلزارِ ابرار کے مصنف شیخ محمد غوثی مانڈوی ان کے بیٹے تھے۔ شیخ حسن گجراتی متدین، عفیف النفس، متقی، نرم خو، صالح عالم و فقیہ تھے۔ جمعہ کے روز ۱۴ صفر ۹۷۲ھ کو فوت ہوئے[۱۳]

۸۶۔ شیخ حسن عرب دابھولی گجراتی

شیخ حسن عرب دابھولی گجراتی، بہت بڑے فاضل اور علامہ تھے اور دیارِ ہند

۱۲؎ اذکار ابرار ص ۳۵۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۸۹، ۹۰۔ ۱۳؎ اذکار ابرار ۶۰۸ تا ۶۱۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۹۰، ۹۱۔

کے مشہور عرب فقیہ تھے۔ بلکہ لفظ فقیہ ان کے نام کا جز تھا اور انھیں فقیہ حسن عرب دابھولی کہا جاتا تھا۔ سلطان محمود شاہ بیگرہ اور اس کے بیٹے مظفر شاہ حلیم کے ایام حکومت میں علاقہ احمد آباد کے قصبہ سرکھیج کے مدرسہ میں درس و افادہ کی خدمات انجام دیتے تھے۔ ان سے شیخ عبدالقادر اجینی اور خلق کثیر نے علم حاصل کیا۔[۱۴۶]

۸۷- خواجہ حسین ہروی

خواجہ حسین ہروی، شیخ رکن الدین علاء الدولہ سمنانی کے فرزندوں میں سے تھے۔ معقولات کی کتابیں مولانا عصام الدین اور ملا حنفی سے پڑھیں۔ علوم شرعیہ و منقولات کی تحصیل خاتم العلما والمحدثین شیخ ابن حجر سے کی۔ انشا پردازی، صنائع بدائع، حسن بیان، فصاحت و بلاغت اور مزاح و لطافت میں عدیم النظیر تھے۔ شاعر بھی تھے اور ان کا ایک دیوان بھی ہے۔ بقول بدایونی کے اوسط درجے کے شاعر تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

اے از مژہ بے تو آب رفتہ — دز دیدہ خیال و خواب رفتہ
خود را بما چناں کہ نبودی نمودۂ — افسوس آں چناں کہ نمودی نبودۂ

اس شعر کا ماخذ غالباً یہ رباعی ہے:

گویم مگر ز اہلِ وفائیم نہ ایم — اندر صفت صدق و صفائیم نہ ایم
آراستہ ظاہریم و باطن نہ چناں — افسوس کہ آنچہ می نمائیم نہ ایم

یہ اشعار بھی ان ہی کے ہیں:

با ما گرہ چو غنچہ در ابرو فگندۂ — با غیر لب چو پستہ خنداں کشودۂ
مجنونے کہ مرا با تو ہست می خواہم — ہمیں تو دانی و من دانم و خدا داند

---

۱۴۶ اذکار ابرار، ص ۴۸۵ بضمن حالات شیخ عبدالقادر۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۹۱

جلال الدین اکبر نے ان کو سنگھاسن بیتی کا ترجمہ کرنے پر مامور کیا تھا، مگر یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ اس ترجمہ پر انھوں نے جو نعت لکھی تھی، اس کے چند شعر یہ ہیں :

خوش الحان عندلیبے باغ و بلاغ مکحل نرگسش از کحل ما زاغ
کشیدہ در زبور نسخ بے قیل قلم بر نسخۂ توریت و انجیل
نبوت را بدرگاہش حوالہ امام الانبیاء ختم الرسالہ

آنم کہ ممالک سخن ملک منست صراف خرد صیرفی سلک منست
ہر ہفت ورق ز دفتر من ورقیست اسرار دو کون بر سر کلک منست

خواجہ حسین ہروی نے ۹۷۹ھ میں وفات پائی۔ فیضی نے جوان کا تربیت یافتہ تھا، "دام ظلہ" سے تاریخ وفات نکالی[۱۵]

۸۸۔ شیخ حسین بزری

شیخ حسین بزری عظیم المرتبت عالم دین اور خطۂ ہند کے مشہور فاضل تھے۔ دہلی کے مدرسہ میں طلبا کے درس وافادہ میں مصروف رہتے۔ ارض ہند کے مدارس میں مروجہ و مشہورہ علوم میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ سب علما و مدرسین سے ممتاز و سربرآوردہ تھے۔ نہایت بلند اخلاق بھی تھے۔ یوں سمجھیے کہ علم و اخلاق کے تمام محاسن ان کی ذات میں جمع تھے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا[۱۶]

ان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

۱۵؎ منتخب التواریخ ص ۳۳۷، ۳۳۸ — تذکرہ علمائے ہند ص ۵۰ — بزم تیموریہ ص ۱۰۳۔

۱۶؎ منتخب التواریخ ص ۳۲۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۹۷

۸۹- قاضی حماد ردولوی

قاضی حماد ردولوی، فقہی اعتبار سے حنفی مسلک سے منسلک تھے۔ اپنے عصر کے شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ دسویں صدی ہجری کے ملک ہند کے مشہور اور نامور علما میں سے تھے۔ درس و تدریس اور افادہ عام میں مصروف رہتے تھے[۱۷۱]۔

افسوس ہے اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

۹۰- مولانا حمید الدین سنبھلی

مولانا حمید الدین سنبھلی، شیخِ وقت، واعظِ خوش بیان اور عالم و فقیہ تھے۔ قرآن مجید پر گہری نظر رکھتے تھے، مفسرِ قرآن تھے اور نہایت عمدہ و موثر انداز سے تفسیر بیان کرتے تھے۔ آیاتِ قرآنی کے ذریعے تذکیر و موعظت میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ مغل حکمران نصیر الدین ہمایوں کے عہد کے عالم تھے اور ہمایوں ان کی بدرجۂ غایت عزت و تکریم بجا لاتا اور ان سے انتہائی محبت رکھتا تھا۔ دین کے معاملے میں بہت صاف گو تھے اور سچ بات کہنے میں کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ اس سلسلے میں منتخب التواریخ میں مُلّا عبد القادر بدایونی نے ان کا یہ عجیب واقعہ نقل کیا ہے کہ ہمایوں نے جب تسخیرِ ہند کا دوسری دفعہ ارادہ کیا اور وہ اس کے لیے ایران سے روانہ ہوا تو شیخ موصوف اس کے استقبال کے لیے کابل پہنچے۔ ہمایوں چوں کہ ان کا معتقد تھا، اس لیے بہت خوش ہوا۔ ایک دن شیخ نے اس سے کہا: "تمہارا سارا لشکر رافضی معلوم ہوتا ہے۔" ہمایوں نے پوچھا: "وہ کیسے۔؟" کہا: "آپ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے سپاہیوں کے نام، یار علی، کفش علی اور حیدر علی وغیرہ ہیں۔ دوسرے کسی صحابی یا خلیفہ کے نام پر کسی سپاہی کا نام نہیں ہے۔" ہمایوں کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی، وہ طیش میں آگیا۔

---

[۱۷۱] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۹۷۔ لطائف قدوسی ص ۸۔

اس وقت اس کے ہاتھ میں قلم تھا، غصّے میں اس کو فرش پر پھینک دیا اور کہا:

نامِ پدرِ من کلاں خود عمر شیخ است، دیگر نمی دانم۔

میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا، میرے دادا کا نام عمر شیخ تھا۔

یہ کہہ کر جلدی سے محل سرا میں چلا گیا، لیکن تھوڑی دیر بعد باہر آیا اور نہایت نرمی اور عقیدت کے ساتھ اس نے شیخ کو اپنے عقیدہ سے آگاہ کیا۔

شیخ حمید الدین سنبھلی نے ۷ محرم ۹۸۳ھ کو سنبھل میں وفات پائی[۱۸]

کہتے ہیں شیخ حمید الدین نے ہمایوں سے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ اس نے شاہ طہماسپ صفوی سے مدد لیتے وقت شیعہ عقائد کو قبول کرنے سے صاف لفظوں میں انکار نہیں کیا تھا اور صفویوں کا لشکر لے کر بدخشاں پر حملہ آور ہوا تھا، اس سے شیخ کو شبہ گزرا کہ اس نے شیعیت قبول کر لی ہے لیکن اس نے شیخ کے سامنے اپنا اصل مسلک ظاہر کر دیا تو وہ مطمئن ہو گئے۔

خ

۹۱- شیخ خواجگی سدّھوری

شیخ خواجگی بن علی بن خیر الدین بن نظام الدین انصاری سدّھوری۔ ان کے جدِّ امجد شیخ نظام الدین سدھوری ۸۴۰ھ میں واردِ ہند ہوئے اور علاقہ اودھ کے ایک بڑے گاؤں سدّھور میں سکونت پذیر ہوئے۔

شیخ خواجگی کی ولادت سدّھور میں ہوئی اور وہ وہیں پلے بڑھے، پھر حصولِ علم کے لیے جون پور گئے اور وہاں کے اساتذہ سے تحصیل کی۔ بعد ازاں شیخ تاج الحق جون پوری سے اخذِ طریقت کیا۔

---

[۱۸] منتخب التواریخ ۳/۲۷- طبقاتِ اکبری ۳۹۱- تذکرۂ علمائے ہند ص ۵۳-
نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۹۸، ۹۹-

شیخ خواجگی اپنے وقت کے نیک و صالح عالم دین اور عظیم فقیہ تھے۔ ساتھ ہی ان کا شمار کبار مشائخ چشتیہ میں ہوتا تھا۔ ان کے علم و مشیخت اور رفعت منزلت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی ان کو اپنے رسائل و مکاتیب میں شیخ الاسلام کے لفظ سے خطاب کرتے ہیں۔ ان کے چار بیٹے تھے اور چاروں اس دور کے علمائے دین میں سے تھے[۱۸]۔

دسویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔ نہ ان کی ولادت و وفات کی تاریخ کا پتا چل سکا ہے۔

د

۹۲۔ شیخ داؤد بن فتح اللہ کرمانی

شیخ داؤد کے والد فتح اللہ، اپنے اس بیٹے کی ولادت سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے، اور ابھی صغر سنی کے عالم میں تھے کہ والدہ بھی فوت ہو گئی تھیں۔ ان کی تربیت بڑے بھائی رحمت اللہ کے ہاں ہوئی۔ پہلے قرآن مجید پڑھا، پھر حصول علم میں مشغول ہو گئے اور اس دور کے بعض علما سے فقہ اور دیگر علوم کی تحصیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وارد لاہور ہوئے اور شیخ اسماعیل بن عبداللہ اوچی سے اخذ طریقت کیا۔ نہایت نیک متقی، عارف باللہ، فقیہ وقت اور عالم دین تھے۔ تمام اطراف سے قطع علائق کر کے پنجاب کے ایک قصبے شیر گڑھ میں (جو اب ضلع ساہیوال میں شامل ہے) سکونت اختیار کر لی تھی اور کلیتہً زہد و عبادت میں مصروف ہو گئے تھے۔ نہایت سخی اور جودت طبع کے مالک تھے۔ سال میں ایک یا دو مرتبہ گھر کا تمام مال و اسباب مستحقین میں صدقہ کر دیتے۔ کوئی شی اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ ان کی وفات ۹۸۲ھ کو شیر گڑھ میں ہوئی[۱]۔

---

[۱۸] لطائف قدوسی ص ۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۰۴

[۱] اذکار ابرار، ص ۲۰۷۔ اخبار الاخیار ص ۲۰۷، ۲۰۸۔ منتخب التواریخ ۲۸۷ تا ۲۹۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۰۸۔

۹۳- قاضی داؤد فتح پوری سندھی

قاضی داؤد حنفی سندھی، دراصل فتح پور کے رہنے والے تھے جو اس زمانے میں علاقہ سندھ میں موضع سیلوی کے قریب ایک قریہ تھا۔ شیخ عصر اور عالم و فقیہ تھے۔ سندھ کے حکمران سلطان محمود شاہ کے عہد میں بھکر منتقل ہو گئے تھے۔ سلطان مذکور نے ان کی علمی و فقہی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انھیں بھکر کا قاضی مقرر کر دیا تھا اور ان کا شمار لائق اور مشاہیر قضات میں ہوتا تھا۔ طویل عرصہ تک اس منصب پر فائز رہے۔ سلسلۂ قضا میں نہایت بلند اور بہترین کردار کے حامل تھے۔ انھیں ۸ ماہ شوال ۹۸۱ھ کو محبوس کر کے زہر دے دیا گیا تھا، جس سے ان کی موت واقع ہو گئی تھی [۲۷]۔

۹۴- قاضی دِتّہ سیوستانی

قاضی دتّہ بن شرف الدین سیوستانی، شیخ اور عالم و فقیہ تھے، حنفی المسلک تھے، نیک اور صالح علمائے دین میں سے تھے۔ فقہ اور دیگر علوم عقلیہ کی تحصیل اپنے والد شیخ شرف الدین، شیخ محمود اور شیخ عبدالعزیز ہروی سے کی۔ تفسیر و حدیث کے لیے شیخ بلال تلہٹی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بعد ازاں کبار مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی صحبت و ملازمت اختیار کی۔ حتیٰ کہ تفسیر، حدیث، فقہ، ہیئت، جفر، اور دیگر تمام علوم میں ماہر ہو گئے۔ تصوّف و طریقت کے بھی اونچے مرتبے کو پہنچے۔ مسائل و معانی پر دقیق نظر رکھتے تھے۔ بڑے با صلاحیت بزرگ تھے۔ حافظہ اس درجہ تیز تھا کہ علوم و فنون کی اکثر کتابیں زبانی یاد تھیں۔ قرآن مجید کی اٹھارہ تفسیروں کا مطالعہ اور ان کے معانی و دقائق پر عبور حاصل کیا۔

---

[۲۷] مآثر رحیمی ج ۲ ص ۳۳۶۔ تاریخ معصومی ص ۲۹ ۳۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۵ تحفۃ الکرام ص ۳۸۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۰۹۔

ان کے تلامذہ میں حکمرانِ سندھ سلطان حسین بن شاہی بیگ شامل ہیں۔
شیخ عثمان سندھی، ان کو استاذ کے لقب سے ملقب کرتے تھے[۳]

۹۵- مولانا درویش محمد دہلوی

یہ مولانا درویش محمد واعظ تھے جو اصلاً ماوراء النہر کے باشندے تھے۔ وہاں سے ہندوستان آئے اور دہلی میں مقیم ہو گئے۔ شیخِ وقت اور عالمِ فقہ تھے۔ دہلی سے حرمین شریفین گئے۔ وہاں کئی سال مقیم رہے۔ پھر ۹۵۵ھ میں ہندوستان آئے۔ بہت سے مشائخ وصوفیا کی صحبت میں رہے اور ان سے اخذِ فیض کے بعد دوبارہ دہلی میں اقامت گزین ہو گئے۔

عبادت گزار، حسنِ اخلاق کے حامل اور جادۂ صلاح و تقویٰ پر گام زن تھے۔
۹۹۷ھ کو فوت ہوئے[۴]

۹۶- شیخ راجح بن داؤد گجراتی

شیخ راجح کا سلسلۂ نسب یہ ہے: راجح بن داؤد بن محمد بن عیسیٰ بن احمد۔ سرزمینِ ہند کے خطۂ گجرات کے رہنے والے تھے۔ حنفی المسلک تھے۔ حدیث و فقہ اور تمام علوم پر عبور رکھتے تھے۔ ۹ صفر ۸۷۱ھ کو علاقۂ گجرات کے مشہور شہر احمد آباد میں پیدا ہوئے اور اپنے شہر کے عالم محمود بن محمد مقری حنفی سے صرف و نحو، منطق اور عروض وغیرہ کا علم حاصل کیا۔ مخدوم بن برہان الدین سے معانی و بیان کی تحصیل کی۔

---

[۳] تحفۃ الکرام ص ۳۴۳۔ تاریخ معصومی ۲۶۹، ۲۷۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۱۰۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۵۔

[۴] اخبار الاخیار، ص ۲۸۶، ۲۸۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۱۰۔

محمد بن تاج الدین حنفی سے علم ہیئت اور علم کلام کی تکمیل کی۔ یہاں تک کہ تمام مروجہ علوم وفنون اور شعر و شاعری میں درجہ کمال کو پہنچے۔ فہم رسا اور جودتِ طبع کے مالک تھے۔ مکہ مکرمہ میں ۸۹۴ھ کو صاحب الضوء اللامع علامہ سخاوی سے ملے تو الفیۃ الحدیث کی سند و اجازہ ان سے حاصل کی۔ بعد ازاں ہندوستان واپس آئے اور ۹۰۴ھ میں جنت کو سدھارے۔[۱]

۹۷۔ شیخ رحمت اللہ سندھی

شیخ رحمت اللہ بن عبداللہ بن ابراہیم عمری سندھی، علاقہ سندھ کے موضع دربیلہ میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی اور عوام و خواص کی نگاہ میں فضیلت و عظمت کے حامل ہوئے۔ بعد ازاں اپنے والد شیخ عبداللہ کے ہمراہ گجرات تشریف لے گئے۔ پھر حرمین شریفین کا قصد کیا اور وہاں صاحب تنزیہ الشریعۃ شیخ علی بن محمد بن عراق خطیب مدنی اور دیگر ائمہ حدیث سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ پھر شیخ عبداللہ بن سعد اللہ سندھی کی معیت میں مراجعت فرمائے ہند ہوئے اور گجرات میں اقامت اختیار کی۔ چوں کہ حرمین شریفین جانے سے قبل یہ گجرات میں مقیم تھے اور طویل عرصہ تک وہاں رہے تھے، لہٰذا اس شہر کو ان کے اصل وطن کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ وہاں سالہا سال درس و افادہ میں مصروف رہے اور بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ تقویٰ و عزیمت کے حامل تھے۔ قیامِ حجاز کے دوران میں باوجود شدید ضرورت اور تنگ دستی کے کسی سے تحفہ یا نذر قبول نہ کرتے۔ صاحبِ کنز العمال شیخ علی متقی ملتانی بھی ان دنوں حجاز میں مقیم تھے۔ شیخ رحمت اللہ اور شیخ عبداللہ ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے تھے۔ شیخ رحمت اللہ کو عثمانی حکومت کی طرف سے مستحقین اور اصحابِ احتیاج میں تقسیم کرنے کے لیے بہت سا مال و اسباب اور نقدی

---

[۱] تذکرۂ علمائے ہند، ص ۶۲۔ طرب الاماثل بتراجم الافاضل ص ۱۹۶، ۱۹۷۔ نزہتہ الخواطر، ج ۴، ص ۱۱۱۔ یادِ ایام ص ۶۱، ۶۲۔

ارسال کی جاتی، ان میں سے اپنی ذات کے لیے کوئی چیز قبول نہ فرماتے۔

شیخ رحمت اللہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں ایک کا نام کتاب المناسک ہے، جس کا آغاز الحمد للہ اکمل الحمد علیٰ ما ھدانا للاسلام الخ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ مشہور عالم مُلا علی قاری ہروی نے ۱۰۱۲ھ میں المسلك المتقسط فی المنسک المتوسط کے نام سے اس کی شرح لکھی۔

ان کی ایک اور تصنیف منسك الصغیر ہے، اس کی شرح بھی ۱۰۱۰ھ میں شیخ مُلا علی قاری نے سپردِ قلم کی اور اس کو ہدایۃ السالك فی نہایۃ المسالك کے نام سے موسوم کیا۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کا ذکر کیا ہے۔

شیخ رحمت اللہ کے استاذ شیخ علی بن محمد خطیب کی تصنیف کا نام تنزیہ الشریعۃ عن الاحادیث الموضوعۃ ہے۔ انھوں نے اپنے شیخ کی اس کتاب کی تلخیص کی۔

شیخ رحمت اللہ دسویں صدی ہجری کے ارضِ ہند کے وہ بزرگ تھے جو علم و فضل اور تقویٰ و صالحیت کے زیور سے آراستہ تھے۔ شیخ رحمت اللہ سندھی اور شیخ عبداللہ سندھی کو اپنے علم و تقویٰ کی وجہ سے حرمین شریفین میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور دونوں کو شیخین کہا جاتا تھا۔ شیخ رحمت اللہ درج ذیل کتابوں کے مصنف ہیں:

۱۔ المناسك الصغیر: اس کتاب کا قلمی نسخہ برلن لائبریری میں موجود ہے۔

۲۔ لباب المناسك و عباب المسالك: اس کے قلمی نسخے بانکی پور لائبریری اور حیدر آباد (دکن) کے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں۔

۳۔ مجمع المناسك و نفع المناسك: اس کے قلمی نسخے قاہرہ اور ترکی کے کتب خانہ سلیمانیہ میں موجود ہیں۔

۴۔ المناسك الاوسط: اس کا قلمی نسخہ پشاور یونیورسٹی میں موجود ہے۔

۵۔ رسالۃ فی اقتداء بالشافعیۃ و الخلاف بذلك: یہ رسالہ قاہرہ یونیورسٹی میں موجود ہے۔

ان کا انتقال ایک روایت کے مطابق ۸ محرم ۹۹۴ھ کو، اور ایک روایت

کے مطابق ۱۲ محرم ۹۹۳ھ کو مکہ مکرمہ میں ہوا۔ اپنے دور کے شیخ، عالم و فاضل اور محدث و فقیہ تھے[۲]

۹۸۔ شیخ رحمت اللہ گجراتی

شیخ رحمت اللہ بن عزیز اللہ عمری گجراتی، عالم دین اور متوکل علی اللہ تھے۔ مہدِ علم میں پیدا ہوئے اور معرفت و تصوف کی گود میں پرورش پائی۔ اپنے والدِ مکرم شیخ عزیز اللہ گجراتی سے علمِ فقہ اور دیگر علوم کی تحصیل کی، ان ہی سے اخذِ فیض کیا، اور اس میں اتنا آگے بڑھے کہ ان کا شمار دیارِ ہند کے باعمل علما، کبار مشائخ اور اللہ کے صالح بندوں میں ہونے لگا۔ صلاح و تقویٰ، زہد و عبادت، ورع و استقامت اور عفت و توکل میں اونچے مرتبہ پر فائز تھے۔ والد کی وفات کے بعد مسندِ مشیخت پر متمکن ہوئے، اور ان سے بے شمار لوگوں نے استفادہ و استفاضہ کیا۔ اس عالم و فقیہ اور شیخ کبیر نے ۱۹ جمادی الاخریٰ ۹۶۷ھ کو وفات پائی[۳]

۹۹۔ شیخ رفیع الدین محدث شیرازی

شیخ رفیع الدین بن مرشد الدین حسینی صفوی شیرازی ثم ہندی اکبر آبادی، بہت بڑے عالمِ دین اور محدث تھے اور ہندوستان کے نامور اور جید علما میں سے تھے۔ علم و عمل کے ساتھ ساتھ جودت و سخا اور لطف و کرم کی دولت سے بھی بہرہ ور تھے۔ علامہ جلال الدین محمد بن اسعد صدیقی دوانی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ حج و زیارت کا شرف بھی حاصل

---

[۲] اذکارِ ابرار ص ۵۰۴ — اخبار الاخیار ص ۲۸۰، ۲۸۱ — نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۱۲، ۱۱۳ — کشف الظنون ج ۲ ص ۱۸۳۱ — طرب الاماثل بتراجم الافاضل ص ۱۹۷۔ ابجد العلوم ص — ہدیۃ العارفین ج ۱ ص ۳۶۶ — تذکرہ علمائے ہند ص ۶۲، ۲۶۵ — تحفۃ الکرام ص ۴۳، ۴۴، ۴۴۴

[۳] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۱۳، ۱۱۴ — اذکارِ ابرار ص ۲۰۴، ۲۰۵۔

کیا۔ سرزمین حجاز میں صاحب الضوء اللامع شیخ شمس الدین محمد بن عبد الرحمن سخاوی مصری سے علم حدیث کی تحصیل کی اور عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے۔ بعد ازاں واردِ ہند ہوئے اور سلطان سکندر لودھی کے عہد حکومت میں آگرہ کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ سکندر لودھی ان سے انتہائی تکریم سے پیش آتا اور انھیں حضرت عالی قدر کے الفاظ سے مخاطب کرتا تھا۔ اس جلیل القدر عالم حدیث نے ۹۵۴ھ کو آگرہ میں وفات پائی[۱۵۴]

۱۰۰۔ شیخ رکن الدین بیانوی

شیخ رکن الدین بن محمود بیانوی، شہر بیانہ میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی اور وہیں اپنے عہد کے اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ بعد کو بیانہ سے مانڈو چلے گئے تھے اور پھر وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شیخ صالح اور عالم باعمل تھے۔ فقہ اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ گھر ہی میں سلسلۂ تدریس جاری کر رکھا تھا۔ نماز کے علاوہ گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ ۴ جمادی الاولیٰ ۹۹۲ھ کو فوت ہوئے[۱۵۵]

۱۰۱۔ شیخ رکن الدین سندھی

شیخ رکن الدین سندھی حنفی المسلک تھے۔ شیخ بلال محدّث تلھتی کے شاگرد تھے متو کے عرف سے معروف تھے۔ اپنے عصر کے فاضل بزرگ تھے۔ حدیث اور فقہ کے جیّد و ممتاز علما میں سے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں شرح الاربعین، شرح خلاصہ کیدانی اور کچھ اور رسائل شامل ہیں۔ ۹۴۹ھ کو ٹھٹھہ میں

---

[۱۵۴] اخبار الاخیار ص ۲۵۱، ۲۵۲ — مفتاح التواریخ ص ۱۵۶ — تذکرۂ علمائے ہند ص ۶۵ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۱۵

[۱۵۵] اذکارِ ابرار ص ۳۷۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۱۵، ۱۱۶۔

وفات پائی۔[۶۵]

ز

۱۰۲۔ شیخ زین الدین بن عبدالعزیز مالاباری

شیخ زین الدین بن عبدالعزیز بن زین الدین بن علی مالاباری، ہندوستان کے علاقہ مالابار میں فروکش تھے اور اس نواح میں بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ شافعی المسلک تھے اور اپنے دور کے مشہور اور نامور فقیہ تھے۔ تمام علوم مروّجہ کے ماہر تھے۔ مکہ مکرمہ میں شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیثمی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ فقہ شافعی میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ اس موضوع سے متعلق قرۃ العین فی مہمات الدین کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ ۹۸۲ھ میں ایک مختصر رسالے کی بسیط و مفصل شرح سپرد قلم کی، جس کو فتح المعین شرح قرۃ العین کے نام سے موسوم کیا۔ ارشاد العباد الی سبیل الرشاد کے نام سے ایک رسالہ لکھا جو نصیحت و موعظت سے متعلق ہے۔ ان کی ایک تصنیف تحفۃ المجاہدین ہے۔ ایک اور رسالہ بھی ہے، جو مواعظ کے بارے میں احادیث و آثار کو محیط ہے۔

اس عظیم المرتبت شافعی عالم و فقیہ کے حالات اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوسکے۔ انھوں نے ۹۹۱ھ کو وفات پائی۔ شافعی فقہ کے متعلق مالابار کے علاقے میں ان کی تصنیفات بہت مقبول ہیں۔[۱]

۱۰۳۔ شیخ زین الدین بن علی مالاباری

شیخ زین الدین بن علی بن احمد مالاباری طلوعِ آفتاب کے بعد جمعرات کے روز ۱۲ شعبان ۸۷۱ھ یا ۸۷۲ھ کو علاقہ مالابار کے ایک شہر کش میں پیدا ہوئے۔ ابھی

---

[۶۵] تاریخ معصومی ص ۲۷۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۱۶۔

[۱] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۱۷، ۱۱۸۔ عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ ص ۹۸۔

کم عمر ہی تھے کہ ان کے عم محترم قاضی زین الدین بن احمد مالا باری جب فنان کے قاضی مقرر ہوئے تو انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ وہیں قرآن مجید پڑھا، حفظ کیا اور مختلف علما و شیوخ سے صرف و نحو اور فقہ وغیرہ علوم کی مختلف کتابیں پڑھیں۔

مشہور عالم شیخ شہاب الدین احمد بن عثمان بن ابوالحل یمنی سے حدیث اور فقہ کی تکمیل کی۔ علم فرائض کی کتاب الکافی بھی ان سے پڑھی۔

شیخ ابو بکر فخر الدین بن قاضی رمضان شالیاتی مالا باری کے سامنے فقہ اور اصول کے لیے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ شیخ موصوف نے شیخ شمس الدین جوجری، شیخ زکریا انصاری اور شیخ کمال الدین محمد بن ابوشریف وغیرہ علمائے دین سے اخذِ علم کیا۔

طریقت و تصوف سے بھی لگاؤ تھا اور شیخ قطب الدین بن فرید الدین بن عز الدین اجودھنی سے طریقہ چشتیہ کے مطابق اخذ فیض کیا تھا۔

شیخ زین الدین مالا باری شافعی مسلک کے حامل تھے۔ امام وقت، علامہ دہر اور شیخ عصر تھے۔ عالم باعمل اور محقق تھے۔ ناشر علم و معرفت اور کثیر الاذکار و الاشغال تھے۔ تمام وقت نیکی و خیر کی اشاعت اور تلقینِ نصیحت و موعظت میں مصروف رہتے بدعات و منکرات کی مخالفت، سنت کی ترویج، مظلوم کی حمایت اور اسلام کی تبلیغ ان کا اصل کام تھا۔ ان کی وجہ سے نواح مالا بار میں بہت سی بدعات ختم ہوئیں، سنت کی اشاعت کے مواقع پیدا ہوئے، علمِ دین پھیلا اور بے شمار غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

شیخ ممدوح متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے، جن میں سے چند یہ ہیں:

مرشد الطلاب الی الکریم الوہاب: یہ بڑی ضخیم کتاب ہے۔

سراج القلوب: یہ ان کی متوسط اور جامع تصنیف ہے۔

المسعد فی ذکر الموت: یہ کتاب ذکرِ موت کے موضوع سے متعلق ہے۔

شمس الہدیٰ: یہ تذکیر و موعظت پر مشتمل ہے۔

تحفۃ الاحیاء و حرفۃ الالباء: یہ ادعیہ ماثورہ سے متعلق ہے۔

ارشاد القاصدین فی اختصار منہاج الدین: یہ امام غزالی کی تصنیف کا

اختصار ہے۔

ایجی کی شعب الایمان کا عربی میں ترجمہ کیا۔

کفایۃ الفرائض : یہ الکافی کا اختصار ہے جو فرائض کے موضوع سے متعلق ہے۔

الصفا من الشفا : قاضی عیاض کی الشفا کا اختصار ہے۔

تسھیل الکافیہ : شرح کافیہ ابن حاجب۔ علم نحو کے بارے میں ہے۔

کفایۃ الطالب فی حل کافیۃ ابن الحاجب : یہ کافیہ پر حاشیہ ہے۔

الفیہ ابن مالک پر مختصر حاشیہ۔ یہ علم نحو میں ہے۔

ابن الوردی کی التحفہ پر دو حاشیے سپرد قلم کیے۔

ابن مقری کی الارشاد پر حاشیہ۔

قصص و اخبار انبیا کے بارے میں ایک تصنیف۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک کتاب۔

ھدایۃ الاذکیاء الیٰ طریقۃ الاولیاء۔

سلوک و تصوف کے موضوع پر ایک قصیدہ۔

تحریض اھل الایمان علیٰ جھاد عبدۃ الصلبان : یہ کتاب اس زمانے میں تصنیف کی، جب پرتگالی مالا بار پر حملہ آور ہوئے تھے، اس میں انھوں نے غلبہ حاصل کر کے فتنہ و فساد پھیلا دیا تھا، اور بہت سے علاقوں کو نذرِ آتش کر دیا تھا۔

نظم و نثر پر مشتمل اور بہت سے رسائل و مکاتیب ہیں جو انھوں نے ملوک و امرا کے نام تحریر کیے۔

مالا بار کے اس شافعی المسلک عالم و فقیہ اور مصنف و محقق نے جمعہ کی رات نصف شب کے بعد ۷ شعبان ۹۲۸ھ کو فنان میں وفات پائی۔[۵۲]

---

۵۲ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۱۸، ۱۱۹ — عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ۔ ص ۳۱۸، ۳۱۹۔

س

۱۰۴۔ شیخ سالار بن ہبتہ الدین کوروی

شیخ سالار بن ہبتہ الدین کوروی ارضِ ہند کے ایک مقام کوڑہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ صغر سنی ہی میں اپنے شہر کے اساتذہ سے حصولِ علم میں مشغول ہو گئے تھے بعد ازاں دوسرے شہروں میں گئے اور علومِ ظاہری و باطنی سے بہرہ یاب ہوئے، جن حضرات سے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا، ان میں شیخ یعقوب سوسی، شیخ شمس الدین جون پوری، شیخ نظام الدین فتح پوری اور شیخ بہاء الدین جون پوری خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے شہر واپس آئے اور علوم و معارف کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو گئے۔

شیخ سالار حنفی المسلک تھے اور اپنے عصر کے عالم و فقیہ، زاہد و عابد، عفیف و متقی، پیکرِ دیانت و متانت اور کثیر التعبد بزرگ تھے۔ ان کے اعقاب و اخلاف میں بہت سے علما پیدا ہوئے۔ انھوں نے بدھ کے روز ۲۷ ربیع الثانی کو ایک روایت کے مطابق، ۸ ربیع الاول ۹۴۶ھ کو وفات پائی۔[1]

خطۂ ہند کے اس جیّد عالم اور صاحبِ طریقت فقیہ کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔ معلوم ہوتا ہے، ان کا شمار ان فقہائے ہند میں ہوتا تھا، جو کسی کتاب کے مصنف نہ تھے۔

۱۰۵۔ شیخ سعد الدین لاری

شیخ سعد الدین لاری ثم ہندی مانڈوی، عالم وقت اور عظیم محدّث تھے اور برصغیر پاک و ہند کے ان ذی مرتبت حضرات میں سے تھے جو تفسیر و حدیث میں عبور

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۲۱۔

رکھتے تھے۔ ۱۱ جمادی الاولیٰ ۹۰۲ھ کو شہر مانڈو میں فوت ہوئے۔ ان کی وفات پر لوگوں نے انتہائی حزن و ملال کا اظہار کیا۔[۲]

۱۰۶۔ مولانا سعد اللہ لاہوری

مولانا سعد اللہ بن ابراہیم بن فتح اللہ ملتانی لاہوری ۹۲۱ھ کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ بعض کتب درسیہ اپنے والد شیخ ابراہیم سے پڑھیں اور ۹۳۲ھ تک ان سے انسلاک و وابستگی اختیار کیے رکھی۔ والد کی وفات بھی ۹۳۲ھ میں ہوئی۔ اسی سال یا اس سے کچھ عرصہ بعد ملتان سے لاہور آ گئے، وہاں شیخ عبدالرحمٰن بن عزیز اللہ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ بختاور خاں کی روایت کے مطابق علم حاصل کرنے کے بعد شیخ بایزید دیپال پوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ پھر ایک ایسا دور آیا کہ اپنے عہد کے شیخ اور فاضل عالم دین بن گئے اور کثرتِ درس و افادہ میں ان کا شمار اس زمانے کے مشہور علما میں ہونے لگا۔ ان کا سلسلہ درس لاہور میں جاری تھا اور علوم کے مختلف گوشوں کی تدریس میں خاص شہرت کے حامل تھے۔ ان سے خلقِ کثیر نے استفادہ کیا، جن میں خطۂ لاہور کے معروف عالم شیخ منور بن عبدالمجید بھی شامل ہیں۔

انھوں نے اٹھتّر سال عمر پا کر ۹۹۹ھ میں وفات پائی۔[۳]

۱۰۷۔ شیخ سعد اللہ بیانوی

شیخ سعد اللہ بیانوی، بڑے فاضل آدمی تھے، اور صالح علمائے دین میں سے تھے۔ علمِ نحو پر بہت عبور رکھتے تھے، اس لیے نحوی مشہور ہوئے۔ مشرقی ہند

---

[۲] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۲۲

[۳] اذکار ابرار ص ۴۷۴۔ طبقاتِ اکبری ۳۹۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۲۳۔

کے باشندے تھے۔ اپنے عصر کے اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ تصوف و طریقت سے بھی تعلق تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہندوستان کے معروف شہر بیانہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور اسی شہر کو درس و افادہ کا مرکز ٹھہرا لیا تھا۔ یہاں تک کہ تمام اصنافِ علوم کے حصول کے لیے لوگ ان ہی کی طرف رجوع کرنے لگے۔

ذکاوت و فطانت میں اپنے دَور کے فقید المثال عالم تھے۔ نحو میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے اور اس سلسلے میں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں ملا عبدالقادر بدایونی بھی شامل ہیں، جو سلیم شاہ سوری کے عہد کے آخری دنوں میں اپنے نانا کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور ان سے کافیہ پڑھا تھا۔ تاریخِ وفات ۹۸۹ھ ہے۔[۴]

۱۰۸۔ مولانا سعد اللہ سندھی

مولانا سعد اللہ سندھی، حنفی المسلک تھے، علم و فضل میں یگانہ تھے اور ارضِ ہند کے اجل اور جید علما میں سے تھے۔ کثرتِ معلومات کا یہ حال تھا کہ حصولِ علم کے لیے دُور دراز سے لوگ ان کی خدمت میں آتے تھے۔ ان کے لڑکے کا نام عبداللہ تھا، جنھوں نے قاضی عبداللہ بن ابراہیم سندھی کے ساتھ مکہ مکرمہ کو ہجرت کر لی تھی۔[۵] دسویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کے اس عالم و محقق کے حالات کا اس سے زیادہ علم نہیں ہو سکا۔

۱۰۹۔ شیخ سعید حبشی

شیخ سعید بن ابو سعید حبشی، صالح عالم دین تھے اور کبار علمائے عصر میں سے گردانے

---

[۴] منتخب التواریخ ص ۳۱۵۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۷۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۴

[۵] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۲۴، ۱۲۵۔

جانتے تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس درجہ متعصب مقلد تھے کہ اکثر اوقات ان کی حمایت میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تنقیص پر اتر آتے تھے۔ اپنے دور کے فقیہ اور بہت سے علوم کے ماہر تھے۔ حافظِ قرآن تھے۔ عام طور پر تلاوتِ قرآن میں مصروف رہتے۔ حبشی امراء ان کو بے حد لائق تعظیم قرار دیتے اور ان کی مالی امداد کرتے تھے۔ حصولِ علم کا شوق ہمیشہ دامن گیر رہا۔ حج بیت اللہ کے لیے گئے تو وہاں شیخ ابنِ حجر ہیثمی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ ۹۹۱ھ کو احمد آباد میں وفات پائی۔[۵۶]

ان کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔

۱۱۰۔ شیخ سلیمان بن عفان مانڈوی

شیخ سلیمان بن عفان دہلوی مانڈوی، بہت بڑے عالم و فقیہ بھی تھے اور صاحبِ طریقت و تصوّف اور عارف باللہ بھی۔ وعظ و ارشاد اور لوگوں کی دینی تلقین و تربیت میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اشاعتِ علم و دین میں مختلف بلاد و امصار میں گھومے پھرے اور بہت سے علما و مشائخ سے ملاقات کی۔ دیگر علوم کے علاوہ تجوید و قرأت کے بھی ماہر تھے۔ مولانا عبدالقدوس حنفی گنگوہی نے ان سے اخذِ فیض کیا، تجوید سیکھی۔ وہ عرصہ دراز تک ان کی خانقاہ میں مقیم رہے۔

شیخ سلیمان پہلے دہلی میں اقامت گزین تھے۔ حملۂ تیمور کے زمانے میں دہلی سے مانڈو گئے اور کچھ مدت وہاں مقیم رہنے کے بعد گجرات چلے گئے۔ گجرات سے عازم حرمین شریفین ہوئے اور پورے پچاس سال وہاں اقامت اختیار کیے رکھی۔ واپس ہندوستان آئے تو مانڈو کو اپنا مسکن قرار دیا۔

اس عالم و فقیہ نے ۱۴ محرم ۹۴۴ ہجری کو دہلی میں وفات پائی اور وہیں

---

[۵۶] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۲۵ بحوالہ النور السافر۔

دفن کیے گئے ؎۱

۱۱۱۔ شیخ سماء الدین ملتانی

شیخ سماء الدین بن فخر الدین ملتانی دہلوی، ۸۰۸ھ کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ حصول علم کی طرف صغر سنی ہی میں راغب ہو گئے تھے، چنانچہ میر سید شریف جرجانی کے تلمیذ مولانا ثناء الدین ملتانی کے حلقہ درس میں داخل ہوئے اور ان سے ظاہری علوم کی تکمیل کی۔ تصوف و طریقت میں شیخ کبیر الدین حسینی بخاری سے استفاضہ کیا۔ علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر، فنون رسمیہ و ظاہریہ میں کامل، ورع و تقویٰ میں یکتا اور عفت و قناعت میں بے مثل تھے۔ عرصہ تک ملتان میں مسند تدریس بچھائے رکھی اور بے شمار تشنگان علوم کو مختلف علوم کی تعلیم دی۔ بعض واقعات کی بنا پر ملتان سے رنتھنبور اور وہاں سے بیانہ چلے گئے تھے۔ پھر دہلی آ گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ سلطان بہلول لودھی کے عہد کے عالم دین تھے۔ آخر عمر میں بصارت زائل ہو گئی تھی اور پھر بغیر کسی دوا و علاج کے اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے خود بخود آنکھیں ٹھیک ہو گئی تھیں۔

نہایت باوقار، بارعب، عظیم المرتبت، متورع اور بلند کردار عالم دین تھے۔ دنیا سے کوئی شغف و تعلق نہ تھا۔ ہمیشہ درس و افادہ میں مصروف رہتے اور دین کی تبلیغ کرتے۔

کنبوہ، برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ کہتے ہیں، یہ کنب کی طرف منسوب ہے، جو غزنی کے قریب ایک آبادی کا نام ہے۔ اس میں واؤ نسبتی ہے۔ یعنی باشندگان کنب کو کنبو کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غزنی سے وارد ہند ہوئے اور یہاں آ کر کنبو کہلائے۔

؎۱ اخبار الاخیار، ص ۲۲۱۔ اذکار ابرار، ص ۳۴۳، ۳۴۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۲۹۔

دوسری روایت یہ ہے کہ یہ دراصل فارسی لفظ "انبوہ" کا مخفف ہے۔ یعنی چھوٹا گروہ۔ یہ ایک ایسی جماعت تھی جو بہت کم افراد پر مشتمل تھی اور اس نے ایسے لوگوں پر غلبہ حاصل کیا تھا جو تعداد میں ان سے کہیں زیادہ تھے، پھر آہستہ آہستہ ایک برادری کی شکل اختیار کر گئے اور کثرتِ استعمال سے ان کو کم انبوہ کے بجائے کنبوہ کیا جانے لگا۔

شیخ سماء الدین ملتانی مصنف و محشی بھی تھے۔ انھوں نے شیخ فخر الدین عراقی کی لمعات پر حواشی تحریر کیے، جو اس کے حلِ مطالب و معانی میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ رسالہ مفتاح الاسرار ان کی تصنیف ہے۔

انھوں نے ۱۷ جمادی الاولیٰ ۹۰۱ھ کو دہلی میں وفات پائی ؎[۵]

ش

۱۱۲۔ شاہی بیگ قندھاری ارغون

شاہی بیگ بن ذی النون ارغون قندھاری، قندھار کا بادشاہ تھا جو اپنے باپ ذی النون کی وفات کے بعد وارثِ تخت بنا۔ یہ فاضل اور عالم بادشاہ تھا۔ ایک مدت تک قندھار کے تختِ حکومت پر متمکن رہا۔ پھر مغل حکمران ظہیر الدین بابر نے اس سے حکومت چھین کر ملک پر قبضہ کر لیا اور یہ سندھ میں آگیا اور سندھ کو فتح کر کے اس پورے علاقے پر اپنا پرچم اقتدار لہرا دیا۔

شاہی بیگ، معقولات و منقولات کا جید عالم تھا اور متعدد کتابوں کا مصنف تھا جن میں ایک علم نحو کی منتہی کتاب کافیہ ابنِ حاجب کی شرح ہے۔ دوسری کتاب

؎[۵] اخبار الاخبار، ص ۲۱۱، ۲۱۲ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۰، ۸۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۳۰، ۱۳۱ — مفتاح التواریخ، ص ۱۳۰۸ — حدائق الحنفیہ ص ۳۵۵، ۳۵۶ — اذکارِ ابرار، ص ۱۰۹، ۱۱۰ — المشاہیر، ص ۲۷، ۴۶۔

شرح المطالع پر تعلیقات ہیں۔ علمِ فرائض و میراث کے بارے میں سید شریف کی مشہور شرح السراجیہ پر بھی شاہی بیگ نے تعلیقات سپردِ قلم کیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کتب و رسائل پر تعلیقات و حواشی لکھے۔

شاہی بیگ بڑا متدین بادشاہ تھا اور قرآن سے بہت تعلق رکھتا تھا۔ زندگی کی آخری منزل میں داخل ہوا تو حافظ محمد شریف کو طلب کیا اور سورہ یٰس پڑھنے کو کہا۔ انھوں نے سورۂ یٰس شروع کی اور وَمَالِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ[1] تک پہنچے تو بادشاہ نے کہا

تو گفت اے قاری اعادہ کن۔

قاری دوبارہ پڑھو۔

چوں بآیۂ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ[2] رسید جان بحق تسلیم کرد۔

یعنی جب قاری آیت: قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ پر پہنچا تو جان اللہ کے حوالے کر دی۔

شاہی بیگ نے ۲ شعبان ۹۲۸ھ کو وفات پائی اور سندھ کے شہر بھکر میں دفن کیے گئے۔ بعد ازاں ان کی نعش کو مکہ مکرمہ میں منتقل کر دیا گیا اور قبرستانِ معلّٰی میں سپردِ خاک کیا گیا[3]۔

---

[1] یٰس: ۲۲۔ ترجمہ: اور میرے پاس کون سا عذر ہے کہ میں اس (معبود) کی عبادت نہ کروں، جس نے مجھ کو پیدا کیا اور تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

[2] یٰس: ۲۶، ۲۷۔ ترجمہ: کہنے لگا کاش میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میرے پروردگار نے مجھ کو بخش دیا۔

[3] تفصیل کے لیے دیکھیے: مآثر رحیمی، ج ۲، ص ۲۸۴ تا ۲۹۶ – تاریخ فرشتہ، ج ۲ ص ۵۱۳، ۵۱۴ – تحفۃ الکرام، ص ۱۷۵ تا ۲۰۸ – تاریخ معصومی بسلسلہ ارغون حکومت ص ۱۱ اور اس سے آگے۔

۱۱۳- شیخ شرف الدین شیرازی

شیخ شرف الدین شیرازی فاضل آدمی تھے اور اپنے عصر کے مشہور علما میں سے تھے۔ شیراز میں پیدا ہوئے اور وہیں ترتیب و تعلیم کی منزلیں طے کیں۔ تکمیل تعلیم کے بعد وارد ہند ہوئے اور شیخ محمد غوث گوالیاری سے اخذ طریقت کیا۔ ایک مدت تک احمد آباد میں ان سے منسلک رہے۔ پھر بیجا پور تشریف لے گئے اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ انھوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ تحریر کیا۔ ۹۳۴ھ میں فوت ہوئے[۴۲]۔

۱۱۴- مولانا شعیب واعظ دہلوی

مولانا شعیب بن مفتی منہاج دہلوی دراصل لاہور کے باشندے تھے اور صغر سنی ہی میں طلب علم کی غرض سے لاہور سے دہلی چلے گئے تھے اور پھر وہیں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی تھی، اس لیے دہلوی کہلائے۔ دہلی میں سکونت واقامت کی ایک وجہ یہ تھی کہ سلطان سکندر لودھی کے عہد میں شہر دہلی کے مفتی مقرر ہو گئے تھے۔ شیخ وقت اور صالح عالم دین تھے۔ مسلکی اعتبار سے حنفی تھے۔ بہت بڑے واعظ اور مذکر ونا صح تھے۔ اپنے والد سے کسب علم کیا اور بلند مرتبہ کو پہنچے۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ حسن سیرت اور حسن صورت کے مالک تھے۔ علم و عمل اور تذکیر و موعظت میں بے مثال تھے۔ نہایت موثر وعظ کہتے تھے۔ ان کی مجالس وعظ میں علما بھی حاضری دیتے تھے اور بہت متاثر ہوتے تھے۔ ان کی گفتگو کی اثر انگیزیوں کا یہ عالم تھا کہ ہر بات سننے والے کے دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔ ناممکن تھا کہ ان کی مجلس وعظ کے قریب سے کوئی گزرے اور بغیر سنے چلا جائے۔ وعظ میں قرآن مجید کی آیات

---

[۴۲] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۳۷، ۱۳۸۔

پڑھتے اور نصیحت آموز واقعات بیان کرتے۔

اس عالم باعمل اور مشہور واعظ نے ۹۳۶ھ کو وفات پائی اور دہلی میں حوض شمسی کے قریب مدفون ہوئے[۵]

۱۱۵- شیخ شکر گجراتی

شیخ شکر نائطی گجراتی، علاقہ گجرات کے نامور عالم و فقیہ تھے اور اللہ کے نیک اور متقی بندوں میں سے تھے۔ ان کی جائے پیدائش موضع بھیمڑی ہے۔ یہ موضع اس زمانے میں شہر احمد نگر سے تین دن کی مسافت پر واقع تھا۔ اپنے عصر کے اساتذہ سے علم حاصل کیا اور درس و افادہ میں مصروف ہو گئے۔ مدتِ مدید تک خدمتِ تدریس انجام دیتے رہے۔ پھر بحث و اشتغال کو ترک کر کے زہد و عبادت کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔ ان کا انتقال ۹۷۰ھ کے قریب ہوا[۶]

علاقہ گجرات کے اس جید عالم و فقیہ کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔

۱۱۶- قاضی شکر اللہ سندھی

قاضی شکر اللہ کا نسب نامہ یہ ہے۔ شکر اللہ بن وجیہ الدین بن نعمت اللہ بن عرب شاہ بن میرک شاہ بن جمال الدین محدث حسنی دشتکی شیرازی، شیخِ وقت اور عالمِ کبیر تھے۔ فقہ و اصول اور علومِ عربیہ کے ماہر تھے۔ اصلاً ہرات کے رہنے والے تھے۔ ۹۰۶ھ میں ہرات سے قندھار منتقل ہو گئے۔ اکیس سال قندھار میں مقیم رہے اور ۹۲۷ھ کو علاقہ سندھ میں داخل ہوئے اور ٹھٹھہ میں سکونت اختیار

---

[۵] لطائف قدوسی ص ۶۱ — اخبار الاخیار، ص ۲۲۵، ۲۲۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۸۵ — تذکرہ علمائے ہند ص ۸۵

[۶] اذکار ابرار ص ۳۰۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۳۸۔

کی۔ اس زمانے میں سلطان شاہی بیگ ارغون سندھ کے اورنگِ سلطنت پر متمکن تھا۔ یہ حکمران خود بھی عالم تھا اور علم و علما کا بھی قدر دان تھا۔ نیکی اور دینداری سے بھی بہرہ ور تھا۔ اس سے شیخ شکر اللہ کی ملاقات ہوئی تو وہ ان کے علم و فضل، حدیث و فقہ پر عبور، امورِ دینی میں مہارت، معاملاتِ شرعی میں انہماک، حسنِ سیرت اور بلندیٔ کردار سے بہت متاثر ہوا اور ان کو ٹھٹھہ کے منصبِ قضا پر فائز کر دیا، جس پر وہ کئی سال تک متمکن رہے۔

شاہی بیگ کی وفات کے بعد ۹۲۸ھ میں اس کا بیٹا حسین، تختِ سندھ کا مالک بنا۔ یہ عادل و منصف، عالم و کریم، محبِ اہلِ علم اور نیک بادشاہ تھا۔ قاضی شکر اللہ، اس کے عہد میں بھی بدستور مسندِ قضا پر متمکن رہے۔ یہ بھی ان کے فہم و فراست علم و فقاہت اور معدلت گستری سے متاثر تھا اور اسی بنا پر ان کی قدر کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اہم منصب کی ذمہ داریوں کو انھوں نے نہایت وقار و احترام اور دبدبہ و طنطنہ کے ساتھ انجام دیا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ سلطان حسین نے بعض تاجروں سے چند گھوڑے خرید کیے اور ان کی قیمت ادا کرنے سے تساہل و تاخیر سے کام لیا۔ تاجروں نے بادشاہ کے رویّے سے تنگ اور مایوس ہو کر قاضی شکر اللہ سے رجوع کیا اور ان کی عدالت میں بادشاہ کے خلاف مدعی بن کر حاضر ہوئے۔ قاضی موصوف نے مدعا علیہ کی حیثیت سے بادشاہ کو عدالت میں طلب کیا۔ بادشاہ عدالت میں حاضر ہوا تو اسے مدعی تاجروں کے ساتھ کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا۔ دعویٰ پیش ہوا تو قاضی کے سوال کرنے پر مدعا علیہ بادشاہ نے تاجروں کے موقف کی تصدیق کی اور قیمت ادا نہ کرنے کا اقرار کیا۔ قاضی نے فریقین کے بیان سن کر اور بادشاہ کے اقرار کرنے پر، تاجروں کے حق میں فیصلہ دیا اور سلطان نے تاجروں کو قیمت ادا کر دی۔ فیصلہ سنانے کے بعد قاضی شکر اللہ اپنی جگہ سے اُٹھے، قاعدہ کے مطابق آدابِ سلطانی بجا لائے اور سلطان کو اپنے پاس بٹھایا۔ اب بادشاہ نے تلوار نکالی جو اس نے قبا میں چھپا رکھی تھی اور اسے قاضی کے سامنے رکھتے

ہوئے کہا:

"یہ تلوار میں نے آپ کے لیے رکھی تھی۔ اگر آپ صحیح فیصلہ نہ کرتے اور میرے آداب و لحاظ میں اپنے منصب و مقام کی بلندی کا خیال نہ رکھتے تو اس تلوار سے آپ کی گردن اڑا دیتا۔"

قاضی شکر اللہ نے بھی بادشاہ کی یہ بات سن کر مسند کے نیچے سے برہنہ تلوار نکال کر دکھائی اور کہا: "میں نے بھی یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ مبادا بادشاہ خلافِ شریعت قدم اُٹھائے اور کوئی شخص اس کو ٹوکنے کی جرأت نہ کرے تو میں خود اس تلوار سے سیاستِ شرعی بجا لاؤں گا۔"

اس کے بعد سلطان اس فیصلے پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے عدالت سے باہر نکل گیا۔ اس نے تاجروں کو صرف اس لیے قیمت ادا کرنے میں تساہل سے کام لیا تھا کہ وہ قاضی شکر اللہ کو اپنے بارے میں آزمانا چاہتا تھا اور اسے یہ معلوم کرنا مقصود تھا کہ بادشاہ کے خلاف اس مقدمہ کے سلسلے میں قاضی صحیح فیصلہ کرتا ہے یا نہیں؟

اس واقعہ سے کچھ عرصہ بعد قاضی شکر اللہ منصبِ قضا سے الگ ہو گئے تھے اور لوگوں سے منقطع ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔[۵۷]

قاضی شکر اللہ کا خاندان، ٹھٹھہ میں ساداتِ شکر اللہی شیرازی کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ خانوادہ علم و فضل اور دینی مرتبے کی بنا پر دوسروں سے ممتاز رہا ہے۔ یہ خاندان اب بھی اپنے قدیم محلے میں آباد ہے۔[۵۸]

۱۱۷۔ مولانا شمس الحق جون پوری

مولانا شمس الحق جون پوری حنفی، شیخ کامل اور صالح عالمِ دین تھے۔ علم و معرفت

---

۵۷ تحفۃ الکرام، ص ۵۹۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۳۸، ۱۳۹

۵۸ ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ۔ بابت ماہ جون ۱۹۴۷ مضمون "فتاویٰ عالم گیری کے دو سندھی مؤلفین اور ان کے اجداد"

میں یگانہ تھے اور اس ضمن میں اپنے تمام اقران و معاصرین سے فوقیت لے گئے تھے۔ ان کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ جس سے بے شمار علما و طلبا استفادہ کرتے تھے۔ کلمۂ حق کہنے میں بے باک تھے اور بغیر کسی خوف اور ملامت کے ہر ایک کے سامنے حق بات کہتے تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا پیشہ تھا۔ علومِ متداولہ میں ماہر تھے۔ حق گوئی کی وجہ سے لوگوں میں مولانا شمس الحق جون پوری حقانی مشہور تھے۔ ۲۸ محرم ۹۵۰ھ کو جون پور میں فوت ہوئے۔[۹]

۱۱۸۔ علّامہ شمس الحق گیلانی

علّامہ شمس الحق گیلانی، جلال الدین اکبر کے عہد کے عالم و فاضل تھے۔ فقہ و اصول، علمِ نحو اور منطق و فلسفہ میں عدیم النظیر تھے۔ بہت بڑے طبیب بھی تھے، اور حکیم الملک کے عرف سے معروف تھے۔ ہمیشہ درس و افادہ میں مصروف رہے اور بے شمار لوگوں نے ان سے کسب فیض کیا۔ سخی، کریم النفس، راسخ العقیدہ، صادق القول اور حق پرست عالمِ دین تھے۔ طلبا سے بدرجہ غایت تعلق خاطر اور ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کے تمام اخراجات خود ادا کرتے اور ان کے بغیر کھانا نہ کھاتے تھے۔ صرف اس بنا پر کسی مجلس میں نہ جاتے کہ درس کا وقت ضائع ہوگا اور طلبا پریشان ہوں گے۔ تمام علوم میں یکساں عبور رکھتے تھے۔

شاہِ ہند جلال الدین اکبر ان کی بے حد قدر کرتا تھا اور اس کے تمام امرا، مصاحبین ان کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ضرورت مندوں کی سفارش اور ان کی امداد میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرتے۔ احکامِ شریعت کی پابندی اور دین داری میں رسوخ کا یہ عالم تھا کہ جب اکبر کے خیالات میں فسق و فجور نے غلبہ پایا اور علمائے

---

۹ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۴۳ بحوالہ گنجِ ارشدی۔

سوء نے اس کی تائید کرنا شروع کی تو علامہ شمس الحق نے کھل کر ان کی مخالفت کی اور علمائے سوء کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس باب میں نہ کسی سے کبھی خوف زدہ ہوئے اور نہ کسی مروت میں آئے۔ ہمیشہ کلمۂ حق بلند کیا اور بلا خوف و خطر کیا۔

مُلّا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ان کے علم و فضل اور تدین و تقوٰی کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہ یوں تو تمام علوم کے ماہر تھے مگر طب میں تو جالینوسِ زماں اور مسیحِ دوراں تھے۔ ابو علی سینا اور جالینوس وغیرہ حکما کے بے حد مداح تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے یہ واقعہ تحریر کیا ہے کہ ایک دن شیخ سلیم چشتی کی مجلس میں بیٹھے فقہ، نصابِ مدارس اور فقہا کے واقعات بیان کر رہے تھے، ساتھ ہی اطبا کی تعریف و توصیف اور شیخ بوعلی سینا کی خوبیاں اور اوصاف کا تذکرہ فرما رہے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب دورِ اکبر کے علما و حکما ایک دوسرے سے الجھ کر اپنے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں لڑنے بھگڑنے میں مصروف تھے۔ وہ کہتے ہیں، میں ابھی نیا نیا دربارِ اکبری میں گیا تھا، کسی سے جان پہچان نہ تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ شیخ سلیم چشتی اور علامہ شمس الحق گیلانی کے درمیان کیا مسئلہ موضوع بحث ہے۔ تاہم میں نے ان کی چند باتیں سُن کر شیخ شہاب الدین سہروردی کے یہ اشعار پڑھ دیے:

وکم قلت للقوم انتم علی | شفا حفرة من کتاب الشفا
فلما استهانوا بتو بیخنا | فرغنا الی الله حسبی کفا
فماتوا علی دین اسطاطلیس | وعشنا علی ملة المصطفا

مزید تائید کے لیے مولانا جامی کا یہ شعر جو تحفۃ الاحرار میں ہے، سنا دیا:

نورِ دل از سینہ سینا مجوی | روشنی از چشم نابینا مجوی

یہ اشعار سن کر حکیم الملک سخت غصے میں آگئے اور بُری طرح بگڑے۔ شیخ سلیم نے کہا۔ یہاں تو پہلے ہی آگ لگی ہوئی تھی، تم نے اسے اور بھڑکا دیا۔ بہر حال یہ دینِ اکبری کے حامیوں کے شدید مخالف تھے اور تا حدِ امکان ان کی خوب خبر لیتے

تھے۔ جب مذہبی حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے تو بادشاہ سے مکہ معظمہ جانے کی اجازت طلب کی اور ۹۸۸ھ یا ۹۸۹ھ میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے اور وہیں وفات پائی۔[۱۰]

۱۱۹۔ شیخ شمس الدین ملتانی

شیخ شمس الدین بن صدر الدین بن شہر اللہ ملتانی لاہوری، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی اولاد سے تھے اور عالم و فقیہ تھے۔ اپنے والد سے علم حاصل کیا، پھر لاہور آ گئے اور وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ ۲۶ ربیع الاول ۹۸۸ھ کو فوت ہوئے۔[۱۱]

افسوس ہے اس سے زیادہ نہ ان کے حالات کا علم ہو سکا اور نہ کسی تصنیف کا پتا چل سکا ہے۔

۱۲۰۔ شیخ شمس الدین بیجاپوری

شیخ شمس الدین بیجاپوری وقت کے علامہ اور فاضل بزرگ تھے۔ شیراز میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی اور وہیں کے اساتذہ سے اخذ علم کیا۔ مختلف علوم کے ماہر تھے۔ شیراز میں انھوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ تحریر کیا۔ بعد ازاں واردِ ہند ہوئے اور شیخ محمد غوث گوالیاری سے فیض حاصل کیا۔ پھر بیجاپور تشریف لے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ نہایت قانع، مستغنی، عفیف اور متوکل علی اللہ تھے۔ زندہ دل تخلص کرتے تھے۔

ماہِ رجب ۹۸۶ھ میں وفات پائی۔[۱۲]

---

[۱۰] منتخب التواریخ، ص ۳۲۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

[۱۱] اخبار الاصفیا — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۴۰۔

[۱۲] اذکارِ ابرار، ص ۳۵۴، ۳۵۵ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۴۰

۱۲۱- مولانا شمس الدین کشمیری

مولانا شمس الدین کشمیری، شیخ وقت اور فاضل بزرگ تھے، حنفی المسلک تھے۔ کشمیر کے باشندے تھے اور شمس الدین پال کے نام سے معروف تھے۔ فقہ و کلام میں ماہر اور شریعت و طریقت کے جامع تھے۔ حریتِ فکر، آزادیٔ ضمیر اور صدقِ مقال میں اپنے دور میں لاثانی تھے۔ بڑے فصیح البیان اور بلیغ اللسان تھے مختلف علمی و فقہی مسائل میں علما سے مباحثہ و مناظرہ میں بہت تیز تھے اور اکثر ان پر غالب رہتے تھے [۲۱۳]

دسویں صدی ہجری کے اس عالمِ فقہ کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا اور نہ کسی تصنیف کا پتا چل سکا ہے۔

۱۲۲- ملا شنگرف کنائی

ملّا شنگرف کنائی کشمیری، شیخ اور فاضل آدمی تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے شہر کے اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ پھر حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ وہیں شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیثمی شافعی مکّی سے حدیث پڑھی۔ پھر واپس کشمیر آئے اور مسند تدریس بچھائی، ان سے بے شمار لوگوں نے اخذِ علم کیا۔ ان کے پاس شیخ ابن حجر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی حدیث کی سند موجود تھی۔ علاقۂ کشمیر کے نامور محدث و فقیہ اور جامع علوم عقلیہ و نقلیہ تھے۔ ملا فیروز مفتی ان کے برادر زادہ تھے۔[۲۱۴]

۱۲۳- سید شیخ بن عبداللہ حضرمی احمد آبادی

سید شیخ بن عبداللہ عیدروس حسینی حضرمی، شیخِ کبیر اور عالم و فاضل تھے۔

---

۲۱۳ حدائق الحنفیہ، ص ۳۹۱، ۳۹۲ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۴۳

۲۱۴ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۴۴ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۹۔

یہ احمد آباد کے وہ صاحب علم بزرگ تھے، جن کا فیض بڑا عام ہوا اور اس نواح کے بلاد وامصار کے تمام لوگ ان سے مستفیض ہوئے۔ ۹۱۹ھ کو تریم میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو قرآن مجید حفظ کیا اور حصول علم میں مصروف ہو گئے۔ اپنے والد مکرم، امام شہاب الدین بن عبدالرحمٰن اور شیخ عبداللہ بن محمد باقشیر سے تحصیل کی۔ پھر یمن گئے اور وہاں شیخ محمد بن عمر باقضام وغیرہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بعد ازاں ۹۳۸ھ میں اپنے والد کے ہمراہ عازم حجاز ہوئے اور حج کی سعادت حاصل کی۔ مکہ مکرمہ میں شیخ ابوالحسن بکری سے ملے اور ان سے سماع علم کیا۔ حج سے فراغت کے بعد اپنے والد کے ساتھ مدینہ طیبہ کا قصد کیا۔ پھر واپس تریم گئے۔ کچھ عرصہ بعد ۹۴۱ھ میں دوبارہ عازم حج ہوئے۔ اس زمانے میں ان کے والد زندہ تھے۔ اب کی بار تین سال مکہ مکرمہ میں اقامت اختیار کی اور طلب علم اور اللہ کی عبادت میں مصروف رہے۔ اس اثنا میں شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیتمی، علامہ عبداللہ بن احمد فاکہی، ان کے بھائی عبدالقادر، علامہ عبدالرؤف بن یحییٰ اور علامہ محمد بن خطاب مالکی سے اخذ علم کیا۔ مکہ مکرمہ کے ان علما سے انھوں نے بہت استفادہ کیا اور تفسیر، حدیث، فقہ، اصول حدیث، اصول فقہ، علوم عربیہ، تصوف، فرائض و میراث اور حساب میں مہارت پیدا کی۔ مکہ مکرمہ کے دوران قیام میں جہاں وہ مختلف علوم و فنون کے حصول میں مشغول رہے، وہاں طواف اور عمرے بھی کثرت سے کیے۔ مکہ مکرمہ سے عازم زبید ہوئے اور وہاں کے علما و اساتذہ سے استفادہ کیا۔ پھر تریم واپس گئے اور تقریباً تیرہ سال وہاں مقیم رہے۔

اب یہ عالم دین ۹۵۸ھ کو ارض ہند میں آئے اور احمد آباد میں وزیر عماد الملک کے ہاں اقامت اختیار کی۔ احمد آباد میں انھوں نے اپنے آپ کو درس و تدریس اور افادۂ عام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس نواح میں ان سے بے شمار حضرات نے استفادہ کیا اور علم و فضل کی نعمت سے متمتع ہوئے، جن میں خود ان کے لڑکے عبدالقادر، نواسے محمد بن عبداللہ سورتی، سید بن علی، شیخ احمد بن علی بسکری، عبداللہ بن احمد فلاح، محمد بن

احمد فاکہی اور شیخ حمید بن عبد اللہ سندھی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

سید شیخ بن عبد اللہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، جن میں العقد النبوی السر المصطفوی کتاب الفوز والبشریٰ اور اپنے قصیدہ تحفۃ المرید کی دو شرحیں لکھیں، جن میں ایک بڑی ہے اور ایک چھوٹی۔ بڑی کا نام حقائق التوحید ہے اور چھوٹی کا سراج التوحید۔ ایک رسالہ معراج نبوی سے متعلق ہے اور ایک عدل کے موضوع پر ہے تصوف کے بارے میں بھی ان کی ایک تصنیف ہے۔ سید شیخ شاعر بھی تھے اور ان کا ایک دیوان بھی ہے، جس میں سے چند اشعار یہ ہیں:

لنا بالرسول المصطفی خیر نسبۃ ۔۔۔ مسلسلۃ تعلوا علی کل رتبۃ

ائمۃ علم اللہ جوہر سرہ ۔۔۔ زواہر حلم قدوۃ للطریقۃ

شموس تجلت والبدور طوالع ۔۔۔ نجوم لنا بالسعد منہ استمدت

شموس بدت فی عالم الغیب اشرقت ۔۔۔ بدور بدت ابدال اوتار صفوۃ

بعض علمائے کرام نے جن میں شیخ حمید بن عبد اللہ سندھی اور شیخ احمد بن علی بسکری مکی شامل ہیں، شیخ بن عبد اللہ کے حالات و سوانح قلم بند کیے ہیں۔ شیخ احمد بن علی بسکری مکّی نے جو رسالہ لکھا اس کا نام نزھۃ الاخوان والنفوس فی مناقب شیخ بن عبد اللہ العیدروس رکھا۔ ان کے لڑکے شیخ عبد القادر نے بھی ان کے حالات قلم بند کیے ہیں۔

حضرت شیخ بتیس ۳۲ سال احمد آباد میں قیام فرما رہے اور ہفتہ کی رات ۲۵ رمضان ۹۹۰ھ کو احمد آباد میں فوت ہوئے۔[۵]

ص

۱۲۴- قاضی صدر الدین جالندھری لاہوری

قاضی صدر الدین قریشی عباسی لاہوری، بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر کے دور کے

---

[۵] النور السافر، ص ۳۷۲ تا ۳۷۹ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۴۶ تا ۱۴۸

شیخ و عالم اور فقیہ تھے ۔ فقہ و اصول، کلام اور علوم عربیہ کے ماہر تھے ۔ بعض کتبِ درسیہ مخدوم الملک عبد اللہ سے اور بعض دیگر علما و اساتذہ سے پڑھیں ۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد جلال الدین اکبر سے ملے تو وہ ان کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا اور ان کو علاقہ گجرات کے شہر بھڑوچ کا قاضی مقرر کر دیا ۔ نہایت دیانت دار، عالم باعمل اور پرہیز گار تھے ۔ فرائضِ قضا عمدگی سے انجام دیتے تھے ۔ تحقیقِ علوم اور ان کے منطوق و مفہوم میں اپنے استاذ شیخ عبد اللہ سے زیادہ لائق اور فاضل تھے ۔ حلاوتِ منطق، عذوبتِ بیان، ملاحتِ لسان اور کثرتِ مطالعہ میں اس دور کا کوئی عالم ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا ۔ تمام علوم و فنون اور اقسامِ ادب پر گہری نظر رکھتے تھے ۔ بحث و اشتغال میں منہمک رہتے اور عمدہ طریق سے گفتگو کرتے ——— وسیع المشرب کھلے دل کے مالک اور فراخ حوصلہ تھے ۔ جس شخص کو بھی عابد و زاہد اور امورِ دنیا سے منقطع سمجھتے، اس سے حسنِ ظن قائم کر لیتے اور اس کے تقویٰ و ولایت کا دم بھرنے لگتے ۔ اگرچہ وہ درحقیقت کتنا ہی مبتدع، غلط کردار اور عامل خلافِ شریعت ہوتا ۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک دن مجذوبوں کی ہیئت میں ایک بدعتی شخص کو آتے دیکھا، تعظیم و احترام میں، بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ رکھ کے اس کے سامنے اس انداز سے کھڑے ہو گئے جس انداز سے نماز کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے، ان کو دیکھ کر اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ حضرت خضر میرے ساتھ رہتے ہیں آپ کو ان سے ملا سکتا ہوں ۔ یہ الفاظ سنتے ہی اس کے قدموں میں گر گئے اور عرض کناں ہوئے کہ مجھے حضرت خضر کی زیارت کرا دو ۔ وہ مکار کہنے لگا ان سے ملاقات تو کرا دوں گا مگر آج کل سخت متفکر ہوں ۔ میری ایک بیٹی جوان ہے، اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن سامان تیار کرنے کے لیے سات سو تنکے (سکۂ رائج الوقت) کی ضرورت ہے، وہ کہیں سے مل جائے تو اس فکر سے سبکدوش ہو کر خضر کی زیارت کرا سکوں گا ۔ انھوں نے فوراً سات سو تنکہ دیا اور اس فکر سے اس کو آزاد کر دیا ۔

اب وہ "مجذوب" ان کو "خضر سے ملانے" کے لیے دریا پر لے گیا اور ہاتھ پکڑ

کر دریا میں داخل ہوگیا۔ مجذوب طویل قامت تھا اور قاضی کوتاہ قد تھے۔ جب دونوں گہرے پانی میں گئے تو پانی قاضی کی گردن سے اوپر چلا گیا، وہ وہیں رک گئے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ "مجذوب" نے کہا میں تو آپ کو خضر سے ملانا چاہتا تھا مگر آپ تو خود ہی نہیں ملنا چاہتے، پانی سے ڈر گئے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔

قاضی صدر الدین لاہوری بلند کردار شخص تھے۔ ہر وقت اللہ کا خوف دل پر طاری رہتا۔ خشیتِ الٰہی سے بہت رونے اور آنکھوں سے آنسو جاری رہتے۔ علم ظاہری کے علاوہ تصوّف و طریقت سے بھی بہرہ ور تھے اور اس ضمن میں شیخ موسیٰ حداد کے فیض یافتہ تھے، جن کا شمار مجاذیب کی جماعت میں ہوتا تھا۔

طویل عرصہ تک بھڑوچ کے عہدۂ قضا پر متعین رہے اور وہیں ۱۵ رمضان ۹۹۰ھ کو وفات پائی۔[۱]

۱۲۵- شیخ صدر الدین سندھی

شیخ صدر الدین سندھی اقلیم سندھ کے نامور علما میں سے تھے اور سلطان سندھ جام نظام الدین کے عہد میں علم و فقہ میں بہت ماہر تھے۔ تمام عمر درس و افادہ میں مصروف رہے۔ علما و فضلا کی بڑی جماعت نے ان سے استفادہ کیا اور ہزاروں افراد نے ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی۔ ابتدا میں مدعی مہدویت سید محمد جون پوری کے شدید مخالف تھے، لیکن جب وہ سندھ میں آئے اور شیخ نے ان سے ملاقات کی اور دونوں کی آپس میں گفتگو ہوئی تو وہ سید محمد کے عقیدت مندوں کے زمرہ میں داخل ہو گئے۔[۲]

---

[۱] منتخب التواریخ، ص ۳۰۷ — طبقاتِ اکبری، ص ۳۹۰ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۹۲، ۹۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۵۷، ۱۵۸ — اذکارِ ابرار، ص ۴۱۰، ۴۱۱

[۲] تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۵۸

۱۲۶۔ سید صدر الدین قنوجی

سید صدر الدین حنفی قنوجی، شیخ وقت اور فاضل کبیر تھے اور اپنے عصر کے جید علما میں سے تھے۔ سلطان سکندر لودھی ان کی بہت تکریم کرتا تھا اور ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر اس نے ان کو اپنے ندیموں میں شامل کر لیا تھا۔ ان کے بھائی سید حسن اور سید امام تھے، وہ بھی وقت کے علما میں سے تھے۔[۵۳]

۱۲۷۔ سیّد صفائی ترمذی

سید صفائی بن مرتضی حسینی ترمذی، شیخ وقت اور عالم و فقیہ تھے۔ فقہ، اصولِ فقہ اور علومِ عربیہ کے جید علما میں سے تھے۔ سلطان محمود شاہ والیٔ سندھ ان کا بہت قدر دان تھا اور اس نے قطب الدین شاہ کی وفات کے بعد ان کو شہر بھکر کی مسندِ قضا اور مسندِ شیخ الاسلامی پر متعین کر دیا تھا۔ بھکر کی جامع مسجد ان ہی کی کوشش سے تعمیر کی گئی۔ اللہ نے ان کو اولادِ صالح عطا فرمائی، جن میں محمد معصوم مصنف تاریخ سندھ خاص طور سے مشہور ہیں۔ علمِ فقہ کے اس عظیم عالم نے ذی القعدہ ۹۹۱ھ کو وفات پائی۔[۵۴]

۱۲۸۔ قاضی صلاح الدین جون پوری

قاضی صلاح الدین خلیل جون پوری حنفی المسلک تھے۔ ارضِ ہند کے معروف شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ قاضی نظام الدین مصنف فتاویٰ ابراہیم شاہیہ کے نواسے

---

۵۳ ابجد العلوم، ص ۹۲۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۵۸، ۱۵۹ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۷۔

۵۴ مآثر رحیمی، ج ۲، ص ۳۳۶ — تحفۃ الکرام، ص ۳۹۱ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۷
نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۵۹ — تاریخ معصومی، ص ۳۲۷، ۳۲۸

تھے۔ اپنے محترم نانا کی گود میں پرورش پائی اور ان ہی سے اخذِ علم کیا۔ ان کی وفات کے بعد مسندِ قضا پر متمکن ہوئے اور بیس۲۰ سال اس منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ حسنِ اخلاق کے مالک، شیریں کلام، فصیح البیان اور بلند مرتبہ کے حامل عالمِ دین تھے۔ مروجہ اصنافِ علم میں مہارت رکھتے تھے۔ مسائل کی جزئیات پر کامل استحضار تھا اور اس سلسلے میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں شارح صحیح بخاری سید عبدالاول بن علاء الدین حسینی جون پوری کا اسم گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہے۔ شرح الاشباہ والنظیر فی الفروع، ان کی تصنیف ہے[۵]۔

دسویں صدی ہجری کے اس عالمِ فقہ کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

ض

۱۲۹- مولانا ضیاالدین مدنی

مولانا ضیاء الدین حسینی مدنی، شیخ و عالم اور محدث تھے۔ ان کا شمار حدیث، لغت اور نحو کے متبحر علما میں ہوتا تھا۔ ہندوستان آئے تو دارالسلطنت دہلی میں ٹھہرے، وہاں دو سال مقیم رہے۔ وہاں سے اودھ گئے اور لکھنو کے قریب ایک قریہ میں اقامت گزین ہوئے، جس کا نام کاکوری تھا۔ کاکوری میں پانچ سال چار مہینے رہے اور درس و تدریس کو اپنا مشغلہ قرار دیے رکھا۔ اس اثنا میں ان سے شیخ نظام الدین بن سیف الدین علوی کاکوروی نے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ صحیح بخاری اور جامع الاصول کا بھی باقاعدہ درس لیا۔ کاکوری میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے[۶]۔

ان کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

---

[۵] تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۷۰، ۷۱، ۱۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۶۱۔

[۶] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۶۲، ۱۶۳، بحوالہ کشف المتواری۔

ط

۱۳۰- مولانا طیّب سندھی

مولانا طیب بن ابوالطیب ٹھٹھوی سندھی، فحول علما میں سے تھے، شیخ عصر عالم اجل اور اپنے دور کے محدث تھے۔ شیخ ہارون کی اولاد سے تھے۔ ارض سندھ میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی۔ مولانا مفتی یونس سندھی سے علم حاصل کیا اور عرصہ تک ان سے وابستہ رہے۔ پھر علاقہ برار کی طرف متوجہ ہوئے اور شہر ایلچ پور میں سکونت اختیار کی۔ خاصہ عرصہ وہاں مقیم رہے۔ پھر شیخ طاہر بن یوسف سندھی کے ساتھ برہان پور میں داخل ہوئے۔

درس و افادہ ان کا اصل کام تھا، ساری زندگی اسی خدمت میں صرف کر دی۔ متعدد حضرات نے ان سے علم حاصل کیا، شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی بھی ان کے تلامذہ میں سے تھے۔ انھوں نے ان سے اصول و کلام کی بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ ان کی تصنیفات میں سے ایک تو رسالہ غوثیہ کی شرح ہے۔ دوسرے مشکوٰۃ پر نہایت مفید تعلیقات و حواشی ہیں۔

مولانا طیب سندھی نے ۹۹۰ھ کے لگ بھگ وفات پائی [1]

ع

۱۳۱- مولانا عباس سندھی

مولانا عباس بن جلال پاتری سندھی اپنے دور میں سرزمین سندھ کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ علاقہ سندھ کے ایک قریہ پاتری میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ ۹۴۷ھ کے اوائل میں پاتری سے ہبکور چلے گئے جو اعمال بھکر میں ایک گاؤں

---

[1] اذکار ابرار، ص ۳۷۷، ۳۷۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۶۵۔

تھا۔ عالم کبیر، قانع و عفیف اور تفسیر، حدیث اور فقہ کے ماہر تھے۔ اس نواح میں اپنے فضل و کمال میں بہت مشہور تھے۔ ہکبور میں سکونت اختیار کی اور ہر طرف سے منقطع ہو کر درس و تدریس میں مصروف ہو گئے اور بے شمار لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔ ان کے تلامذہ میں قاضی عبدالسلام سندھی اور خلق کثیر شامل ہے۔ چھیانوے ۹۶ سال کی عمر پاکر ۹۹۸ھ میں فوت ہوئے۔[۱]

دسویں صدی ہجری کے سندھ کے اس عظیم المرتبت عالم دین اور فقیہ کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا اور نہ اس سے زیادہ ان کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکے ہیں۔

۱۳۲۔ میر سید عبدالاوّل جون پوری

سید عبدالاوّل بن علاء الدین حسینی جون پوری، اصلاً اعمالِ جون پور کے ایک مقام زید پور کے باشندے تھے۔ ان کے آبا و اجداد میں سے کوئی بزرگ ارضِ دکن میں چلے گئے تھے۔ یہ وہیں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی اور شیخ علاء الدین سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ اپنے علاقے کے شیخ و عالم اور محدّث تھے اور ان کا شمار کبار فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ دکن سے گجرات تشریف لے گئے اور عرصہ تک وہاں قیام پذیر رہے۔ پھر عازم حرمین شریفین ہوئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ وہاں سے ہند کی طرف مراجعت کی اور احمد آباد میں اقامت گزین ہوئے۔ وہاں مدت تک درس و تدریس میں مصروف رہے اور بے شمار تشنگانِ علوم کو علم کی نعمت سے متمتع کیا۔ ان کے اس دور کے بہت سے تلامذہ میں شیخ طاہر بن یوسف سندھی شامل ہیں۔ احمد آباد سے دہلی کا قصد کیا اور دو سال وہاں قیام کیا۔

شیخ عبدالاوّل بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں سے ایک کتاب کا

---

[۱] مآثر رحیمی، ج ۲، ص ۳۳۸۔ تاریخ معصومی ص ۲۳۱، ۲۳۲۔ گلزار ابرار ص ۳۰۶
نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۶۷۔

نام فیض الباری ہے جو صحیح بخاری کی شرح ہے۔ پھر میراث و فرائض کی مشہور کتاب سراجی کو نظم کیا اور اس کی بسیط و مفصل شرح قلم بند کی۔ ایک تصنیف تحقیق نفس کے موضوع میں ہے۔ ایک سفر السعادہ کی تلخیص ہے۔ اسی طرح تصوف کی کتاب فتوحاتِ مکیہ اور علم معانی و بیان کی معروف کتاب مطول پر تعلیقات و حواشی سپردِ قلم کیے۔ علاوہ ازیں اور بھی کتب و رسائل کے مصنف ہیں۔ اس محدث و فقیہ اور عالم و مصنف نے ۹۶۸ھ کو دہلی میں وفات پائی [۵۲]

۱۳۳۔ شیخ عبدالجلیل جون پوری

شیخ عبدالجلیل بن طٰہٰ انصاری جون پوری فقہائے حنفیہ میں سے تھے اور فاضل و عالم آدمی تھے۔ مشہور بزرگ شیخ عبداللہ ہروی کی اولاد سے تھے۔ حدیث فقہ اور دیگر علوم میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ تصوّف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا اور شیخ عبدالعزیز بن حسن عباسی دہلوی کے فیض یافتہ تھے۔ حج کے لیے مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے تو دہلی میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے۔ یہ حادثہ ۹۹۰ھ کو پیش آیا [۵۳]

۱۳۴۔ شیخ عبدالحکیم برہان پوری

شیخ عبدالحکیم بن بہار الدین بن معز الدین برہان پوری نے علم و معرفت کی گود میں پرورش پائی اور تصوّف و طریقت کی آغوش میں پلے بڑھے۔ شیخ صالح اور فقیہ نام ور تھے۔ اپنے والد شیخ بہار الدین سے اخذ فیض کیا اور طویل عرصہ تک ان سے وابستہ رہے۔ امورِ دنیا سے منقطع ہو کر اپنے آپ کو زہد و عبادت میں مشغول

---

[۵۲] اخبار الاخیار، ص ۲۵۳ تا ۲۵۷ — خزینۃ الاصفیا ج ۱، ص ۴۲۷، ۴۲۸ — تجلی نور، ج ۲ ص ۴۲، ۴۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۶۷، ۱۶۸ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۶ — اذکار ابرار، ص ۲۷۵، ۲۷۶۔

[۵۳] اذکار ابرار، ص ۳۵۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۶۹ — بحوالہ گنج ارشدی۔

کرلیا تھا [۴]

۱۳۵- شیخ عبدالحلیم سنبھلی

شیخ عبدالحلیم بن حاتم سنبھلی، شہر سنبھل میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے والد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ طویل عرصہ تک ان سے اخذِ علم کرتے رہے۔ اور مرتبہ بلند کو پہنچے۔ صالح عالمِ دین اور کبارِ علمائے وقت سے تھے۔ ان کے والد بھی مسندِ تدریس پر فائز تھے۔ یہ بھی تمام عمر درس و تدریس میں مصروف رہے۔ قناعت و توکل اور صلاحِ ظاہری سے آراستہ تھے۔ ۹۸۹ھ کو وفات پائی [۵]

۱۳۶- مولانا عبدالحی دہلوی

مولانا عبدالحی بن جلال بن فضل حنفی دہلوی، اپنے عصر کے مشاہیر افاضل میں سے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور وہیں اپنے دَور کے اساتذہ سے اخذِ علم کیا۔ اپنے والد سے کسبِ فیض کیا۔ نہایت فاضل، کریم النفس، حسنِ اخلاق کے حامل، متواضع اور انتہائی محسن بزرگ تھے۔ ۹۵۹ھ کو فوت ہوئے [۶]

۱۳۷- مولانا عبدالرحمٰن لاہوری

مولانا عبدالرحمٰن بن احمد بن عبدالملک لاہوری، صالح عالمِ دین اور اپنے وقت کے مشہور فضلا میں سے تھے۔ اپنے باپ کی جگہ مسندِ تدریس پر فائز ہوئے اور ہمیشہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بے شمار علما نے ان سے اخذِ علم کیا۔ ۹۷۰ھ کو فوت ہوئے [۷]

---

[۴] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۶۹

[۵] ایضاً، ص ۱۷۰ [۶] ایضاً

[۷] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۷۱ بحوالہ اخبار الاصفیا

۱۳۸۔ مولانا عبدالرحمٰن ملتانی

مولانا عبدالرحمٰن بن عزیز اللہ ملتانی شیوخِ وقت اور اکابر فضلائے عصر میں سے تھے۔ ملتان میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی، اپنے والد سے علم حاصل کیا۔ اور پھر خدمتِ تدریس میں مصروف ہوگئے۔ طویل عرصہ تک لاہور میں مسندِ درس و تدریس بچھائے رکھی۔ ان سے شیخ سعداللہ بن ابراہیم ملتانی اور خلقِ کثیر نے علمی استفادہ کیا۔[۵۸]

۱۳۹۔ شیخ عبدالرحمٰن لاہرپوری

شیخ عبدالرحمٰن بن علاء الدین بن عطاء اللہ بن ظہیر الدین عباسی لاہرپوری، خلیفہ ہارون الرشید عباسی کی اولاد سے تھے۔ علاقہ اودھ کے ایک گاؤں لاہرپور میں پیدا ہوئے، وہیں تربیت پائی اور اپنے والد شیخ علاء الدین سے علم حاصل کیا۔ ان کی وفات کے بعد دہلی گئے۔ وہاں شیخ عبداللہ بن اللہ داد عثمانی تلنبی کی مسندِ تدریس بچھی ہوئی تھی، ان کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور اخذِ علم کیا۔ طویل عرصہ تک ان کی صحبت میں رہے، یہاں تک کہ علم میں ماہر ہوگئے اور اپنے اندر فتویٰ نویسی اور تدریس کی اہلیت پیدا کرلی۔ شیخِ وقت اور فاضل کبیر تھے۔

اس زمانے میں تختِ ہند پر سلطان سکندر لودھی متمکن تھا۔ یہ اپنی گوناگوں صلاحیتوں کی بنا پر اس کے مقربین و مصاحبین میں داخل ہوگئے۔ بارہ سال اس خدمت پر مامور رہے۔ پھر عازمِ جون پور ہوئے، جون پور میں ایک بزرگ اور صوفی شیخ عبدالسلام کا چشمۂ فیض جاری تھا، تمام علائقِ دنیوی سے منقطع ہوکر ان سے وابستہ ہوگئے اور زہد و عبادت کی زندگی اختیار کرلی۔ اللہ نے لمبی عمر

---

[۵۸] اذکار ابرار ص ۴۷۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۷۱۔ بحوالہ اخبار الاصفیاء۔

عطا فرمائی تھی۔ ۱۲ ذی الحجہ ۹۷۶ھ کو اپنے وطن لاہر پور میں وفات پائی۔[۹]

۱۴۰۔ میرک عبدالرحمٰن ٹھٹھوی

میرک عبدالرحمٰن بن محمود بن ابوسعید حنفی ٹھٹھوی، ارضِ سندھ کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے اور اپنے دور کے فحول علما میں سے تھے۔ مروّجہ علوم عقلیہ و نقلیہ پر گہری نظر رکھتے تھے، اور متبحر عالم تھے۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مشغول رہے اور خلقِ کثیر کو علمی فائدہ پہنچایا۔ ۹۹۱ھ کو فوت ہوئے۔[۱۰]

۱۴۱۔ مولانا عبدالرحمٰن ٹھٹھوی

مولانا عبدالرحمٰن ٹھٹھوی سندھی علاقہ سندھ میں مرزا عیسیٰ ترخان اور اس کے بیٹے مرزا باقی کے دورِ حکومت میں شیخ وقت اور فاضل کبیر تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علومِ مشہورہ میں بے نظیر تھے۔ علمائے عصر کی بہت بڑی تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔[۱۱]

۱۴۲۔ قاضی عبدالرحیم سہارن پوری

قاضی عبدالرحیم بن عبدالرزاق بن خواجہ سالار انصاری سہارن پوری، شیخِ زمان اور معروف عالم و فقیہ تھے اور اپنے عہد کے اکابر علما میں سے تھے۔ سہارن پور میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ تمام عمر درس اور افادہ عام میں صرف کر دی۔

---

[۹] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۷۲ بحوالہ اصول المقصود

[۱۰] مآثر رحیمی ج ۲ ص ۳۲۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۷۲

[۱۱] مآثر رحیمی ج ۲ ص ۳۲۷۔ تاریخ معصومی ص ۲۹۸۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۷۹۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۷۱۔

معقول و منقول میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ سلطان سکندر لودھی کے عہدِ حکومت کے عالم دین تھے۔ ملوک و سلاطین کی مجلسوں میں جانے سے گریز کرتے تھے۔ سکندر لودھی ان کے علم و فضل سے بہت متاثر تھا۔ اس نے ان کو منصبِ قضا پر متعین کرنا چاہا تو انھوں نے انکار کر دیا، مگر وہ برابر اصرار کرتا رہا۔ بالآخر بڑی مشکل سے رضامند ہوئے اور اس اہم منصب کی ذمہ داری کو قبول کیا۔ دسویں صدی ہجری کے اس نامور عالم و فقیہ نے ۹۶۰ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔[۱۲]

۱۴۳۔ شیخ عبدالرشید سندھی

شیخ عبدالرشید سندھی ہالہ کندی کے رہنے والے تھے جو اعمالِ سیوستان میں واقع تھا۔ فاضل و متقی بزرگ تھے اور کبار علمائے عصر میں سے تھے۔ درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے، ان سے بے شمار علما و مشائخ نے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا جن میں شیخ احمد بن اسحاق اور ان کے بڑے بھائی شیخ محمد شامل ہیں۔[۱۳]

۱۴۴۔ مولانا عبدالسلام لاہوری

مولانا عبدالسلام لاہوری، بہت بڑے شیخ، فاضل اور اپنے عصر کے مشہور علما میں سے تھے۔ لاہور میں سلسلۂ تدریس میں کوئی ان کا مدِّ مقابل نہ تھا اور وہ اس مسندِ عالی کے بادشاہ تھے۔ دور دراز کے علمائے گرامی قدر ان کے علمی فضل و کمال کے معترف تھے، جن میں ترکستان کے علامہ محمد سعید[۱۴] کا اسم گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

---

[۱۲] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۷۳ بحوالہ مرآت سکندری

[۱۳] تحفۃ الکرام ص ۲۷۴۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۹۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۷۷۔

[۱۴] مولانا محمد سعید ترکستانی اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم دین تھے۔ ملا احمد جند سے علم حاصل کیا۔ ملا محمد سرخ سے بھی استفادہ کیا اور کچھ عرصہ ملا عصام الدین ابراہیم کے

وہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: کہ وہ ۹۶۶ھ میں ہندوستان آئے تو انھوں نے دیکھا کہ اس پورے خطۂ ارض میں (جس کو اب برصغیر پاک و ہند سے تعبیر کیا جاتا ہے) مولانا عبدالسلام لاہوری واحد عالم دین تھے جو گوناگوں علمی کمالات میں سب پر فوقیت رکھتے تھے۔ انھوں نے ۹۸۳ھ کو لاہور میں انتقال کیا۔[۱۵]

۱۴۵۔ قاضی عبدالسمیع اندخانی

قاضی عبدالسمیع حنفی اندخانی، صاحبِ ہدایہ شیخ برہان الدین مرغینانی کی اولاد سے تھے۔ شیخ و عالم تھے۔ علوم حکمیہ میں بالخصوص ان کا شمار مشاہیر علما میں ہوتا تھا، مولانا احمد جنید کے شاگرد تھے۔ اکبر کے زمانے میں ہندوستان آئے اور منصبِ قضا پر فائز کر دیے گئے۔ شرح المواقف، شرح المطالع اور ان کے حواشی کی تدریس میں بے مثال تھے۔[۱۶]

۱۴۶۔ قاضی عبدالشکور سہسوانی

قاضی عبدالشکور بن اسماعیل بن عطاء اللہ حسینی مودودی امروہوی ثم

حلقہ درس میں بھی داخل رہے۔ وارد ہند ہونے کے بعد مغل حکمران جلال الدین اکبر سے ملاقات ہوئی تو اس کو ان کی مصاحبت پسند آئی۔ ان پر درویشی اور انکساری کا غلبہ تھا مگر اس کے باوجود بہت خوش مزاج اور ذہین تھے۔ عالم اتنے اونچے درجے کے تھے کہ اس زمانے میں ان کے سے معلومات کا حامل شاید ہی کوئی دیارِ ہند موجود ہو فصیح البیان تھے، سلجھی ہوئی اور دل کش گفتگو کرتے تھے۔ بہت بڑا حلقہ درس تھا۔ شاگردوں پر بڑی شفقت و مہربانی فرماتے تھے۔ ارضِ ہند سے کابل گئے اور ۹۷۰ھ میں انتقال کر گئے (منتخب التواریخ)

[۱۵] گلزارِ ابرار، ص ۶۹۶ تا ۶۹۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۷۹۔

[۱۶] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۷۹۔ ہفت اقلیم ج ۳، ص ۴۴۳، ۴۴۴۔

سہسوانی، اپنے دَور کے دیارِ ہند کے معروف علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد مکرم (اسماعیل) اور جدِ امجد (عطاء اللہ) اس عصر کے عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ سلاطین دہلی کے دربار میں اس خاندان کے بزرگوں کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے آبا و اجداد میں ایک بزرگ خواجہ سید محمد خطیر گزرے ہیں جو قاضی عبدالشکور کی آٹھویں پشت یعنی ۶۸۷ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن کے ولی عہد شہزادہ محمد شاہ شہید کے اتالیق اور ملکی و فوجی امور میں اس کے معتمدِ خاص تھے۔ ملتان اور پنجاب کے علاقوں کے منتظم تھے اور اس سلسلے میں عمدہ شہرت کے مالک!

جنگِ تاتار میں محمد شاہ نے شہادت پائی اور خواجہ محمد خطیر سخت زخمی ہوئے۔ پھر غیاث الدین نے ان کو منصبِ وزارت عطا کیا۔ کیخسرو بن محمد شاہ شہید کو خواجہ محمد خطیر ہی کی کوشش سے ولی عہد مقرر کیا گیا تھا مگر غیاث الدین کی وفات کے بعد امرائے سلطنت نے معزالدین کیقباد کو تخت نشین کیا اور ولی عہد کو قتل کر دیا گیا، اور ساتھ ہی دہلی میں خواجہ صاحب کے داخلے کی ممانعت کے احکام جاری ہو گئے۔ پھر جب سلطان جلال الدین خلجی بادشاہِ ہند ہوا تو اس نے ۶۸۸ھ میں خواجہ محمد خطیر کو دوبارہ عہدۂ وزارت پر متمکن کر دیا۔ بعد ازاں علاء الدین خلجی سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے بھی خلعتِ وزارت پیش کیا۔ اس ضمن میں تاریخ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں:

چناں چہ حضرت خواجہ سید خطیر را کہ بہ نیکی ذات و پسندیدگی صفات و اصابت رائے و بہ نظام ملکی و فوجی اشتہار بکمال داشت بعہدۂ وزارت ممتاز گردانید و مہمات و قوام سلطنت برائے صواب دید آنحضرت واگذاشت[1]

بہر حال قاضی عبدالشکور کے اسلاف کو سلاطینِ دہلی کے ہاں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی اور ان کے دادا خواجہ عطاء اللہ کو دربار سلاطین لودھی سے

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱، حالات سلطان علاء الدین خلجی

ملک العلما کا خطاب ملا تھا۔ ۸۹۷ھ کو سکندر لودھی کے عہد میں ان کے والد مکرم قاضی اسماعیل کو منصب قضا عطا ہوا۔ یہ خاندان کئی پشتوں سے سہسوان میں مقیم تھا اور ورع و تقویٰ، تقدس و نجابت، مکارم اخلاق اور پابندی شرع میں ممتاز! ان کے بزرگ مختلف سلاطینِ ہند کے دور سے عہدۂ قضا پر متعین چلے آرہے تھے۔

قاضی اسماعیل کی وفات کے بعد ان کے بیٹے قاضی عبدالشکور سہسوان اور اس کے مضافات کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ یہ شیخِ وقت، عالم و فقیہ اور نہایت نیک آدمی تھے۔ امروہہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ مغل حکمران نصیرالدین ہمایوں کے عہدِ حکومت میں سہسوان اور اس کے گرد و نواح کے قاضی مقرر کیے گئے۔ اس علاقے میں قاضی عبدالشکور اور ان کے والد قاضی اسماعیل نے بے حد دینی خدمات انجام دیں۔ ان کی تبلیغی مساعی سے بے شمار لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، ہزاروں ہندوؤں نے مسلمان ہونے کا شرف حاصل کیا، بہت سے مسلمان متبع شریعت ہوئے، متعدد افراد نے علم و فضل کی دولت حاصل کی اور بہت بڑی تعداد ان کی کوشش سے نورِ ہدایت سے مستنیر ہوئی۔

منصبِ قضا پر متعین کرنے کے بعد ہمایوں نے سرزمین سہسوان کی وہ جاگیریں جو اس سے قبل قاضی عبدالشکور کے خسر کے بیٹوں۔ محمد حسن اور طاہر۔ کے پاس تھیں قاضی عبدالشکور کو دے دیں۔ لیکن قاضی ممدوح نے وہ جاگیریں اپنے پاس نہیں رکھیں بلکہ اپنے خسر کے مندرجہ بالا بیٹوں ہی کے نام منتقل کر دیں اور خود عدل و انصاف اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ تقریباً تیس سال تک وہ وسادۂ قضا پر متمکن رہے اور اس طویل مدت میں اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی میں حتی الامکان کبھی بی دانستہ طور پر کسی کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ پھر ایک وقت آیا کہ ان کے خسر کے بیٹوں کے دل میں اس غلط اندیشے نے کروٹ لی کہ یہ جاگیریں وہ ان سے کہیں دوبارہ واپس نہ لے لیں۔ چنانچہ اس موہوم خطرے کے پیشِ نظر انھوں نے ان کو قتل کرا دیا۔

ایک روایت کے مطابق یہ حادثہ ۲۰ ربیع الاول ۹۴۲ھ کو وقوع پذیر ہوا۔[۱۸] لیکن دوسری روایت کے مطابق جمعہ کے روز ۱۰ محرم ۹۴۷ھ کو مسجد قاضی محلہ چوک (سہسوان) میں انھیں اس وقت شہید کیا گیا جب وہ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ ان کا مادۂ تاریخ "بے شبہ شہیدِ رشد" ۹۴۷ھ ہے[۱۹] انھیں ضربِ تیغ سے شہید کیا گیا اور ان کے خون کے قطرے قرآن مجید کے اوراق پر گرے۔ وہ قرآن مجید اب تک ان کے ورثا کے پاس موجود ہے۔ انھیں مسجد چوک میں دفن کیا گیا۔

جس سال انھیں شہید کیا گیا، اسی سال سلطنتِ ہند ایک عظیم انقلاب سے دوچار ہوئی۔ یعنی مغل فرماں روا نصیرالدین ہمایوں، جس نے ان کو منصبِ قضا عطا کیا تھا اور ۹۳۷ھ سے سرزمینِ ہند پر دادِ حکمرانی دے رہا تھا، ماہِ رجب ۹۴۷ھ کو دس سال کی بادشاہت کے بعد شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران بھاگ گیا اور اس طرح ہند پر اس کا پہلا دورِ حکمرانی ختم ہوا اور تختِ حکومت شیر شاہ سوری کے لیے خالی کیا۔ پھر اس نے ۹۶۳ھ میں ہندوستان پر چڑھائی کی اور فتح یاب ہوا۔ دوسری مرتبہ وہ چند ماہ حکومت کرنے کے بعد وفات پا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا جلال الدین اکبر اورنگِ سلطنت پر متمکن ہوا۔

قاضی عبدالشکور کی شہادت کے بعد، ان کے عمِ محترم خواجہ سید عبداللہ معروف بہ شاہ پنجمین، دادخواہ کی حیثیت سے حاکمِ سنبھل کے پاس گئے اور اپنے نامور بھتیجے کے قاتلوں کے خلاف نالش کی۔ چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوئے اور قاتلوں کو سزا دی گئی۔

قاضی ممدوح کے پانچ بیٹے تھے۔ قاضی محمد صالح، مفتی محمد فاضل، خواجہ صدرالدین محمد حاکم الملقب بہ شاہ ولایت بندگی، مولانا محمد قاسم اور[۲۰] مولانا محمد ہاشم۔

---

[۱۸] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۸۰ بحوالہ نخبۃ التواریخ۔ [۱۹] حیوٰۃ العلما ص ۱۲

[۲۰] مولانا محمد ہاشم بڑے عالمِ دین اور فقیہ تھے۔ کتاب بستان فقیہ ابو اللیث سمرقندی

یہ پانچوں حضرات علم وفضل اور نیکی و صالحیت کی دولت سے بہرہ ور تھے۔ والد کی وفات کے بعد انھیں بحکم سلطانی قضا و افتا کے مناصبِ جلیلہ پر متعین کیا گیا اور تولیتِ اوقاف دی گئی۔ نیز انعاماتِ سلطانی، خلعت اور جاگیریں عطا کی گئیں[۲]۔

۱۴۷۔ شیخ عبدالصمد ردولوی

شیخ عبدالصمد بن اسماعیل بن صفی الدین بن نصیرالدین صفوی ردولوی، ردولی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے والد شیخ اسماعیل بن صفی الدین سے علم حاصل کیا اور ایک مدت تک ان کی صحبت و رفاقت میں رہے۔ یہاں تک کہ علوم و فنون پر نظر و استحضار میں اپنے تمام اقران و معاصرین پر سبقت لے گئے۔ حنفی المسلک تھے اور فقہ و کلام اور علومِ عربیہ میں یگانہ روزگار!

شیخ عبدالصمد ردولوی شیخ اسماعیل ردولوی کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔ فہم و ذکاوت، علم و ادراک اور ذہانت و فراست میں اپنے دور کے عدیم المثال بزرگ تھے۔ شیخ عبدالقدوس ردولوی گنگوہی ان کے چھوٹے بھائی تھے جو علم و فضل، تصوف و طریقت اور زہد و عبادت میں بے مثل تھے، وہ ان کو اپنے مراسلات و مکتوبات میں نہایت عزت و احترام کے الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں اور ان کے لیے صدر العلما، بدر الفضلا، محقق المعانی مبین الفرقانی اور نعمان الثانی جیسے اونچے القاب استعمال

کا ایک نسخہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا، ہندوستان میں موجود ہے جو بوسیدہ و کرم خوردہ اور ناتمام ہے۔ اس نسخے پر جابجا ان کے محققانہ حواشی ہیں۔ آخری ورق پر ۹۹۲ھ مرقوم ہے۔ عبارتِ خاتمہ مع نام و نسبِ کاتب اور مہر و دعائے ختم مندرج ہے (ملاحظہ ہو حاشیہ حیوٰۃ العلما ص ۱۲)

[۲] تفصیل کے لیے دیکھیے حیوٰۃ العلما ص ۱۰۱ تا ۱۰۵۔ نیز دیکھیے نزہۃ الخواطر ج ۴، ص ۱۷۵، ۱۸۰۔

فرماتے ہیں[۲۲]

۱۴۸۔ شیخ عبد الصمد سرہندی

شیخ عبد الصمد حسینی سرہندی اپنے عصر کے فاضل بزرگ تھے اور فقہ، اصولِ فقہ اور علوم عربیہ میں ماہر کامل تھے۔ اس زمانے میں جون پور کو علم و تصوف کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور شیخ قوام الدین جون پوری کا چشمۂ فیض جاری تھا، چنانچہ شیخ عبد الصمد نے وہاں کا قصد کیا اور ان سے مستفیض ہوئے[۲۳]

افسوس ہے کہ دسویں ہجری کے اس سرہندی عالم و فقیہ کے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ یہ بھی پتا نہیں چل سکا کہ یہ کب پیدا ہوئے، کہاں علم حاصل کیا، کن کن اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور خود ان سے کون کون حضرات مستفید ہوئے، اور کب اور کہاں وفات پائی۔

۱۴۹۔ شیخ عبد العزیز دہلوی

شیخ عبد العزیز بن حسن بن طاہر عباسی دہلوی جون پوری ۸۹۸ھ کو جون پور میں پیدا ہوئے۔ ابھی عالمِ طفولیت ہی میں تھے کہ والدِ مکرم شیخ حسن وفات پا گئے۔ والد کی وفات کے بعد تربیت و تعلیم کی ذمہ داری والدہ پر آپڑی۔ نیک بخت ماں نے بڑی محنت سے تربیت کی۔ عمر کی کچھ منزلیں طے ہوئیں تو شیخ محمد بن عبد الوہاب حسینی بخاری دہلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ ان سے اور شیخ ابراہیم بن معین الدین حسینی ایرجی سے علم حاصل کیا۔ علومِ ظاہری کے ساتھ ساتھ تصوف و طریقت سے بھی بہرہ یاب ہوئے۔ پھر عازمِ ظفر آباد ہوئے، وہاں قاضی خاں بن یوسف

۲۲ے نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۸۰

۲۳ے ایضاً ص ۱۸۳۔ بحوالہ عاشقیہ۔

ناصحی کا سلسلۂ فیض جاری تھا اور وہ تصوف میں ان کے والد کے کبار فیض یافتہ حضرات میں سے تھے، تین سال ان کی خدمت میں رہے۔

شیخ عبدالعزیز دہلوی جہاں اپنے دور کے جلیل القدر عالم دین تھے، وہاں کثیر العبادت، اللہ کی یاد میں مصروف رہنے والے، منکسر المزاج، طیب النفس، خوش طبع اور مستغنی عن الناس تھے۔

ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ امرا و حکام سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے اور ہر وقت یادِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ تاہم لوگوں کے کام کرانے میں ہر آن مستعد نظر آتے، اور اس کے لیے خود اپنے معمولات چھوڑ کر اور روزمرہ کے وظائف ترک کر کے بھی امرا و حکام کے پاس جاتے اور زہد و عبادت میں مشغول رہنے کے باوجود اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے، جب تک سفارش قبول نہ کر لی جاتی اور ضرورت مند کا کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جاتا۔ بعض اوقات صبح سے شام تک یہی سلسلہ جاری رہتا اور تمام وقت اصحابِ اغنیاء کے دروازوں پہ دستک دینے میں صرف ہو جاتا، کیوں کہ لوگوں کے کام آنا اور جائز امور میں ان کی سفارش کرنا ان کے نزدیک بہت بڑی نیکی سے تعبیر تھا۔

اکبر کے ابتدائی عہد میں شیخ عبدالعزیز کو بڑی قبولیت حاصل ہوئی۔ بیرم خاں ان کا معتقد تھا، دوسرے امرائے اکبری بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذِ فیض کرتے تھے۔

ان کا سلسلہ تدریس بھی جاری تھا اور سلسلۂ تصنیف بھی۔ تفسیر اور تصوّف کے ماہر تھے اور اس موضوع سے متعلق کتابوں کا باقاعدہ درس دیتے تھے۔ ان کا تصنیفی ذوق بڑا بلند تھا اور وہ بائیس کتابوں کے مصنف یا شارح تھے۔ علم فقہ میں بھی وہ عبور رکھتے تھے۔ اس موضوع کے بارے میں ان کی ایک تصنیف بھی ہے جس کا نام عمدۃ الاسلام ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور فقہ حنفی پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ علم سلوک کے متعلق آداب السلوک ان کی ایک تصنیف ہے۔ شیخ امان اللہ

پانی پتی کے رسالہ غیریہ کے جواب میں رسالہ عینیہ تحریر کیا۔

اس فقیر منش عالم دین نے پیر کے روز ۶ جمادی الاخریٰ ۹۷۵ھ کو دہلی میں وفات پائی۔ اپنے مکتوبات میں اپنے نام سے پہلے اپنے آپ کو "ذرّہ ناچیز" لکھتے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ وفات کے بعد جب ان کا مادّہ تاریخ نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ یہی لفظ ان کا مادّۂ تاریخِ وفات ہے۔

ان کے شاگردوں میں ملا عبدالقادر بدایونی (مصنف منتخب التواریخ) شامل ہیں۔[۲۴]

۱۵۰۔ شیخ عبدالعزیز گجراتی

شیخ عبدالعزیز گجراتی کا سلسلۂ نسب یہ ہے: ابوالقاسم عبدالعزیز بن محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن شاہو بن تکودر بن جام نندہ سندھی گجراتی۔ یہ سلطنت گجرات میں وزیر اعظم تھے، جنھیں سندِ عالی کہا جاتا تھا، حکومت کی طرف سے آصف خاں کا لقب عطا ہوا تھا۔

ابوالقاسم عبدالعزیز جمعرات ۱۲ ربیع الاول ۹۰۷ھ (ایک روایت کے مطابق ۹۰۹ھ) کو جانپانیر میں پیدا ہوئے، اور اپنے والد (محمد) کی گود میں تربیت پائی۔ ابتدائے عمر ہی میں حصولِ علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ پہلے صرف و نحو اور معانی و بیان کی تعلیم حاصل کی۔ پھر علومِ شرعیہ کی طرف توجہ مبذول کی اور قاضی برہان الدین نہروالہ کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ ان سے حدیث اور اس سے متعلقہ علوم کی تحصیل کی۔ بعد ازاں خطیب ابوالفضل گازرونی اور سید ابوالفضل استرآبادی

---

[۲۴] تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۲۱، ۱۲۲ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۸۳، ۱۸۴ — مفتاح التواریخ ص ۱۷۶ — رودِ کوثر، ص ۷۰، ۱۷ — تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۶۷۶، ۶۷۷ — اخبار الاخیار، ص ۲۸۲ — ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۹۰

کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے منطق و فلسفہ، اصول اور طب کی کتابیں پڑھیں۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو اللہ نے ان کے لیے اقبال و کامیابی کے دروازے کھول دیے اور سلطان بہادر شاہ والیِ گجرات نے (جو یکم شوال ۹۳۲ھ کو تخت گجرات پر متمکن ہوا اور رمضان المبارک ۹۴۳ھ کو اسے پرتگالیوں نے دریا میں غرق کر دیا) ان کو اپنا ندیم و مصاحب مقرر کر لیا۔ وزارت کا منصب عطا کیا اور حبیب الملک کا خطاب دیا۔ اس زمانے میں بہادر شاہ کا وزیر اعظم مجد الدین محمد بن محمد ایجی تھا، جو بڑی عمر کو پہنچ گیا تھا اور بہت کمزور ہو گیا تھا۔ وہ وزارتِ عظمیٰ سے مستعفی ہوا تو سلطان نے اس کی جگہ ابو القاسم عبد العزیز کو وزارتِ عظمیٰ کا منصب عطا کیا اور ان کو مسندِ عالی آصف خاں کے لقب سے ملقب کیا۔ اسی اثنا میں ہمایوں نے گجرات پر غلبہ حاصل کر لیا تو ان کو ۹۴۲ھ میں مکہ مکرمہ بھیج دیا گیا۔ وہاں یہ سکۂ رائج الوقت کے سات سو صندوق لے کر گئے اور بے شمار دولت مستحقین میں تقسیم کی۔ ۹۴۴ھ میں مکہ مکرمہ پہنچے تھے۔

والی مکہ ابو نمی بن برکات حسینی سے ملاقات ہوئی تو دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے۔ بعد ازاں مکہ مکرمہ سے مصر پہنچے، اس وقت ان کے رفیق سراج الدین عمر نہروالا اور والیِ مکہ کے حاجب ان کے ساتھ تھے۔ حاکمِ مصر خسرو پاشا کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو اس نے ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ جب دونوں کی آپس میں گفتگو ہوئی تو حاکمِ مصر ان کے اسلوبِ کلام اور علم و فضل سے انتہائی متاثر ہوا اور کہا۔ وہ ملک کیوں کر کسی حادثے سے دوچار ہو سکتا ہے، جس کے ارکانِ حکومت میں آپ جیسے ذہن و فکر کے حامل افراد موجود ہوں۔ انھوں نے جواب دیا، کسی ملک کو فتح تو تلوار کے زور سے کیا جاتا ہے، مگر اس کے تحفظ کے لیے رائے و تدبیر سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے دو مثالیں دیں۔ ایک بنو امیہ کے حکمران مروان کی کہ وہ بڑا شجاع اور بہادر حکمران تھا اور ساتھ ہی انتہائی صابر بھی تھا، یہاں تک کہ مصائب و آلام پر صبر کی وجہ سے لوگوں نے اسے حمار کا لقب دے

رکھا تھا اور وہ مروان الحمار کے نام سے معروف تھا، مگر رائے و تدبیر کی نعمت سے محروم تھا، لہٰذا ناکام رہا۔

دوسری مثال انھوں نے عبدالحمید کاتب کی دی جو منصور عباسی کے دور کا بہت بڑا ادیب تھا۔ جب منصور نے اس کے قتل کا حکم دیا تو اس نے منصور سے زندہ رہنے کی التجا کی اور کہا، مجھے قتل نہ کرو اور مکتوبات، رسائل اور دستاویزات معرضِ کتابت میں لانے کی خدمت پر مامور کر دو۔ منصور نے کہا۔ ہمارے لیے تمھاری تحریر سے بڑھ کر اور کوئی شی نقصان دہ نہیں ہو سکتی۔ تمھارا قلم تلوار سے زیادہ مہلک ہے۔ تمھیں زندہ رہنے دینا، اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے کہا، حکومت و فرماں روائی اللہ کے ہاتھ میں ہے، جب تک اسے کسی سلطنت کو باقی رکھنا منظور ہوتا ہے، وہ اس کے اربابِ اقتدار کو عقل و فراست اور رائے و تدبیر کی دولت سے نوازتا رہتا ہے اور جب اس کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو وہ ان سے اس عظیم نعمت کو چھین لیتا ہے۔

شیخ عبدالعزیز کچھ عرصہ مدینہ میں رہے۔ پھر مختلف علاقوں سے ہوتے ہوئے واپس مکہ مکرمہ پہنچے۔ ۹۵۵ھ تک وہاں قیام پذیر رہے۔ اس سلسلے کے واقعات بہت طویل ہیں اور ہمارے موضوع سے تعلق بھی نہیں رکھتے، اس لیے ان کے تذکرے کی ضرورت نہیں ہے۔ سلطان محمود شاہ تختِ گجرات پر متمکن ہوا تو اس نے ان کو واپس ہندوستان بلا لیا اور وزارت کا منصب عطا کیا۔

مکہ مکرمہ میں یہ تقریباً دس سال مقیم رہے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے کوئی فرض نماز بلا عذر شرعی گھر میں ادا نہیں کی۔ بلا ناغہ بیت اللہ میں باجماعت نماز پڑھتے۔ تمام وقت تلاوتِ قرآن، مطالعہ حدیث اور مطالعہ فقہ میں صرف ہوتا، وہاں کے علما و فقہا سے علمی مجالس رہتیں اور دقیق اور اہم فقہی مسائل زیرِ بحث آتے۔ تفسیر میں زیادہ تر بیضاوی و کشاف کا مطالعہ کرتے، احادیث میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحاح ستہ اور ان کے شروح و حواشی خود پڑھتے، دوسروں کو بھی پڑھاتے۔ کتبِ

فقہ میں سے ہدایہ، اس کی شروح، کنز اور اسی قسم کی دیگر کتابوں سے دلچسپی رکھتے، اصولِ فقہ میں تلویح، شرح مواقف اور ان کے حواشی کو سامنے رکھتے۔ غرض ہر وقت علمی و فقہی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف رہتے اور مکہ مکرمہ کے علمائے کرام سے دلچسپ بحثیں ہوتیں۔

تہجد کے پابند تھے، نماز خشوع و خضوع سے پڑھتے، قرآن مجید سے انتہائی شغف تھا، ان کا معمول تھا، سفر میں ہوں یا حضر میں، ہر رات نماز تہجد میں کم و بیش دس پارے کامل غور و فکر سے پڑھتے۔ ہر رمضان میں بیت اللہ میں اعتکاف کرتے اور ہمہ وقت اللہ کی یاد میں مشغول رہتے۔

فقرا و مساکین، علما و فقہا، زہاد و صلحا اور اولیا و مشائخ سے خاص تعلق خاطر رکھتے، ان کی مجلسوں میں بیٹھتے، ان کی مالی امداد کرتے اور ان سے مل کر خوشی اور مسرت کا اظہار فرماتے۔

علمائے مکہ میں ایک عالم دین شیخ ابوالحسن بکری شافعی تھے، جو علوم میں اجتہاد و امامت کے مرتبے پر فائز تھے، ان کی عادت تھی کہ کبھی کسی کے گھر نہ جاتے اور کسی سے کوئی رابطہ نہ رکھتے تھے، خوددار اور صاحبِ عظمت عالم تھے۔ ان کی ملاقات شیخ عبدالعزیز گجراتی سے ہوئی تو ان کے علم و فضل، فقاہت اور وسعتِ مطالعہ سے بہت متاثر ہوئے اور بلا تکلف ان کے ہاں آنے جانے لگے۔

شیخ عبدالعزیز نے مکہ مکرمہ میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا، جس کی مسندِ تدریس پر شیخ عزالدین عبدالعزیز زمزمی اور شیخ شہاب الدین احمد بن حجر مکی فائز تھے۔

تختِ گجرات پر سلطان محمود شاہ متمکن ہوا تو اس نے ان کو مکہ مکرمہ سے ہندوستان واپس بلا لیا اور عہدۂ وزارت پر متعین کیا۔ سلطان مذکور ہر معاملے میں ان سے مشورہ لیتا اور وہ اس کے نزدیک ہر اعتبار سے قابلِ اعتماد تھے۔ افسوس ہے اس عالم دین رکنِ حکومت کو اوائل ربیع الاول ۹۶۱ھ میں ایک اور رکنِ حکومت برہان الدین نے قتل کرا دیا۔ ان کی شہادت پر ایک کہرام بپا ہو گیا اور مختلف حضرات نے ان پر کئی

مرثیے کہے[۲۵]

شیخ عبدالعزیز گجراتی کے حالات میں شیخ ابن حجر مکی نے ایک رسالہ تحریر کیا تھا۔

۱۵۱۔ مولانا عبدالعزیز ابہری کاہانی

مولانا عبدالعزیز ابہری کاہانی جو شیخ عماد الدین کاہانی سندھی کے لقب سے ملقب تھے، اپنے دور کے محدث و فقیہ تھے اور ان کا شمار حدیث و فقہ کے اکابر علما میں ہوتا تھا۔ عرصہ تک مدرسہ شاہ رخ مرزا (یا مدرسہ سلطانیہ) اور ہرات کی خانقاہ اخلاصیہ میں درس دیتے اور تشنگانِ علوم کو اپنے فیوض علمیہ سے سیراب کرتے رہے۔ دراصل یہ ایران کے شہر ہرات کے رہنے والے تھے۔ جب بلادِ ایران فسادات کی لپیٹ میں آئے اور وہاں شاہ اسماعیل صفوی نے خروج کیا تو یہ ۹۲۸ھ کے لگ بھگ ہرات سے نکلے اور ارضِ سندھ میں آکر مقیم ہو گئے۔ ان کے دو بیٹے، مولانا اثیر الدین اور مولانا یار محمد بھی ساتھ تھے، جو جلیل القدر علمائے دین تھے سندھ میں ان دنوں جام فیروز کی حکومت تھی۔ انھوں نے کاہان کو اپنا مسکن ٹھہرایا جو اعمالِ سیوستان میں ایک معروف قریہ تھا۔ بہت جلد ان کی شہرت گرد و نواح میں پھیل گئی اور طلبائے علم وسیع تعداد میں حصولِ علم کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان سے بے شمار علما نے اخذِ علم کیا اور ان کے شاگردوں نے لوگوں کو فیض پہنچایا۔

تدریس کے علاوہ ان کا تصنیفی ذوق بھی بہت بلند تھا، جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے۔ انھوں نے نظام الدین علی شیر کے لیے مشکوٰۃ المصابیح کی شرح لکھی، اور بہت مختلف درسی کتابوں پر حواشی و تعلیقات سپردِ قلم کیں۔

ملا عبدالباقی نہاوندی نے والی سندھ جام فیروز کے عہد کے واقعات بیان کرتے

---

[۲۵] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۸۵ تا ۱۹۲۔ نیز دیکھیے تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۲۵۰، ۲۵۱۔

ہوئے مآثر رحیمی میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ مشکوٰۃ کی شرح بہ تکمیل نہیں کر پائے تھے۔ الفاظ یہ ہیں:

در آن وقت مخدوم عبدالعزیز ابہری محدّث و مولانا اثیر الدین و مولانا محمد[۲۶] پسرانِ او کہ ہر یک، عالمے متبحر بودند، بکاہان رفتہ، چند سنین بنشر و افادۂ علوم پرداختند و آمدن ایشان از ہرات بسند، بسبب خروج شاہ اسمٰعیل بود، در ایران بتاریخ شہور ثمان و عشرین و تسعمائۃ و شرح مشکوٰۃ نوشتہ اند امّا باتمام نرسیدہ۔ و جامع علوم عقلی و نقلی بودہ، و در کاہان بجوارِ رحمتِ ایزدی پیوستہ، در بقعۂ کاہان بر آسودہ اند۔[۲۷]

یعنی جام فیروز کے عہدِ حکومت میں مخدوم عبدالعزیز ابہری محدّث اور ان کے بیٹے مولانا اثیر الدین اور مولانا محمد، جو کہ متبحر عالم تھے، کاہان تشریف لائے اور کئی سال نشرِ علوم اور افادہ طلبا میں مصروف رہے۔ یہ حضرات، شاہ اسماعیل صفوی کے خروج کی وجہ سے، جو کہ ۹۲۸ھ[۲۸] کے زمانے میں ایران میں ہوا تھا، ہرات سے سندھ آئے۔ انھوں نے مشکوٰۃ کی شرح سپردِ قلم کی لیکن وہ ناتمام رہی۔ جامع علومِ عقلیہ و نقلیہ تھے۔ خطۂ کاہان میں، اللہ کے جوارِ رحمت میں آسودہ ہیں۔

کشف الظنون میں حاجی خلیفہ نے ان کی شرح مشکوٰۃ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

عبدالعزیز بن محمد بن عبدالعزیز الابہری المتوفی (فی حدود) سنۃ خمس تسعین و ثمانمائۃ لامیر علی شیر و سماہ منہاج المشکوٰۃ۔[۲۹]

---

۲۶ دیگر تذکروں میں مولانا یار محمد مرقوم ہے۔

۲۷ مآثر رحیمی ج ۲، ص ۲۷۵۔

۲۸ تاریخ معصومی میں ۹۱۸ھ لکھا ہے۔ دیکھیے ص ۱۰۶۔

۲۹ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۷۰۰۔

یعنی عبدالعزیز بن محمد بن عبدالعزیز ابہری نے جو ۸۹۵ھ [۳۰] کے لگ بھگ فوت ہوئے، امیر علی شیر کے لیے (مشکوٰۃ کی شرح لکھی) اور اس کو منہاج المشکوٰۃ کے نام سے موسوم کیا۔

بہر حال مولانا عبدالعزیز ابہری دسویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کے ایک عالم و فقیہ اور محدث بزرگ تھے۔ انھوں نے تدریس اور تصنیف دونوں طریق سے اہلِ علم کو مستفید فرمایا۔ ان کا تذکرہ اگرچہ مختصر الفاظ میں ہے تاہم برصغیر کی اسلامی اور علمی تاریخ کی متعدد کتابوں میں کیا گیا ہے [۳۱]

---

[۳۰] حاجی خلیفہ سے ان کے سنِ وفات کے بارے میں سہو ہو گیا ہے۔ بلا شبہ ان کی صحیح تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا، تاہم یہ حقیقت ہے کہ وہ تاریخ معصومی کی روایت کے مطابق ۹۱۸ھ میں اور مآثر رحیمی کے مطابق ۹۲۸ھ میں سندھ آئے۔ سندھ میں عرصہ تک تدریسی اور تصنیفی خدمات انجام دیتے رہے۔ لہٰذا ۸۹۵ھ کو کسی صورت میں ان کا سنِ وفات قرار نہیں دیا جا سکتا۔

یہاں صاحبِ نزہۃ الخواطر علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی سے بھی کشف الظنون کے حوالے کے سلسلے میں سبقتِ قلم ہو گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وذکرہ الفاضل الجلپی فی کشف الظنون، وقال انہ مات سنۃ ثمان وعشرین وتسع مائۃ ولا یصح فانہ خرج من ھرات فی تلک السنۃ ومات بکاھان۔ (نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۹۴)

یعنی کشف الظنون میں حاجی خلیفہ چلپی نے ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے ۹۲۸ھ میں وفات پائی، یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس سال تو وہ ہرات سے نکلے تھے۔ ان کی وفات کاہان میں ہوئی۔ نزہۃ الخواطر کے الفاظ نقل کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ حاجی خلیفہ نے ان کا سالِ وفات ۹۲۸ھ نہیں لکھا بلکہ ۸۹۵ھ لکھا ہے لفظوں میں بھی اور ہندسوں میں بھی۔

[۳۱] ملاحظہ ہو۔ مآثر رحیمی ج ۲ ص ۵۷۵۔ تاریخ معصومی ص ۱۰۶۔ تحفۃ الکرام ص ۲۴۴۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۹، ۲۷۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

۱۵۲۔ قاضی عبدالغفور پانی پتی

قاضی عبدالغفور پانی پتی، بھولا کے عرف سے معروف تھے۔ شیخ وقت اور عالم وفقیہ تھے۔ ان کا شمار اپنے عصر کے مشاہیر فقہا میں ہوتا تھا۔ حنفی المسلک تھے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے معاصر تھے۔ وحدت الوجود کے مسئلہ سے متعلق انھوں نے شیخ سے مناظرہ ومباحثہ بھی کیا تھا۔ شیخ کے بیٹے شیخ رکن الدین محمد بن عبدالقدوس نے لطائف قدوسی میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ مناظرہ خاصی دیر جاری رہا۔ بالآخر قاضی ممدوح خاموش ہو گئے تھے اور شیخ کی گفتگو کا جواب نہیں دے سکے تھے۔[۳۲]

۱۵۳۔ مفتی عبدالغفور امروہوی

مفتی عبدالغفور بن عبدالملک بن محمود حسینی امروہوی، شیخ، عالم باعمل، فقیہ اور اللہ کے نیک بندے تھے۔ ان کے والد شیخ عبدالملک امروہہ کی مسندِ افتا پر فائز تھے۔ باپ کی وفات کے بعد ۹۵۰ھ میں مفتی عبدالغفور نے یہ مسند سنبھالی اور علم وافتا کے سلسلے میں باپ کے صحیح جانشین ہوئے۔ تادمِ زندگی اس منصب پر متمکن رہے۔ ۹۹۰ھ میں یا اس کے لگ بھگ وفات پائی۔ ۹۹۰ھ میں یہ مسند ان کے بیٹے مفتی عبدالقدوس کے سپرد ہوئی۔[۳۳]

۱۵۴۔ شیخ عبدالغفور اعظم پوری

شیخ عبدالغفور اعظم پوری، اعظم پور کے رہنے والے تھے، جو ہندوستان کے

۳۲ھ لطائف قدوسی ص ۵۵، ۵۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۹۵

۳۳ھ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۹۵ بحوالہ نخبۃ التواریخ

صوبہ یوپی میں واقع ہے۔ صالح عالم دین اور فقیہ وقت تھے۔ مسلکاً حنفی تھے۔ کتب درسیہ شیخ نظام الدین کاکوروی سے پڑھیں اور طویل مدت تک ان سے وابستہ رہے۔ تصوّف وطریقت سے دلچسپی پیدا ہوئی تو شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اخذِ طریقت کیا۔ اللہ نے صورت وسیرت دونوں سے نوازا تھا۔ علمائے ربانی میں سے تھے۔ علوم شرعیہ کا درس دیتے اور طلبا کو مستفید فرماتے تھے۔ جمعہ کے روز باقاعدہ وعظ کہتے تھے۔ بیعت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ بیعت لینے والوں کو امورِ خیر پہ قائم رہنے کی تلقین کرتے اور برائی کے ارتکاب سے روکتے۔ عوام کے علاوہ علما و مشائخ نے بھی ان سے استفادہ اور استفاضہ کیا۔

دسویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم دین نے بیاسی[۸۲] سال کی عمر پا کر ۹۸۵ھ میں وفات پائی[۳۴]۔

۱۵۵۔ شیخ عبدالغنی فتح پوری

شیخ عبدالغنی بن حسام الدین صدیقی فتح پوری، ایک فاضل بزرگ تھے، اور فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ فتح پور میں پیدا ہوئے جو اعمالِ لکھنؤ میں واقع ہے، وہیں نشوونما پائی اور عمر کی کچھ منزلیں طے کیں۔ حصولِ علم کے لیے جون پور کا قصد کیا اور وہاں شیخ معروف بن عبدالواسع جون پوری اور دیگر علما سے کسبِ علم کیا۔ شیخ نظام الدین عثمانی امیٹھوی بھی ان کے شریکِ درس تھے اور ان کی آپس میں بہت دوستی تھی۔ مدت تک شیخ معروف کی خدمت میں رہے۔ علم طریقت بھی ان سے حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن فتح پور واپس آئے اور درس وافادہ میں مصروف ہو گئے[۳۵]۔

---

[۳۴] منتخب التواریخ ص ۲۹۲ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۵ — طبقاتِ اکبری ص ۴۹۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۹۵، ۱۹۶

[۳۵] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۹۶ بحوالہ تحقیق الانساب

۱۵۶۔ علامہ عبدالقادر سرہندی

علامہ عبدالقادر حنفی سرہندی (جنھیں گلزار ابرار میں مولانا عبدالقادر صابونی لکھا گیا ہے) شیخ عصر اور فاضل بزرگ تھے۔ علم و تحقیق کی وسعتوں کی بنا پر دسویں صدی ہجری میں انھیں دیارِ ہند کے مشہور اساتذہ میں گردانا جاتا تھا۔ شیخ الہداد (اللہ داد) بن صالح سرہندی سے تحصیل علم کی اور بہت عرصہ تک ان سے وابستگی و مصاحبت اختیار کیے رکھی۔ پھر دہلی میں مسندِ تدریس پر فائز ہوئے اور تمام عمر درس و افادہ میں مصروف رہے۔ اپنے عصر اور شہر میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا۔ مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری اور بہت سے لوگوں نے ان سے کسبِ علم کیا۔

علوم و فنون پر علامہ عبدالقادر سرہندی کے عبور و مہارت کا یہ عالم تھا کہ شیخ الہداد جون پوری (اللہ داد جون پوری) نے علمِ نحو کی مشہور کتاب کافیہ کی جو شرح لکھی، اس پر انھوں نے حواشی و تعلیقات لکھیں، جس کی علامہ عصام الدین اسفرائینی نے اس درجہ تحسین کی کہ انھیں اپنی کتاب الاطول تحفہ کے طور پر بھیجی۔ ان کی شہرتِ علمی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ علمِ بیان کی معروف کتاب مطول کے محشی شیخ حسن چلپی ہندوستان آئے تو ان کی زیارت و ملاقات کے لیے سرہند گئے، ان کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور ان کے فضل و کمال کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا۔[۳۶]

۱۵۷۔ قاضی عبداللہ سندھی

قاضی عبداللہ بن ابراہیم عمری سندھی، دیارِ سندھ کے ایک شہر دربیلہ

۳۶؎ اذکار ابرار (دربا دشیخ اللہ داد بن صالح ص ۴۹۴ — مرآۃ العالم بختاور خان — نزہتہ الخواطر، ج ۴ ص ۱۹۸

میں پیدا ہوئے اور شارح مشکوٰۃ شیخ عبدالعزیز ابہری سے اخذِ علم کیا۔ اپنے زمانے کے شیخ، عالم و فقیہ، متقی اور پرہیزگار تھے، مگر مزاج میں سختی اور تیزی کا عنصر غالب تھا۔ ابتدا میں اپنے اصل وطن دربیلہ میں رہتے تھے اور وہاں ان کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن جب شاہی بیگ نے سندھ فتح کیا تو باغبان اور برادت چلے گئے تھے، پھر کچھ عرصہ ہی بعد ۹۴۴ھ میں سندھ سے عازم گجرات ہوئے، وہاں سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہیں وفات پائی۔

قاضی عبداللہ کے تین خلیفے اور شاگرد تھے اور وہ تھے، شیخ صالح، شیخ رحمت اللہ اور شیخ حمید۔ شیخ رحمت اللہ اور شیخ حمید قاضی ممدوح کے فرزند تھے۔ پہلے تو یہ دونوں ہندوستان رہے، بعد کو حرمین شریفین چلے گئے تھے۔ دونوں بھائیوں نے عمر کا زیادہ حصہ وہیں گزارا اور خدمتِ دین میں مصروف رہے۔

قاضی عبداللہ کے بیٹے شیخ رحمت اللہ اپنے عہد کے یگانہ عالمِ دین تھے۔ احکامِ حج کے بارے میں انھوں نے تین رسالے تصنیف کیے، جن میں ایک کا نام "المنسک الحج" ہے۔ ملا علی قاری نے اس کو بالخصوص اہمیت دی اور اس کی شرح لکھی۔ ان کا انتقال مکہ مکرمہ میں ہوا۔

دوسرے فرزند شیخ حمید بھی علم و فضل کے زیور سے آراستہ اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔ تفسیر و حدیث میں خصوصیت سے درک حاصل تھا۔ تاریخ معصومی کے مصنف میر محمد معصوم بھکری کے استاذ تھے۔ میر موصوف نے ان سے مشکوٰۃ اور دیگر کتب احادیث کا باقاعدہ درس لیا اور سند و اجازہ سے سرفراز ہوئے۔ حرمین شریفین گئے اور پھر مکہ شریف ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ وہاں درسِ حدیث میں مشغول ہو گئے اور مکہ مکرمہ کے علما میں قدر و منزلت کے حامل قرار پائے۔

قاضی عبداللہ سندھی مکہ مکرمہ کس طرح پہنچے؟ اور زادِ راہ کہاں سے ملا۔؟ بات یہ ہے کہ ان کے قیامِ گجرات کے زمانے میں ایک عالم شیخ علی متقی بھی گجرات میں

موجود تھے، جن کے زہد و اتقا کی بڑی شہرت تھی اور اسی وجہ سے بلادِ گجرات میں بہت ہی قبولیت و عظمت کے حامل تھے۔ والیِ گجرات بہادر شاہ ان کے فضل و کمال کا انتہائی معترف تھا اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے استفاضہ کرنے کا خواہاں تھا، مگر شیخ متقی اس پر رضامند نہ ہوتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ بادشاہ ان کی مجلس میں آئے۔ ایک روز اس نے قاضی عبداللہ سندھی سے بات کی اور ملتجی ہوا کہ شیخ اسے اپنی مجلس میں حاضر ہونے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ قاضی موصوف نے شیخ سے بادشاہ کی اس خواہش کا اظہار کیا، اور ان کی مجلس میں آنے کے لیے اس کی سفارش کی تو نہایت خفا ہوئے اور فرمایا، یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ میرے پاس اپنی تمام منکرات اور خلافِ شرع امور کے ساتھ آئے اور میں اسے نیکی پر عمل پیرا ہونے کا اور برائی سے رکنے کا حکم نہ دوں۔ میں لازماً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بجا لاؤں گا۔ اگر اسے یہ منظور ہے تو آنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ قاضی نے بادشاہ سے بات کی تو اس نے عرض کیا کہ وہ جس انداز سے چاہیں امر بالمعروف کریں اور جس صورت میں مناسب سمجھیں نہی عن المنکر فرمائیں۔ مجھے سب منظور ہے۔

اب شیخ نے حاضرِ مجلس ہونے کی اجازت دی تو وہ انتہائی احترام کے ساتھ اندر آیا، شیخ کے ہاتھ کو بوسہ دیا، وہاں کچھ دیر بیٹھا اور چلا گیا۔ پھر اس نے ایک لاکھ تنکہ جو سکہ رائج الوقت تھا، شیخ کی خدمت میں بھیجا، وہ پوری رقم شیخ نے قاضی عبداللہ کو دے دی جو حرمین شریفین جانے کے لیے ان کا زادِ راہ ہوئی۔[۲۳۷]

۱۵۸- مولانا عبداللہ تلنبی

مولانا عبداللہ بن اللہ داد عثمانی تلنبی، شیخِ عصر، علامۂ دہر اور فاضلِ وقت

---

[۲۳۷] تاریخ معصومی ص ۲۷۸، ۲۷۹- تحفۃ الکرام ص ۲۴۴، ۲۴۳- اخبار الاخیار ص ۲۸۰، ۲۸۱- تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۲- نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۰۲، ۲۰۳- اذکار ابرار ص ۵۰۴۔

تھے۔ علاقہ ملتان کے مشہور مقام، تلنبہ کے رہنے والے تھے۔ تلنبہ میں پیدا ہوئے۔ وہیں پرورش پائی اور پھر اسی شہر اور اس کے گرد و نواح کے علما سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یعنی خط، حساب اور علوم عربیہ کی چند کتابیں پڑھیں۔ مزید حصولِ علم کا شوق دامن گیر ہوا تو دیارِ ہند سے نکلے اور عراق عجم کی راہ لی۔ وہاں علامہ عبداللہ یزدی کا سلسلۂ تدریس جاری تھا، ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے اور ان سے منطق و فلسفہ کی تکمیل کی۔ طویل عرصہ تک ان کی خدمت میں رہ کر استفادہ کیا، یہاں تک کہ آغازِ عمر اور عنفوانِ شباب ہی میں علومِ نقلیہ و عقلیہ پر اس درجہ عبور حاصل کر لیا کہ سب سے سبقت لے گئے۔ اب وہ علوم مروجہ میں ماہر تھے اور اس ضمن میں اپنا کوئی حریف نہ رکھتے تھے۔ فرطِ ذکاوت، تیزیِ ذہن، قوتِ حافظہ اور سرعتِ ادراک میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

فارغ التحصیل ہو کر وطن واپس آئے تو ان کا شمار ملک کے اکابر علما میں ہونے لگا۔ اپنے شہر تلنبہ میں مسندِ تدریس آراستہ کی اور کئی سال درس و افادہ میں مصروف رہے۔ پھر ملتان اور اس کے گرد و نواح فتنہ و فساد کی زد میں آئے، تو تلنبہ کی سکونت ترک کر کے دہلی چلے گئے۔ (اس سفر میں مولانا عزیز اللہ تلنبی بھی ان کے ساتھ تھے، جن کے حالات آگے بیان ہوں گے) تختِ دہلی پر ان دنوں سلطان سکندر لودھی متمکن تھا۔ وہ علما کا بہت قدردان تھا۔ اس کو مولانا عبداللہ کی دہلی میں آمد کی اطلاع ہوئی تو بے حد خوش ہوا، ان کی تشریف آوری کو مغتنم جانا اور ان کے علم و فضل کی فراوانیوں سے متاثر ہو کر انھیں ملک العلما کا خطاب عطا کیا۔

سکندر لودھی کی طرف سے انھیں دہلی کی مسندِ تدریس پیش کی گئی۔ ان کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا اور انھوں نے منطق و حکمت کی مشکل و دقیق کتابوں کو نہایت تحقیق سے پڑھانا شروع کیا۔ ان کے دہلی کے درس سے دیارِ ہند کے چالیس متبحر اور عظیم عالمِ دین فارغ ہو کر نکلے۔ انھوں نے مروّجہ نصاب میں بڑی تبدیلی کی،

اور اس زمانے کے حالات کے مطابق اس میں نئی نئی کتابیں داخل کیں، مثلاً ان سے پہلے ہندوستان کے مدارس میں منطق کی شرح شمسیہ اور علم کلام کی شرح الصحائف اور دیگر چند رسائل پڑھائے جاتے تھے، انھوں نے ان کو وسعت دی اور نصاب میں بہت سی دیگر کتابوں کو شامل کیا۔

شاہِ ہند سکندر لودھی ان سے انتہائی تکریم کے ساتھ پیش آتا تھا، وہ ان کے درس میں استفادہ کی غرض سے حاضر ہوتا لیکن دبے پاؤں آتا اور ادب سے ایک گوشے میں آکر بیٹھ جاتا تاکہ بادشاہ کی آمد کی وجہ سے طلبا کے سبق میں خلل واقع نہ ہو۔ درس کے بعد وہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا، ان کو سلام کرتا اور دیر تک مؤدب ہو کر ان کی صحبت میں بیٹھتا۔ اس ضمن میں ملا عبدالقادر بدایونی کے یہ الفاظ قابلِ مطالعہ ہیں:

ومی گویند کہ سلطان سکندر در وقتِ درس شیخ عبداللہ می آید و بتقریب اینکہ مبادا خلل در سبقِ طلبہ افتد پنہاں در گوشہ مجلس آہستہ می نشست و بعد از فراغ درس سلام علیک گفتہ، بایک دیگر صحبت می داشتند[۳۸]

سکندر لودھی علم اور اہلِ علم کا قدر دان تھا۔ علما کی مجلس میں باقاعدہ حاضری دیتا اور ان کے خیالات سے استفادہ کرتا۔ وہ کبھی کبھی علما کے اجتماع بھی منعقد کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مختلف اقطاعِ ہند کے علمائے کرام کو جمع کیا، جس میں بعض مسائل زیرِ بحث لائے گئے۔ اس نے علما کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک فریق مولانا عبداللہ تلنبی اور مولانا عزیز اللہ تلنبی پر مشتمل تھا، اور دوسرا شیخ الہداد (اللہ داد) جون پوری اور ان کے بیٹے شیخ بھکاری پر۔ بحث و مناظرہ کا آغاز ہوا، تو دونوں فریقوں نے خوب خوب دادِ تحقیق دی۔ بحث تحریری اور تقریری دونوں صورتوں میں ہوئی۔ سلطان خود بھی ذی علم تھا اور مسائل کی باریکیوں کو خوب سمجھتا تھا۔

۳۸؎ منتخب التواریخ ص ۸۶۔

اس نے فیصلہ دیا کہ فریقِ اول حُسنِ تقریر میں فریقِ ثانی سے بازی لے گیا ہے اور فریقِ ثانی حسنِ تحریر میں فریقِ اوّل سے بڑھ گیا ہے۔

مولانا عبداللہ تلنبی علمِ فقہ سے بھی تعلق رکھتے تھے اور ان کا شمار اپنے دَور کے نامور فقہا میں ہوتا تھا۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں سے چالیس سے زائد جلیل القدر علمائے دین نے خاص طور سے شہرت حاصل کی۔ ان میں مفتی جلال الدین، ان کے بڑے بھائی شیخ عبدالغفور بن نصیرالدین دہلوی، میاں شیخ گوالیاری اور میراں جلال الدین بدایونی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر عالم ان کی فیضِ صحبت سے نابغہ روزگار ہوئے اور اپنے عصر کے مشاہیر اساتذہ میں سے گردانے گئے۔ وہ اعلیٰ درجے کا تصنیفی ذوق بھی رکھتے تھے۔

وہ پہلے ہندی عالم ہیں جنھوں نے ہندوستان میں فلسفے کے مطالعے کو فروغ دیا، اور پہلے ہندی مصنف ہیں جنھوں نے فلسفے کے موضوع پر کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے بدیع المیزان کے نام سے منطق کی مشہور کتاب میزان المنطق کی شرح لکھی جو اس موضوع پر ایک ہندی عالم کی پہلی تصنیف ہے۔ یہ شرح اور اصل متن اب بھی مقبول ہیں اور پاک و ہند میں منطق کے طلبا ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

اس کتاب کے قلمی نسخے انڈیا آفس لائبریری لندن، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن، بانکی پور، رام پور، ندوۃ العلما لکھنؤ اور دہلی کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

مولانا عبداللہ تلنبی نے ۹۲۲ھ کو دہلی میں وفات پائی۔ قرآن کے الفاظ: اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى سے ان کی تاریخِ وفات نکلتی ہے[39]

۱۵۹۔ مولانا عبداللہ جون پوری

مولانا عبداللہ بن اللہ داد جون پوری، حنفی المسلک تھے اور اپنے عصر کے شیخ و

---

[39] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۱ — ابجد العلوم ص ۸۹۴ — مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۷۵، ۱۷۶ — سبحۃ المرجان ص ۴۲ — نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۰۴، ۲۰۵ — منتخب التواریخ ص ۸۶ — حدائق الحنفیہ ص ۳۶۲، ۳۶۳ -

فاضل بزرگ تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی اور بچپن ہی میں اپنے والدِ مکرم شیخ اللہ داد جون پوری سے تحصیلِ علم میں مشغول ہوگئے۔ طویل عرصہ تک ان سے منسلک رہے۔ یہاں تک کہ علوم عربیہ میں ممتاز درجے تک پہنچے اور اپنے معاصرین واقران سے فوقیت لے گئے۔ یہ وہی عالمِ دین ہیں، جنھیں مصنفِ منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی شیخ بھکاری کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

برصغیر میں یہ رواج ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اصل ناموں کے علاوہ پیار سے دوسرے ناموں سے بھی پکارتے ہیں اور پھر یہ نام آخر تک بطور عرف ان کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے مولانا عبداللہ کے نام کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ان کا اصل نام عبداللہ تھا، انھیں بچپن میں بھکاری کے نام سے پکارا جاتا تھا، جس کا آخر تک ان پر اطلاق ہوتا رہا۔

"تذکرہ علمائے ہند" میں شیخ بھکاری جون پوری ابن شیخ اللہ داد جون پوری کے عنوان سے ان کا تذکرہ موجود ہے اور انھیں سلطان سکندر لودھی کے عہد کے فحول علما میں سے شمار کیا گیا ہے۔ یہ وہی شیخ بھکاری ہیں اور ان کے والد شیخ اللہ داد جون پوری بھی وہی بزرگ ہیں، جو سلطان سکندر لودھی کے دربار کے ایک مناظرے میں مولانا عبداللہ تلنبی اور مولانا عزیز اللہ تلنبی سے تحریر میں سبقت لے گئے تھے۔[۴۰]

۱۶۰۔ شیخ عبداللہ متقی سندھی

شیخ عبداللہ بن سعد اللہ متقی سندھی، سرزمینِ سندھ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ سندھ سے گجرات چلے گئے تھے۔ گجرات میں سندھ کے ایک اور عالم وفقیہ قاضی عبداللہ بن ابراہیم سندھی مقیم تھے۔ ۹۴۷ھ میں ان سے ملاقی ہوئے۔

---

[۴۰] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۰۵ — تذکرۂ علمائے ہند، ص ۳۳۔ نیز ملاحظہ ہو منتخب التواریخ ص ۸۶۔

پھر حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں کے علمائے کرام اور صاحب کنز العمال شیخ علی متقی برہان پوری سے علمِ حدیث کی تحصیل کی۔ مدینہ منورہ میں طویل عرصہ تک مقیم رہے۔ یہاں تک کہ شیخ عبداللہ مہاجر مدنی کے نام سے معروف ہوئے۔ تفسیر اور حدیث کے جلیل القدر عالم تھے، ان کے زمانے میں علم وفضل کے میدان میں کوئی ان کی ٹکر کا نہ تھا۔

مدینہ منورہ میں کئی سال کی اقامت کے بعد ۹۷۷ھ کو شیخ رحمت اللہ بن قاضی عبداللہ سندھی کی معیت میں مراجعت فرمائے ہند ہوئے اور کئی سال گجرات میں مقیم رہے۔ وہاں درس وافادہ میں مشغول ہو گئے۔ اس اثنا میں ان سے خلقِ کثیر نے استفادہ کیا اور بہت سے علما ان کے حلقہ درس سے فارغ ہو کر نکلے۔ گجرات سے پھر عازم مکہ مکرمہ ہوئے۔

شیخ عبداللہ، جہاں زیورِ علم وفضل سے آراستہ تھے، وہاں ورع وتقویٰ اور زہد وعبادت میں بھی عدیم المثال تھے اور اسی بنا پر لوگوں میں عبداللہ متقی کے نام سے معروف تھے۔

تصنیف وتالیف کے ذوق سے بھی بہرہ ور تھے۔ جمع المناسک ونفع المناسک ان کی تصنیفات میں سے ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۹۵۰ھ میں تصنیف کی۔ اس کے علاوہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف پر حواشی تحریر کیے۔

دسویں صدی ہجری کے برصغیر پاک وہند کے اس نامور مفسر اور شہرۂ آفاق محدث نے ماہ ذی الحج ۹۸۴ھ کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔[1]

النور السافر میں ان کے بارے میں جو الفاظ مرقوم ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے:

شیخ علامہ بہت سے فنون کے ماہر تھے۔ عبداللہ بن سعد الدین مدنی سندھی نے ۹۸۴ھ کے ماہ ذی الحجہ میں مکہ شریف میں وفات پائی۔ یہ ایک زبردست عالم اور رجیدؔ

[1] تحفۃ الکرام ص ۳۴۴ — تاریخ معصومی ص ۲۸۱ — ہدیۃ العارفین ج ۱، ص ۴۷۲، ۴۷۳ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۲، ۲۶۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۰۵، ۲۰۶۔

متبحر امام تھے۔ ان کی کتنی ہی تصانیف ہیں، جن میں سے ایک سہروردی کی عوارف المعارف پر حاشیہ ہے[۴۲]۔

۱۶۱۔ شیخ عبداللہ انصاری سلطان پوری

شیخ عبداللہ بن شمس الدین انصاری سلطان پوری، عالم کبیر اور شیخ عصر تھے۔ مخدوم الملک کے خطاب سے مشہور تھے۔ اصلاً علاقہ سندھ کے شہر ٹھٹھہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا، ٹھٹھہ سے مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر چلے گئے تھے۔ شیخ عبداللہ اسی علاقے کے ایک مقام سلطان پور میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ اس زمانے میں سرہند میں علامہ عبداللہ سرہندی (متوفی ۱۰۰۰ھ) کی مسند تدریس بچھی ہوئی تھی۔ یہ وہاں پہنچے اور ان سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ سرہند سے دہلی گئے، وہاں شیخ ابراہیم بن معین الدین حسینی ایرجی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ ان سے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد واپس اپنے شہر آگئے اور تدریس و تصنیف اور تذکیر و موعظت میں مشغول ہو گئے۔ وسعت علم اور عمل و تقویٰ میں خاص شہرت کے حامل تھے اور اس سلسلے میں ان کو اللہ نے بڑی قبولیت اور عظمت سے نوازا تھا[۴۳]۔

مغل حکمران نصیر الدین ہمایوں ان سے بے حد عقیدت رکھتا تھا، اس نے ان کو شیخ الاسلام کا منصب عطا کیا اور جب تک وہ حکمران رہا، یہ اس منصب پر فائز رہے۔

شیخ عبداللہ سلطان پوری نے ہندوستان کے چار عظیم الشان بادشاہوں ــ ہمایوں، شیر شاہ سوری، سلیم شاہ سوری اور جلال الدین اکبر ــ کا زمانہ پایا، یہ

---

[۴۲] النور السافر، ص ۳۵۷۔

[۴۳] منتخب اللباب ج ۱، ص ۲۴۰، ۲۴۱

چاروں بادشاہ ان سے نہایت عزت واحترام سے پیش آتے تھے اور ان کے امرا و وزرا بھی ان کی بدرجہ غایت تکریم کرتے تھے۔ ہمایوں نے اپنے پہلے دَورِ حکومت میں بھی ان کو پورے ملکِ ہند کا شیخ الاسلام مقرر کیا اور پھر جب وہ ایران سے واپس آکر دوبارہ سریر آرائے سلطنتِ ہند ہوا تو بھی اس نے ان کو اسی منصب جلیلہ پر فائز کیا۔ شیر شاہ سوری نے ان کو صدر الاسلام کے لقب سے ملقب کیا۔ اس کا بیٹا سلیم شاہ سوری تو ان کا اس درجہ معتقد تھا کہ ان کو اپنے برابر تخت پر بٹھاتا اور بیش بہا نذرانے پیش کرتا تھا۔

ہمایوں کے بعد ہندوستان کے اورنگِ حکومت پر جلال الدین اکبر متمکن ہوا، تو اس نے ان کو مخدوم الملک کے خطاب سے نوازا اور ایک لاکھ دام ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ کئی سال تک اکبر ان سے انتہائی اکرام کے ساتھ پیش آتا رہا، لیکن جب اس کے دربار میں ملا مبارک کا عمل دخل ہوا اور اس نے اس کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ تو خود مجتہد فی المذہب ہے، اس کے لیے مذہبی معاملات میں صدور و قضاۃ کی بات ماننا اور ان کی رائے پر عمل کرنا ضروری نہیں، تو اس نے ان کو دیارِ ہند سے نکل جانے اور حرمین شریفین چلے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ ۹۸۷ھ میں انھوں نے اس ملک سے رختِ سفر باندھا اور مکہ مکرمہ جا پہنچے۔ وہاں کے اکابر علما کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئے۔

اس زمانے میں شیخ شہاب الدین احمد بن حجر مکّی وہاں مقیم تھے، وہ ان سے انتہائی اجلال و تعظیم سے پیش آئے اور ان کی تشریف آوری کو علم اور اہلِ علم کے لیے نیک شگون قرار دیا۔ وہ خاصا عرصہ وہاں اقامت گزین رہے اور اس اثنا میں طلبا و علما نے ان سے بہت استفادہ کیا۔ بعد ازاں واپس ہندوستان آگئے اور گجرات میں مقیم ہو گئے، جہاں انھیں زہر دے کر مار دیا گیا۔

وہ علامۂ زماں اور یگانۂ دَوراں تھے۔ حدیث، فقہ، اصول اور باقی علومِ عربیہ اور تاریخ میں کوئی ان کا ہم سَر نہ تھا، تمام مروجہ نقلی اور عقلی علوم میں

ماہر کامل تھے۔ اہلِ بدعت اور اہلِ ہوا کے شدید مخالف تھے اور ان سے متعلق برملا اظہارِ عداوت کرتے تھے۔ دین کی ترویج اور شریعت کی تنفیذ میں ہر آن کوشاں رہتے اور اس سلسلے میں کسی سے کوئی رعایت نہ برتتے۔

ان کا تصنیفی ذوق بھی بلند تھا اور وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں کشف الغمہ، منہاج الدین، عصمۃ الانبیاء، شرح شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم شرح عقیدہ حافظیہ اور بہت سے رسائل شامل ہیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں شیخ عبداللہ سلطان پوری کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں، شیخ موصوف متعصب سُنّی تھے، اور شیعہ کے شدید مخالف تھے۔ اس ضمن میں ملا عبدالقادر اور شیخ عبداللہ کے درمیان مکالمہ بھی ہوا جس کی تفصیل ملا موصوف نے بیان کی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

شیخ عبداللہ کو اس پر اصرار تھا کہ روضۃ الاحباب کا تیسرا دفتر امیر جمال الدین محدث کا تصنیف کردہ نہیں ہے۔ جس سال گجرات فتح ہوا تھا اور وہ (شیخ عبداللہ سلطان پوری) شاہی دیوان خانے کے وکیل تھے، اور یہ زمانہ ان کے جاہ و جلال کا زمانہ تھا، میں (ملا عبدالقادر بدایونی) پنجاب کے سفر سے واپس آیا اور شیخ ابوالفضل (جو ابھی شاہی ملازم نہیں ہوا تھا) اور حاجی سلطان تھانیسری کے ساتھ مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری سے ملاقات کے لیے گیا۔ ہم نے دیکھا، وہ روضۃ الاحباب کے تیسرے دفتر کو کھولے بیٹھے تھے۔ اور کہہ رہے تھے "دیکھو ایرانی علما نے دین میں کتنی خرابی پیدا کر دی ہے"۔ پھر انھوں نے وہ شعر دکھایا، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعریف میں کہا گیا تھا:

ہمیں بس بود حق نمائی او کہ کردند شک در خدائی او

کہنے لگے، "اس نے تو رفض سے آگے بڑھ کر حلولِ خداوندی تک معاملہ پہنچا دیا ہے۔ مَیں نے طے کر لیا ہے کہ اس جلد کو شیعوں کے سامنے جلا ڈالوں"۔

اس سے آگے ملا عبدالقادر لکھتے ہیں:

ئیں اس وقت نہایت گم نام اور غیر معروف تھا، اور یہ ان سے پہلی ملاقات تھی، پھر بھی جرأت کر کے میں نے کہا۔ یہ شعر تو ان اشعار کا ترجمہ ہے جو امام شافعی سے منسوب ہیں:

لو ان المرتضٰی ابدی محلہ　　لصار الناس طرا سجد الہ
کفی فی فضل مولانا علی　　وقوع الشک فیہ انہ اللہ

یہ اشعار سن کر عبداللہ سلطان پوری نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا۔ "یہ کس کتاب میں ہیں"؟

ئیں نے کہا "شرح دیوان امیر میں"! کہا، "اس دیوان کا شارح قاضی میر حسین میبذی ہے، اور وہ بھی رفض سے متہم ہے"۔ ئیں نے کہا۔ یہ "الگ بحث ہے۔" ابوالفضل اور حاجی سلطان اپنے لبوں پہ ہاتھ رکھ کر بار بار مجھے خاموش ہو جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔

پھر میں نے کہا۔ "بعض معتبر لوگوں سے میں نے سنا ہے کہ روضۃ الاحباب کا تیسرا دفتر میر جمال الدین محدّث کا نہیں ہے ان کے بیٹے میرک شاہ یا کسی اور کا ہے۔ اس لیے کہ اس کا اسلوبِ تحریر پہلے دو دفتروں کے اسلوبِ تحریر سے ہم آہنگ نہیں ہے اس کا اسلوب شاعرانہ ہے اور پہلے دو دفتروں کا محدثانہ۔"!

مخدوم الملک نے جواب دیا۔ "اے بابا۔ ایں نے تو دوسرے دفتر میں بھی ایسی باتیں دیکھی ہیں جو صریحاً بدعت اور فاسد عقیدہ پر دال ہیں۔ مَیں نے ان مقامات پہ حواشی لکھ رکھے ہیں۔ چنانچہ مصنف نے لکھا ہے کہ حضرت طلحہؓ نے جب سب سے پہلے حضرت امیر المومنین (علیؓ) سے بیعت کی تو آپ نے فرمایا: ید شلاء و بیعۃ شلاء (یعنی ہاتھ بھی شل اور بیعت بھی شل!) غور کرو کہ جو ہاتھ جنگِ اُحد کے دن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ بنا ہوا تھا اور جس پر گیارہ زخم آئے تھے، اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ بُرا شگون کہیں، جو شرعاً ممنوع ہے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اسے جھوٹ سمجھتا ہوں۔"

میں نے کہا، "تفاؤل اور شگون میں بڑا فرق ہے"۔ اس وقت ابوالفضل نے چپکے سے میرے ہاتھ کو پکڑ کر گڑا اور آگے بات کرنے سے روک دیا۔

مخدوم الملک نے میرے بارے میں پوچھا "ان کی تعریف کیا ہے۔؟" ساتھیوں نے میرے متعلق ان کو کچھ باتیں بتائیں، اور یہ ملاقات بخیریت ختم ہو گئی۔

اس سے آگے بدایونی لکھتے ہیں:

جب ہم وہاں سے نکلے تو دوستوں نے کہا۔ خیریت گزری کہ انھوں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اگر پھنس جاتے تو کون چھڑانے والا تھا۔

مزید لکھتے ہیں:

اوّل اوّل جب مخدوم الملک نے شیخ ابوالفضل کو دیکھا تو اپنے شاگردوں سے کہا تھا کہ "اس شخص سے دین میں بہت خلل واقع ہوگا"

چو طفلش بدیدم بنمودم اہلِ دیں را
کہ شود بلائے جانہا بہ شما سپردم دیں را

مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری نے ۹۹۰ھ میں مکہ معظمہ سے واپس آنے کے بعد گجرات میں وفات پائی۔ ان کی تاریخ وفات میں یہ قطعہ کہا گیا:

رفت مخدوم ملک و باخود برد رحمۃ اللہ نشان پیشانی
جستم از دل چو سال تاریخش گفت بشمار مصرعہ ثانی

انھیں گجرات میں جلال الدین اکبر کے حکم سے زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ یہ ۹۹۰ھ یا ۹۹۱ھ کا واقعہ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھیں اکبر کی طرف سے ہر وقت جان کا خطرہ رہتا تھا، وہ اسی خطرے اور خوف سے جان بحق ہو گئے۔ ان کی موت تو گجرات میں واقع ہوئی مگر پوشیدہ طور پر ان کی میت کو جالندھر لا کر دفن کیا گیا۔

مخدوم الملک اس قدر مال دار تھے کہ ان کی موت کے بعد تین کروڑ روپے ان کے خزانے سے برآمد ہوئے۔

ایک روایت کے مطابق ان کی وفات اس طرح ہوئی کہ جب اکبر نے دینِ الٰہی

ایجاد کیا تو انھوں نے نہ صرف اس کو ماننے سے انکار کیا بلکہ اس کے مقابلے پر اُتر آئے۔ اس پر اکبر نے ان کو اپنے ملک سے نکل جانے کا حکم دیا۔ یہ ایک مسجد میں معتکف ہو گئے۔ اکبر نے کہا کہ یہ مسجد بھی میرے ملک کی زمین میں واقع ہے، آپ اس سے بھی نکل جائیں۔ چنانچہ وہ حرمین شریفین چلے گئے۔ حج سے واپس آئے تو گجرات میں قیام پذیر ہوئے۔ وہاں اکبر کے حکم سے کھانے میں زہر ملا کر ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا[۱۴۹]۔

مولوی فقیر محمد جہلمی نے ان کا ذکر گیارھویں صدی ہجری کے فقہا و علما میں کیا ہے اور ان کی تاریخ وفات ۱۰۰۶ھ تحریر کی ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ دسویں صدی ہجری کے عالم وفقیہ ہیں اور ان کا سنِ وفات ۹۹۰ھ یا ۹۹۱ ہجری ہے۔

مخدوم الملک کی زندگی کا ایک اور پہلو

صمصام الدولہ شاہ نواز خاں نے مآثر الامرا میں مخدوم الملک عبداللہ انصاری کے حالات خاصی تفصیل سے بیان کیے ہیں، جن سے ان کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ ذیل میں مآثر الامرا کی پوری عبارت کا اردو ترجمہ دیا جاتا ہے:

مخدوم الملک عبداللہ انصاری، شیخ شمس الدین سلطان پوری کا لڑکا ہے۔ اس کے بزرگوں نے ملتان سے سلطان پور آکر سکونت اختیار کی۔ مُلا عبداللہ نے مولانا عبدالقادر سرہندی سے تحصیلِ علوم کی اور شرعی علوم میں ماہر کامل ہوئے۔ اس کی فضیلت کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی۔ شرح مُلا جامی پر حاشیہ لکھا اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں منہاج الدین تصنیف کی۔ سلاطینِ وقت اس کا بے حد

---

[۱۴۹] منتخب التواریخ ص ۲۰۲، ۳۰۳ — مآثر الامرا، ج ۳، ص ۳۱۵ تا ۳۱۹ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۳ — نزہتہ الخواطر، ج ۴ ص ۲۰۶ تا ۲۰۸ — رودِ کوثر، ص ۹۴ تا ۱۰۷ — حدائق الحنفیہ ص ۳۹۷۔

احترام کرتے تھے۔ ہمایوں بادشاہ اس کی طرف بہت ہی عنانِ توجہ مبذول رکھتا تھا۔

جب شیر شاہ سوری بادشاہ ہوا تو اس نے اس کو صدر الاسلام کا خطاب دیا۔ کہتے ہیں، ایک دن اپنے دورِ حکومت میں سلیم شاہ سوری نے مُلا عبد اللہ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا تھا، بابر بادشاہ کے پانچ بیٹے تھے، چار چلے گئے، ایک باقی رہ گیا ہے۔ سرمست خاں نے کہا، ایسے فتنہ پرداز کو زندہ کیوں چھوڑ رکھا ہے؟ جواب دیا، اس سے بہتر آدمی نہیں ملتا۔ جب مُلا قریب آیا تو سلیم شاہ نے اسے تخت پر بٹھایا۔ مروارید کی تسبیح اس کو پیش کی، جس کی قیمت بیس ہزار روپے تھی۔

مُلا عبد اللہ نہایت متعصب شخص تھا، اس تعصب کو وہ دین داری سے تعبیر کرتا تھا اور اس کے پردے میں مخالفوں کے خلاف اپنے غیظ و غضب کے اظہار کا اس کو خوب موقع ملتا تھا۔ شیخ علائی کا قتل بھی اس کے اسی تعصب اور مخالفت کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔

شیخ علائی، شیخ حسن کے لائق فرزند تھے، جن کا شمار بنگال کے کبار مشائخ میں ہوتا تھا۔ انھوں نے علوم ظاہری و باطنی اپنے والد بزرگ وار سے حاصل کیے تھے۔ بیت اللہ سے واپس آنے کے بعد بیانہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ان کا اصل مشغلہ تھا۔ اس زمانے میں ایک اور بزرگ شیخ عبد اللہ نیازی نے بھی بیانہ میں آ کر اقامت اختیار کر لی تھی۔ شیخ عبد اللہ نیازی، شیخ سلیم چشتی کے خلفا میں سے تھے اور سفر حجاز سے واپس آنے کے بعد میر سید محمد جون پوری سے وابستہ ہو گئے تھے، جو اپنے آپ کو مہدی کہتے تھے۔ شیخ علائی کو عبد اللہ کا اسلوبِ حیات پسند آیا۔ وہ متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اس ضمن میں یہاں تک آگے بڑھ گئے تھے کہ شب کو صبح کے لیے کوئی چیز گھر میں باقی نہ رہنے دیتے، سب کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے۔ پانی کے مٹکے بھی خالی کر دیتے کہ کل، اللہ تعالیٰ کوئی اور ذریعہ پیدا فرما دے گا۔

مُلا عبد اللہ سلطان پوری نے شیخ علائی پر بدعت و خروج کا الزام عائد کیا، اور

سلیم شاہ سوری کو جو اس وقت ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ اس بات پہ آمادہ کیا، کہ شیخ علائی کو بیانہ سے طلب کیا جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے خیالات کے بارے میں علما سے مذاکرہ کرے۔ چنانچہ مباحثہ و مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا اور اس میں شیخ علائی غالب آئے اور حاضرینِ مجلس ان سے بہت متاثر ہوئے۔ خود سلطان سلیم شاہ شیخ علائی کی گفتگو اور اندازِ کلام سے اثر پذیر ہوا، اور آہستہ سے شیخ کے کان میں کہا، آپ مہدویت کا انکار کر دیں، میں آپ کو اپنی حکومت کا محتسب مقرر کر لوں گا۔ اگر ایسا نہیں کرتے تو یہاں سے جتنی جلدی ممکن ہو سکے نکل جائیں، علما نے آپ کے قتل کا فتویٰ دے دیا ہے، چنانچہ شیخ دکن کے علاقہ میں چلے گئے۔

کچھ عرصہ بعد سلطان سلیم شاہ نیازیوں کی شورش ختم کرنے کی غرض سے پنجاب کی طرف متوجہ ہوا۔ اب ملا عبداللہ کو موقع ملا، اس نے سلطان سے کہا شیخ عبداللہ نیازی، نیازی قبائل کا پیر ہے اور یہ تمام لوگ اس کے معتقد ہیں۔ بادشاہ نے ۹۵۵ھ میں شیخ عبداللہ نیازی کو دربار میں بلایا اور ان پہ اتنے کوڑے، ڈنڈے اور لاتیں پڑیں کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔

منقول ہے کہ جب تک انھیں ہوش رہا، وہ ربنا اغفر لنا ذنوبنا پڑھتے رہے۔ کچھ افاقہ ہوا تو سیاحت پر روانہ ہو گئے اور مہدویت سے توبہ کر لی۔ ۹۹۳ھ میں جلال الدین اکبر سے ملے، جب کہ وہ بنارس اور اٹک کے نواح میں تھا، اس نے تھوڑی سی زمین مدد معاش کے لیے دی۔ شیخ عبداللہ نیازی نے نوّے سال کی عمر میں ... اھ کو وفات پائی۔

سلیم شاہ سوری نیازیوں کی مہم سے واپس آیا تو عبداللہ انصاری نے پھر شیخ علائی کے خلاف اس کے کان بھرنے شروع کر دیے اور اس نے ان کو دربار میں طلب کیا۔ سلیم شاہ اب بھی ذاتی طور پہ انھیں کوئی سزا دینے کے حق میں نہ تھا، اس نے ان سے پہلی ملاقات والی بات دہرائی اور مہدویت سے علیحدگی اختیار کرنے کی تلقین کی اور اپنی سلطنت کا محتسب مقرر ہونے کو کہا، مگر شیخ

نے کوئی توجہ نہ فرمائی۔ ادھر ملا عبداللہ نے ان کو سخت سزا دینے پر اصرار کیا۔ سلیم شاہ نے مُلّا سے کہا، تم جانو اور شیخ علائی جانے، ہمیں اس معاملے میں دخل نہیں دینا چاہتا۔ مُلّا نے حکم دیا، شیخ کے کوڑے لگائے جائیں۔ شیخ علائی پہلے ہی سے بیمار اور جسمانی طور پر کمزور تھے۔ تیسرے کوڑے میں ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اسی پر بس نہیں کیا، ان کی لاش کو ہاتھی کے پیر سے باندھ کر گھسیٹا گیا۔ کہتے ہیں اس روز اتنی سخت آندھی چلی کہ لوگوں کو قیامت کی آمد کا گمان ہونے لگا۔ شیخ علائی کی لاش پر اس قدر پھول پڑے کہ معلوم ہوتا تھا ان سے قبر تیار ہوگئی ہے۔ اس واقعہ کے بعد سلیم شاہ کی حکومت بھی دو سال سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی اور ختم ہوگئی۔

جب ہمایوں نے ہندوستان پر دوبارہ قبضہ کیا تو اس نے مُلّا عبداللہ کو شیخ الاسلام کا خطاب دیا۔ ہمایوں کے بعد اس کا بیٹا جلال الدین اکبر سریر آرائے سلطنتِ ہند ہوا تو مُلّا عبداللہ کو مخدوم الملک کا خطاب ملا۔ بیرام خاں نے ایک لاکھ روپے کی آمدنی کا پرگنہ تانک والا اس کو دے کر اس کا مرتبہ تمام امرا و اکابر سے بڑھا دیا اور اس کو سلطنتِ ہند کا بڑا رکن بنا دیا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد بعض واقعات کی بنا پر اکبر کا مزاج، علما کے بارے میں بدل گیا تو جلوسِ اکبری کے چوبیسویں سال ۹۸۷ھ میں مخدوم الملک ملا عبداللہ اور شیخ عبدالنبی صدر الصدور کو ایک دوسرے کی رفاقت میں حجاز روانہ کر دیا۔ یہ اس لیے کہ یہ دونوں ایک مدت سے آپس میں متصادم و مخالف چلے آ رہے تھے۔ اور ان کا یہ باہمی تخالف و تصادم اس درجہ شدید تھا کہ ملک بدر ہو جانے کے باوجود بھی ان دونوں میں نہ راستے میں اتحاد و اتفاق ہو سکا اور نہ مقاماتِ مقدسہ میں پہنچ کر رفعِ کدورت کی کوئی صورت پیدا ہو سکی۔

مخدوم الملک مُلّا عبداللہ چوں کہ افغانوں (یعنی شیر شاہی حکومت) کے زمانے سے لے کر اکبری دور تک تمام حکمرانوں کے نزدیک معزز و محترم رہا تھا، احتیاط،

تدبّر، حُسنِ تدبیر، رائے، تجربے اور مال داری سے متصف تھا، اور اس کی دانشمندی کی شہرت ہر جگہ پہنچ گئی تھی، اس لیے مفتیِ مکّہ شیخ ابنِ حجر مکّی اس کے استقبال کے لیے آئے اور اس کا بہت ہی احترام کیا، یہاں تک کہ غیر موسمِ حج میں بھی اس کے لیے کعبۃ اللہ کا دروازہ کھولا گیا۔

اسی اثنا میں اکبر کے بھائی مرزا محمد حکیم نے اکبر کی مخالفت شروع کر دی۔ جب یہ بات مخدوم الملک مُلا عبداللہ کے علم میں آئی تو اگرچہ ہندوستان میں کوئی اختلال و اضمحلال واقع نہیں ہوا تھا اور نہ کوئی غیر معمولی حادثہ رونما ہوا تھا، مگر مخدوم الملک نے یقین کر لیا کہ ملک میں تغیر کی لہر آئے گی اور وہ طمعِ امارت اور حبِّ جاہ کی بنا پر ہندوستان واپس آگیا اور صدرالصدور شیخ عبدالنبی کی معیت میں احمد آباد (گجرات) پہنچا۔ اب دونوں نے اندر ہی اندر بادشاہ کی مخالفت شروع کر دی۔

جب یہ بات جلال الدین اکبر کے علم میں آئی کہ دونوں اپنے مخصوص مفادات کی بنا پر مختلف محفلوں اور مجلسوں میں اس کے متعلق ناشائستہ باتیں کرتے ہیں تو اس نے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے خفیہ طور پر کچھ لوگوں کو ان پر متعین کر دیا۔ خفیہ طور پر اس لیے کہ حرم کی بیگمات بادشاہ سے ان کی سفارش اور صفائی پیش کرتی تھیں۔ ۹۹۱ھ میں بادشاہ کے خوف کی وجہ سے مخدوم الملک عبداللہ وفات پا گیا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ بادشاہ کے اشارے سے اس کو زہر دے دیا گیا تھا۔ لوگوں نے خفیہ طور پر اس کو جالندھر میں لا کر دفن کیا۔

مخدوم الملک کی وفات کے بعد قاضی علی، اس کے اموال کی تلاشی اور ضبطی پر مقرر ہوا۔ لاہور میں بہت سے خزینے اور دفینے برآمد ہوئے۔ ان میں سے سونے کی اینٹوں کے کئی صندوق اس کے آبائی قبرستان کے حصّے سے نکلے۔ ان قبروں کو اس انداز سے بنایا گیا تھا کہ ان میں مُردے دفن کیے گئے ہیں۔ تحقیق اموال کی وجہ سے اس کے لڑکے بھی مبتلائے مصیبت میں رہے۔ اس کے گھر سے تین کروڑ روپیہ برآمد ہوا۔[۴۵]

---

[۴۵] مآثر الامرا، ج ۳ ص ۲۵۲ تا ۲۵۷

شیخ عبداللہ نیازی پہ بے پناہ تشدّد

اس دور کی تاریخ کی کتابوں کے مطالعہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ملّا عبداللہ سلطان پوری کا دل احترامِ انسانیت سے بالکل خالی ہوگیا تھا۔ وہ بے شک عالم دین تھا مگر نہایت حاسد، کینہ پرور اور علما کا دشمن تھا۔ اس نے بہت سے لوگوں کو قتل کرایا، جن میں شیخ عبداللہ نیازی بھی شامل ہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ سلیم شاہ سوری اور نیازی پٹھانوں کی باہمی مخالفت کے زمانے میں سلیم شاہ ان سے جنگ کے لیے آگرہ سے پنجاب کی طرف روانہ ہوا تو مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری بھی اس کے ساتھ تھا۔ جب لشکرِ شاہی بیانہ کے قریب پہنچا تو حالات کو اپنی تائید میں پاکر سلیم شاہ سے کہا۔ شیخ علائی کا فتنہ تو معمولی نوعیت کا تھا جس سے نجات مل گئی۔ سب سے بڑا فتنہ تو شیخ عبداللہ نیازی کا ہے، جو شیخ علائی کا مرشد اور نیازیوں کا پیر ہے، اور ہمیشہ تین چار سو مسلح افراد کو اپنے ساتھ رکھتا ہے، جن سے بیانہ کے پہاڑی علاقے میں فتنہ و فساد کراتا رہتا ہے۔ سلیم شاہ جو پہلے سے نیازیوں کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ غصے سے آگ بگولا ہوگیا۔ اسی وقت حاکمِ بیانہ میاں بھوہ کے نام فرمان بھیجا کہ شیخ نیازی کو فوراً حاضر کیا جائے۔ میاں بھوہ، شیخ عبداللہ نیازی کا بہت عقیدت مند تھا، اس نے خفیہ طور پر شیخ سے درخواست کی کہ آپ کی زندگی خطرے میں ہے اور مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ چند روز کے لیے یہاں سے کسی طرف چلے جائیں، میں بادشاہ کو آپ کے نہ ملنے کے بارے میں کوئی معقول وجہ لکھ کر بھیج دوں گا۔ اتنے میں بادشاہ کے دل سے آپ کا خیال نکل جائے گا۔ لیکن شیخ عبداللہ نیازی نے حاکمِ بیانہ کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہا۔ بادشاہ کے دل سے میرے متعلق کوئی بات نہیں نکلے گی۔ مخدوم الملک میرے درپے آزار ہے اور وہ ہمیشہ میری تاک میں رہتا ہے۔ میں اگر کسی دُور دراز مقام میں چلا بھی جاؤں گا، بادشاہ پھر مجھے وہاں سے طلب کرے گا اور اس صورت میں مجھے طویل سفر کی زحمت اٹھا کر اس کے پاس جانا پڑے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ میں ابھی اس سے مل لوں، جب کہ وہ صرف دس کوس کے فاصلے پر مقیم ہے۔ خدا کا جو فیصلہ ہے، وہ بہرحال پورا ہو کر رہے گا۔

غرض حاکمِ بیانہ میاں بھوہ کے روکنے کے باوجود شیخ عبداللہ نیازی، بیانہ سے چل کر راتوں رات شاہی لشکر میں پہنچ گئے اور صبح کے وقت جب کہ سلیم شاہ کوچ کی تیاری کر رہا تھا اور گھوڑے پر سوار ہونے کو تھا، اس کے سامنے آئے اور کہا "اسلام علیکم"۔ میاں بھوہ بھی موجود تھا۔ اس نے زبردستی سے ان کی گردن سلیم شاہ کے حضور یہ کہتے ہوئے جھکا دی "اے شیخ! بادشاہوں کو اس طرح سلام کرتے ہیں"۔ شیخ نے بھوہ کو غصّے کی نظروں سے دیکھا اور کہا "جو سلام سنت ہے، اور جو رسول اللہ اپنے صحابہ کو اور صحابہ، رسول اللہ کو کرتے تھے، وہ وہی ہے، جو میں نے کیا، اور اس کا طریقہ بھی وہی ہے، اس کے سوا میں اور کسی سلام کو نہیں جانتا"

شیخ نیازی کو دیکھ کر اور ان کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سلیم شاہ نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔

"علائی کا پیر یہی ہے"۔؟ ملا عبداللہ سلطان پوری نے، جو گھات میں لگا ہوا تھا، اور اسی وقت کا منتظر تھا، جھٹ سے کہا "ہاں یہی ہے"۔

بادشاہ نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور انھوں نے ان کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ شیخ کو جب تک ہوش رہا وہ آیت پڑھتے رہے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ (آل عمران: آیت ۱۴۷)

(اے ہمارے پروردگار، ہمارے گناہ اور زیادتیاں جو ہم اپنے کاموں میں کرتے رہے ہیں، معاف فرما اور ہم کو ثابت قدم رکھ، اور کافروں پر فتح عنایت فرما)

سلیم شاہ نے پوچھا "یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

مُلّا عبداللہ نے جواب دیا "مجھ کو اور آپ کو کافر کہہ رہا ہے"۔

سلیم شاہ کا پارا اور چڑھ گیا اور ان کو اور زیادہ اذیت پہنچائی۔ غرض بادشاہ ایک گھنٹے سے زیادہ عرصہ وہاں گھوڑے پر سوار کھڑا رہا، اور اس مظلوم کو جرم بے گناہی میں سزا دیتا رہا۔ جب یہ یقین ہو گیا کہ ان کا دم نکل گیا ہے تو آگے بڑھ گیا۔

مگر شیخ میں ابھی زندگی کے آثار باقی تھے۔ سلیم کے کوچ کے فوراً بعد لوگوں نے ان کو چمڑے میں لپیٹ کر برابر ایک دن اور ایک رات آگ کی گرمی میں رکھا تب ان کو کچھ ہوش آیا۔ یہ حادثہ ۹۵۵ھ میں پیش آیا تھا۔ شیخ عبداللہ نیازی نے آخری عمر میں عقیدہ مہدویت سے توبہ کر لی تھی۔ انھوں نے نوّے سال کی عمر پاکر ۱۰۰۰ھ کو جلال الدین اکبر کے عہد میں وفات پائی[۶۶]

عمل و کردار کا ایک اور نمونہ

تذکرہ نویسوں نے مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کی زندگی کے مختلف واقعات بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں اور اس کے عمل و کردار کے تمام گوشوں کی وضاحت کی ہے۔ منقول ہے کہ اس نے فتویٰ دیا تھا کہ اس دور میں حج کی فرضیت ساقط ہو چکی ہے، بلکہ حج پر جانا معصیت کی ذیل میں آتا ہے۔ جب لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے یہ دلیل دی کہ حج کے لیے اگر خشکی کے راستے جائیں تو یہ گجرات اور عراق کا راستہ ہے، جو شیعوں اور قزلباشوں کی لوٹ مار کی وجہ سے پُرخطر ہے اور اگر سمندر کے راستے جائیں تو فرنگیوں سے پروانہ راہ داری لینے کی ذلت برداشت کرنا پڑتی ہے، جس پر حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی تصویریں چھپی ہوتی ہیں اور یہ بت پرستی کی ایک شکل ہے۔ اس لیے شرعی اعتبار سے یہ دونوں راستے حج کے لیے بند ہو گئے ہیں[۶۷]

یہ بھی منقول ہے کہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے بھی وہ یہ حیلہ کرتا تھا کہ سال کے اختتام پر سارا مال بیوی کے نام منتقل کر دیتا اور دوسرے سال کے اختتام پر یہی مال اپنے نام پر واپس لے لیتا[۶۸]

بدایونی لکھتے ہیں: غرض اس کی کنجوسی و بخالت اور رذالت و خباثت کے بہت

---

[۶۶] منتخب التواریخ ص ۱۰۸، ۱۰۹ [۶۷] ایضاً ص ۲۲۱
[۶۸] ایضاً

سے قصے مشہور ہیں۔ اس نے علما و مشائخ اور بالخصوص پنجاب کے مستحق لوگوں پر بہت زیادتیاں کی تھیں۔ یہ بڑا مال دار شخص تھا، مگر جب بادشاہ جلال الدین اکبر نے اس سے سوال کیا "تم پر حج فرض ہے؟" تو اس نے جواب دیا۔ "نہیں"[۴۹]

بلاشبہ اس نے لوگوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ بہت سے علما و امرا کو قتل کرایا، کسی کو مہدویت کے الزام میں موت کے گھاٹ اتارا، کسی کو رفض و تشیعیت کی طرف منسوب کر کے ختم کر ڈالا، اور کسی کو بادشاہ کا باغی اور مخالف ظاہر کر کے ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ اس کی زندگی کے واقعات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رحم دلی اور انسانی ہمدردی سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

دیگر تذکرہ نگاروں کے علاوہ بدایونی نے منتخب التواریخ میں اس کے اس قسم کے کردار کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔

شیخ داؤد جہنی وال کو بھی جو ضلع لاہور میں قیام پذیر تھے، مخدوم الملک مُلا عبداللہ نے پریشان کیا۔ سلیم شاہ سوری سے ان کی شکایت کی کہ ان کے مرید "یا داؤد" "یا داؤد" کا ورد کرتے ہیں۔ سلیم شاہ نے ان کو اپنے دارالخلافہ گوالیار میں طلب کیا۔ یہ وہاں پہنچے، تو سلیم شاہ نے گوالیار سے باہر نکل کر نہایت عزت و احترام کے ساتھ ان سے ملاقات کی، اور وہ ان کے زہد و اتقا سے بہت متاثر ہوا۔ مخدوم الملک بھی بادشاہ کے ساتھ تھے۔ بادشاہ اور مخدوم الملک کچھ دیر ان سے گفتگو کرتے رہے۔ بدایونی نے اس کا ذکر کیا ہے، مگر یہ نہیں بتایا کہ وجہِ مخالفت اور سببِ طلبی کیا تھا۔ بدایونی لکھتا ہے:

بعد از حرف و حکایت پرسیدہ اند کہ تقریبِ طلبِ فقرا منقطع چہ بود؟ مخدوم الملک گفتہ کہ مریدانِ شما را شنیدم کہ در وقت ذکر گفتن یا داؤد یا داؤد می گویند۔ جواب دادہ اند مگر اشتباہ در استماع رفتہ باشد۔ والّا ایں جماعت ظاہراً یا ودود،

۴۹؎ منتخب التواریخ ص ۲۲۱

یا ودود می گفتہ باشند۔

یعنی گفت وشنید کے بعد شیخ نے دریافت کیا کہ ہم فقرا کو یہاں طلب کرنے کا آخر کیا مقصد ہے؟ مخدوم الملک نے کہا، ہم نے سنا ہے، ورد کرتے وقت آپ کے مرید یا داؤد یا داؤد کہتے ہیں۔ شیخ نے جواب دیا، سننے والے کو اشتباہ ہوا ہے۔ میرے مرید تو یا ودود یا ودود کہتے ہیں۔

بعدازاں سلیم شاہ نے شیخ کو نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ رخصت کیا۔ سلیم شاہ کے علاوہ مخدوم الملک نے بھی ان کی تکریم کی اور ان کے مواعظ ونصائح سے متاثر ہوا۔ ان کی باتیں سن کر مخدوم الملک نے بادشاہ سے کہا:

ازیں روئے دروغ نیاید۔

جو جی چاہے پوچھو، یہ دروغ گوئی سے کام نہیں لیں گے۔

علمائے دنیا اور فقہائے سوء

مولانا ابوالکلام آزاد نے "تذکرہ" میں مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور صدرالصدور شیخ عبدالنبی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ان کی زندگی کے ظالمانہ اور متعصبانہ گوشوں کی بڑی وضاحت کی ہے۔ وہ انھیں "علمائے دنیا اور فقہائے سوء" قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ علمائے حق اور مشائخ کرام پر ان کے ظلم وزیادتی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک ایسے گروہ کو بھلا علمائے دنیا اور فقہائے سوء کب چین سے بیٹھنے دے سکتے تھے؟ چوروں اور قاتلوں کو ان لوگوں سے امن مل سکتا ہے، مگر مصلحین امت اور عشاق حق کے لیے امن وانصاف کہاں؟[۵]

سلیم شاہ اور نیازی افغانوں کے درمیان باہمی چپقلش چلی آرہی تھی۔ مخدوم الملک نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اسے سیاسیات کا رنگ دیا۔ چنانچہ اس نے شیخ علائی

۵۔ تذکرہ ص ۷۸

اور عبداللہ نیازی کے خلاف سلیم شاہ کے کان بھرے اور انھیں بادشاہ اور اس کی حکومت کے مخالف قرار دیا۔ مولانا آزاد رقم طراز ہیں :

لیکن چوں کہ پولٹیکل خطرہ کے بغیر سلیم شاہ برانگیختہ نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے مخدوم الملک وغیرہ نے اسی سنت قدیمہ علمائے سوء کو اختیار کیا، اور سلیم شاہ کہ ایک سادہ لوح افغان تھا، فوراً آمادۂ مخالفت ہو گیا۔[۵۱]

صدر الصدور ملا عبدالنبی اور مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری دونو دنیادار، حبِ جاہ میں مبتلا اور ایک دوسرے کے شدید مخالف تھے۔ مولانا آزاد کے الفاظ ملاحظہ ہوں :

بدایونی لکھتے ہیں کہ اگرچہ ملا عبدالنبی صدر اور مخدوم الملک دونوں ایک ہی تنور کے سوختہ تھے اور صلحائے امت و اہل اللہ کی اذیت و مخالفت میں ہم رنگ و ہم آہنگ ۔ لیکن چوں کہ دنیا کے عشق نے دونوں میں رقابت کا رشتہ قائم کر دیا تھا، اس لیے خود بھی ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے، اور آپس کی ٹکریں برابر چلتی رہتیں، نتیجہ یہ نکلا کہ ان آپس کی ٹکروں ہی سے دونوں پاش پاش ہو گئے۔ کسی دوسرے ہاتھ کی ضرورت ہی نہ رہی۔ یخربون بیوتھم بایدیھم کا منظر نظروں میں پھر گیا۔[۵۲]

اس سے آگے مولانا فرماتے ہیں :

بدایونی لکھتے ہیں کہ مخدوم الملک نے جب ملا عبدالنبی کو برسرِ عروج و صدارت دیکھا تو ان کے رد میں ایک پوری کتاب لکھ ماری اور ثابت کیا کہ ان کے پیچھے نماز بھی درست نہیں، "تا بہ صدارت و شیخ الاسلامی چہ رسد؟ باپ نے عاق کر دیا ہے، اور مزید برآں یہ کہ بواسیر خونی کا عارضہ ہے ۔ خیر پہلی دلیل تو جیسی کچھ ہے ظاہر ہے۔ لیکن دوسری دلیل بڑی ہی پر لطف اور دلچسپ رہی۔ یارانِ ظرافت پیشہ

---

۵۱ تذکرہ ص ۷۹ ۵۲ ایضاً ۱۲۴

اس کو لے اڑے اور خوب خوب ستم ظریفیاں کی گئیں۔ اسی طرح یہ دونوں ایک دوسرے پر حملے کرتے رہتے، اور اسی میں دونوں کی چوریاں کھلتیں اور پردے فاش ہوتے گئے۔[۵۳]

مولانا ابوالکلام آزاد نے ان دونوں کے اس قسم کے کردار کو بہت وضاحت سے بیان کیا ہے اور اس پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ پھر منتخب التواریخ وغیرہ کے حوالے سے ان کے انجام کی تفصیل بیان کی ہے۔ ایک جگہ مخدوم الملک مُلا عبداللہ سلطان پوری کے اہلِ علم پر مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لیکن سبحان اللہ! مکافات و مجازاتِ عمل کا قانونِ الٰہی کس طرح اس دنیا ہی میں اپنا کام انجام دے رہا ہے اور آخرت کی منزل ابھی باقی ہے۔ لو کانوا یعلمون۔ بالآخر ایک زمانہ آیا کہ یہی مخدوم الملک تھے اور یہی ہندوستان۔ مگر پیشوائی و شیخ الاسلامی ایک طرف رہی، عزت و آبرو سے اپنا بڑھاپا بھی بسر نہ کر سکے اور نہ عہدِ اکبری کے نئے نئے مفتیوں کے ہاتھوں وہ ذلتیں اور خواریاں نصیب ہوئیں کہ بقول مُلائے بدایونی: یوم تبلی السرائر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ یا تو یہ حال کہ ان کے قلمِ شیخ الاسلامی کی ایک گردش اہل اللہ کی زندگیوں کا فیصلہ کر دیتی تھی، یا یہ یوم العذاب دیکھنا پڑا کہ حاجی ابراہیم سرہندی اور شیخ ابوالفضل جیسے نوخیز احداث بھری مجلس میں ان کے فسق و تقویٰ کا فیصلہ کرنے لگے اور عمر بھر کی بداعمالیوں کا ایک ایک کر کے حساب دینا پڑا۔[۵۴]

مخدوم الملک ملا عبداللہ اور صدر الصدور عبدالنبی کے حالات تمام مورخین نے بیان کیے ہیں۔ شیخ محمد اکرام مرحوم نے بھی ان کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے اور ان کی زندگی کے متنازعہ فیہ پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔[۵۵] اکرام صاحب مرحوم

---

۵۳ تذکرہ ص ۱۲۵ ۵۴ ایضاً ص ۹۷، ۹۸

۵۵ ملاحظہ ہو رودِ کوثر، ص ۹۴ تا ۱۰۷۔

نے بڑی تحقیق سے ان کے بارے میں اظہارِ رائے کیا ہے - ایک جگہ لکھتے ہیں :

"بدایونی نے عہدِ اکبری کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے کہ اکبر نے علما کا اقتدار ان کی کج بحثیوں اور حماقتوں کی وجہ سے کم کیا - مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تذکرہ میں خرابیوں کا باعث مخدوم الملک اور صدر الصدور کی شخصی کوتاہیوں کو قرار دیا ہے، اور اس سلسلے میں حضرت مجدّد الف ثانی کی رائے نقل کی ہے : "ہر فتورے کہ دریں زمان در ترویجِ ملّت و دین ظاہر گشتہ، از شومیٔ علمائے سوٗ است کہ فی الحقیقت شرارِ مردم و لصوصِ دین اند"- اور ان دو بزرگوں کو اس بیان کا مصداق قرار دیا ہے، اور اب یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ "علمائے سوء" سے مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی مراد ہیں - حضرت مجدّد الف ثانی نے اس کی وضاحت نہیں کی، لیکن اس معاملے میں مولانا محمد ناظم ندوی کی رائے ہمیں زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے جنھوں نے تعلیماتِ مجدّدیہ کے پیش لفظ میں "علمائے سوء" سے "مبارک ناگوری کے دو نوں ذہین و طباع بیٹے ابو الفضل اور فیضی اور تاج الدین دہلوی (کذا)" مراد لیے ہیں - شاید ان کے علاوہ قاضی خان بدخشی کی طرف بھی اشارہ ہو، جنھوں نے بادشاہ کے لیے سجدۂ تحیت جائز قرار دیا -"

اس سے آگے وہ بدایونی کی رائے سے اختلاف کا تاثر دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

بدایونی کے علاوہ عہدِ مغلیہ میں علما کے جتنے تذکرے لکھے گئے اور جن کا ماخذ منتخب التواریخ نہیں، ان میں بالعموم شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کی تعریف کی گئی ہے - مثلاً حضرت مجدّد کے شاگرد اور خلیفہ (اور ان کی مشہور سوانح عمری حضرات القدس کے مصنف) جنھیں سترہ سال مرشد کی خدمت میں رہنا نصیب ہوا، سنوات الاتقیا (قلمی) میں شیخ عبدالنبی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"شیخ عبدالنبی ابن شیخ احمد حنفی رضی اللہ عنہ عالم و محدث بود ... التسرع بر کمال داشت، و در اتباعِ سنت و رفع بدعت، رسوخِ تمام نصیبِ وقت او شدہ بود -

ودر امرِ معروف و نہیِ منکر بر سلاطین و امرا شدت کردے ... صاحبِ تصانیف شریفہ است۔ در سنہ نہصد و نود و یک در عہدِ عرش آشیانی شہادت یافت۔ ع
صاحبِ فیض گفت سالش عقل۔"

اس سے آگے رقم طراز ہیں:

اخبار الاصفیا (قلمی) میں جو ابو الفضل کے بھانجے عبد الصمد نے اسی زمانے میں لکھی، اسی طرح کا اظہارِ خیال کیا گیا ہے:

"شیخ عبد النبی بن شیخ احمد بن شیخ عبد القدوس چشتی گنگوہی، عنوان صحیفۂ دین و دانش و فہرستِ جریدۂ علم و عمل بود۔ در عنفوان برنائی ... بحرمین شریفین شتافت و حدیث دراں خیر البقاع نزد شیخ ابن حجر ... استماع نمودہ بوطن گاہ خرامید۔ و (کمر) در رواجِ ارکانِ شریعتِ غرا بربستہ ... آرام گاہ فتح پوری۔ کتاب سنن الہدایہ ازو یادگار است۔"

اس سے آگے مرقوم ہے:

"دوسرے معاصرانہ تذکروں میں بھی (مثلاً مرآۃ العالم میں)۔ (سوائے ان کے جنھوں نے طبقاتِ شاہ جہانی کی طرح بدایونی پر انحصار کیا ہے) شیخ عبد النبی بلکہ مخدوم الملک کا ذکر بھی تعریف کے ساتھ کیا گیا ہے، بالخصوص حضرت مجدد کے شاگرد اور سوانح نگار خواجہ بدر الدین سرہندی کی شیخ عبد النبی کی تعریف کے بعد یہ قیاس کہ حضرت مجدد نے انھیں "علمائے سوء" میں شمار کیا ہوگا، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔"

اس سے آگے اکرام صاحب مرحوم مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی کی صفائی پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"مخدوم الملک کی شخصی کوتاہیوں میں کلام نہیں، عبادت خانہ کے مباحثوں میں بھی علما نے بالعموم بڑی ناعاقبت اندیشی سے کام لیا جس سے اکبر کے دل میں طبقہ علما کے لیے کوئی احترام باقی نہ رہا۔ لیکن اکبر کی علما سے اختلاف کی وجہ فقط ان کی کوتاہیاں اور قابلِ اعتراض باتیں نہ تھیں۔ بلکہ ان کی خوبیاں اور ترویجِ شرع کی

کوششیں بھی وجہِ مخاصمت ہوگئیں۔ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کے ضمن میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ شیخ عبدالنبی پر کوئی جائز اور وزنی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ ان کی ذاتی دیانت داری پر کسی نے شبہ ظاہر نہیں کیا۔ بے شک وہ احکامِ شرعیہ کی پابندی میں سخت تھے، لیکن مذہبی نقطہ نظر سے تو یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں، اور جس واقعہ (متھرا کے برہمن کو سزائے قتل) پر اکبر سے ان کا اختلاف ہوا، اس میں نوّے فی صد علما بلکہ اس سے زیادہ شیخ عبدالنبی کے ہم خیال ہوں گے۔

"مخدوم الملک میں شخصی کمزوریاں زیادہ تھیں، لیکن ان کی جس چیز کی شکایت کی جاتی ہے۔ یعنی شدتِ احتساب۔ وہ بھی شرعی نقطہ نظر سے خوبی ہے، برائی نہیں۔ انھوں نے (بقول بدایونی) شیخ ابوالفضل کی نسبت جو یہ کہا تھا کہ پتا نہیں، اس شخص سے دین میں کیا کیا فتنے برپا ہوں گے، اسے بھی واقعات نے درست ثابت کیا، اور شیخ مبارک کی راسخ الاعتقادی کی نسبت انھیں جو شبہے تھے، وہ بھی بے جا نہ تھے۔ شیعوں کے متعلق ان کا جو نقطۂ نظر تھا، وہی حضرت مجدّد الف ثانی کا تھا۔"

"واقعہ یہ ہے کہ مہدویت کی مقبولیت، شیعیت کی اشاعت، شطّاری اور دوسرے آزاد صوفیانہ طریقوں کی ترویج سے ملک میں جو روحانی انتشار رونما تھا، اس کے سدِّباب میں مخدوم الملک کی محتسبانہ کوششیں، شیخ مبارک کی علمیّت و آزاد خیالی، اور شیخ علائی کی نیک نفسی اور خلوص سے زیادہ مفید تھیں[۵۶]"

شیخ عبدالحق محدّث دہلوی نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے حالات کے ضمن میں اخبار الاخیار میں، مولانا عبداللہ سلطان پوری کا ذکر کیا ہے[۵۷]

حقیقت یہ ہے کہ مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور صدر الصدور شیخ

---

[۵۶] رودِ کوثر، ص ۹۶ تا ۹۸

[۵۷] اخبار الاخیار، ص ۲۲۲

عبدالنبی عہدِ اکبری کی دو معروف علمی شخصیتیں ہیں۔ ان کے بارے میں بہت سی باتیں تذکروں میں مرقوم ہیں۔ شیخ عبدالنبی کے حالات اگرچہ اس کتاب میں دوسری جگہ بھی لکھے گئے ہیں مگر چوں کہ مخدوم الملک کے ضمن میں بھی ان کا تذکرہ لازماً آتا ہے، لہٰذا یہاں بھی ان کے متعلق بعض چیزوں کا زبانِ قلم پر آجانا ناگزیر تھا۔

تصنیفات

مخدوم الملک جہاں بہت بڑے عالم تھے، وہاں مصنف بھی تھے اور تصنیف و تالیف کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ عفیفۃ الانبیاء، کشف الغمۃ عن بصائر الائمۃ اور منہاج الدین ان کی تصنیفات میں سے ہیں[۵۸]

۱۶۲۔ مولانا عبداللہ لاہوری

مولانا عبداللہ بن عبدالخالق شریف حسینی لاہوری، شیخ وقت، عالم باعمل اور صالح بزرگ تھے۔ ان کا شمار تفسیر، حدیث اور فقہ کے جیّد علما میں ہوتا تھا۔ جامع علومِ عقلیہ و نقلیہ تھے۔ تمام عمر لاہور میں درس و افادہ میں مصروف رہے۔ خلقِ کثیر کو مستفید کیا اور بہت سے علما ان کے حلقۂ درس سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ ۹۴۳ھ کو لاہور میں وفات پائی۔ حدائق الحنفیہ میں انھیں سید عبداللہ بھاکری لکھا گیا ہے۔ لیکن مدفن لاہور ہے اور سنِ وفات بھی یہی ہے[۵۹]

۱۶۳۔ مولانا عبداللہ ملتانی

مولانا عبداللہ مفتی ملتانی، اپنے عصر کے شیخ اور عالم کبیر تھے اور ان کا شمار علوم

---

[۵۸] ہدیۃ العارفین ج ۱ ص ۴۷۳۔ طبقات اکبری بھی دیکھیے ص ۳۹۰۔ نیز ملاحظہ ہو اذکار ابرار، ص ۴۹۵۔ درحالات مخدوم الملک

[۵۹] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۰۸، ۲۰۹۔ حدائق الحنفیہ ص ۳۷۳۔

عربیہ کے جلیل القدر علما میں ہوتا تھا۔ ملتان میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور اسی شہر کے مشہور اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ پھر ملتان سے بھکر منتقل ہو گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بھکر میں ان کا باقاعدہ سلسلۂ تدریس جاری تھا، جس سے بے شمار تشنگانِ علوم نے استفادہ کیا۔ فقہ، اصول، لغت اور علم نحو میں مہارت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں علومِ حکمیہ میں بھی کامل عبور حاصل تھا۔ دسویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کے اس عظیم عالم دین نے ۹۷۰ھ کو وفات پائی۔[۱۵۰]

۱۶۴۔ مولانا عبداللہ بدایونی

مولانا عبداللہ ہندی ساما نوی ثم بدایونی، شیخ صالح اور مشہور عالم دین تھے۔ مشرقی پنجاب کے ایک شہر سامانہ میں پیدا ہوئے۔ یہ دراصل ہندو تھے۔ ان کے والدین بھی ہندو دھرم کے حامل تھے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق والدین نے مسجد میں ایک مسلمان استاذ سے تعلیم دلانا شروع کی، جن سے انھوں نے حساب و ریاضی کی چند کتابیں پڑھیں۔ ایک روز سعدی شیرازی کی بوستان کا درس لے رہے تھے کہ یہ شعر پڑھا:

محال است سعدی کہ راہِ صفا — تواں رفت جز در پئے مصطفیٰ[۱]

استاذ سے عرض کیا۔ اس شعر کے معنی ہندی زبان میں سمجھائیے۔ استاذ نے کہا۔ تجھے اس سے کیا غرض ہے؟ کہا، جب تک آپ اس کا مطلب ذہن نشین نہیں کرائیں گے میں آگے سبق نہیں پڑھوں گا۔ استاذ نے معنی سمجھائے تو شاگرد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شخصیت اور تعلیمات کے بارے میں استفسار کیا۔ جب آنحضرتؐ کے مکارم و فضائل اور اخلاقِ حسنہ کی وضاحت کی گئی تو کلمہ طیبہ پڑھا اور جذب و بے خودی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کی اطلاع ماں باپ کو ہوئی تو دوڑے ہوئے

۱۵۰۔ مآثر رحیمی ج ۲ ص ۶۳۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۱۰۔ تاریخ معصومی ص ۳۲۸

آتے اور ڈرا دھمکا کر اسلام قبول کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ نہ مانے تو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب وہ ماں باپ سے قطع تعلق کر کے سامانہ سے نکل کھڑے ہوئے اور دہلی جا پہنچے۔ وہاں شیخ عبدالغفور بن نصیر الدین ملتانی دہلوی اور شیخ جلال الدین بدایونی وغیرہ علمائے کرام کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں جا شامل ہوئے اور علومِ عربیہ کی تعلیم مکمل کی۔ دہلی میں ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد بدایون کی راہ لی۔ وہاں شیخ عبدالباقی بدایونی سے اخذِ طریقت کیا۔ پھر خیرآباد گئے اور شیخ صفی الدین عبدالصمد سائنپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے بھی تصوف و طریقت کی تعلیم حاصل کی اور کچھ عرصہ ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔ وہاں سے پھر بدایوں آگئے اور اپنے آپ کو افادۂ عام اور عبادت کے لیے وقف کر دیا اور اصل وطن سامانہ کو خیرباد کہہ کر ہمیشہ کے لیے بدایوں ہی کو اپنا مسکن قرار دے لیا۔

علومِ مروجہ و متداولہ مثلاً فقہ و اصول اور نحو میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ صحیح معنوں میں جامعِ انواعِ خیر اور ماہرِ علومِ نقلیہ و عقلیہ تھے۔ اونچے درجے کے فقیہ اور معلّم تھے۔ مذاہب فقہیہ پر گہری نظر تھی۔ شریف النفس، صحیح الدین اور قوی الفہم تھے۔ زاہد و عابد، قانع و متقی اور قلیل الغذا تھے۔ بہت بوڑھے ہو گئے تھے، مگر پیدل چل کر بازار جاتے اور اپنی ضرورت کی چیزیں خود خرید کر لاتے۔ جہاں تک ہو سکتا، کسی سے اپنے ذاتی کام کے لیے نہ کہتے۔ اگرچہ مشائخ کی طرف سے انھیں لوگوں کو اپنے حلقۂ بیعت میں داخل کرنے کی اجازت حاصل تھی، لیکن اس سے گریز کرتے اور مشائخ کی ان رسوم پر عمل کرنے سے محترز رہتے، جو ان کے ساتھ مخصوص ہیں۔

مولانا عبداللہ بدایونی کے حالات ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں تحریر کیے ہیں۔ ملا عبدالقادر کو ان سے شرفِ تلمذ حاصل تھا، وہ اپنے اس عظیم استاذ کی بہت تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ مشکل اور دقیق مسائل نہایت آسانی سے حل کر دیتے تھے اور بعض ایسے مسائل علمیہ و نکاتِ غامضہ جو ہر عالم کے ذہن کی

گرفت میں نہیں آسکتے، ان کے تمام گوشوں کو وہ بلا کسی کتاب کی طرف رجوع کیے نہایت وضاحت سے بیان کر دینے پر قدرت رکھتے تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے ان سے علم کلام اور اصولِ فقہ کی بعض کتابیں پڑھیں۔

طبقاتِ اکبری میں بھی ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ مرقوم ہے:

شیخ عبداللہ بدایونی کہ در اصل ہندو بودہ است و در وقت خواندن گلستان چوں بنام پیغمبر رسیدہ از استاد پرسید کہ ایں چہ کس است؟ و استاد پارۂ بیان از مناقب آنحضرت نمودہ، و بہ شرفِ اسلام مشرف گشتہ۔ بعلم و فضل موصوف است و بورع و تقویٰ معروف۔

دسویں صدی ہجری کے برِصغیر کے اس عالم و فقیہ کی تاریخ وفات کا تو علم نہیں ہوسکا، البتہ اتنا پتا چلتا ہے کہ انھوں نے نوّے سال کی عمر پاکر داعی اجل کو لبیک کہا۔[۶۲]

۱۶۵۔ شیخ عبدالمعطی باکثیر مکّی ہندی

شیخ عبدالمعطی بن حسن بن عبداللہ باکثیر مکی ہندی احمد آبادی، شافعی المسلک تھے، شیخ و عالم اور اپنے عصر کے محدث کبیر تھے۔ عبدالقادر حضرمی نے النور السافر میں ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ موصوف ماہ رجب ۹۰۵ھ کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ علما و فضلا کی ایک بڑی جماعت سے ملے اور معقولات و منقولات کے بہت سے علوم میں مہارت حاصل کی۔ مکہ مکرمہ سے ہندوستان آئے اور پھر یہیں اقامت اختیار کرلی۔ برجستہ گوئی اور حاضر جوابی میں دسترس حاصل

---

[۶۲] منتخب التواریخ ص ۲۹۷ — طبقاتِ اکبری ص ۴۹۴ — خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۴۳۳، ۴۳۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۱۱، ۲۱۲ — تاریخ اولیائے دہلی ص ۸۴ — تذکرۃ الواصلین ص ۱۸۰ تا ۱۸۷۔

تھی، خوش مزاج تھے۔ ان کے بہت سے نوادر اور لطائف کلام مشہور ہیں زندگی کے آخری دم تک سلامت روی وعفت پر قائم رہے۔ ذہانت وفطانت کا یہ عالم تھا کہ کہتے ہیں، اپنے ایک شیخ سے پوری کتاب الشفا، ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ یہ کتاب انھوں نے نماز صبح کے بعد شروع کی تھی اور آغاز ظہر تک ختم کر لی۔

شیخ الاسلام زکریا انصاری ان کے اساتذہ میں ہیں۔ ان سے انھوں نے صحیح بخاری اسی طرح سنی جس طرح خود شیخ الاسلام نے اپنے والد سے قراءۃً سنی تھی۔ اپنے والد ہی سے صحیح بخاری، اصحاب الحدیث کی اصطلاح میں سماعاً روایت کرتے ہیں۔ شیخ زکریا انصاری، صحیح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی سے روایت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ عبد المعطی اپنے دور میں صاحب سند عالی مشہور ہوئے اور اسی لحاظ سے یہ اپنے ہم چشموں میں ممتاز ہیں۔ یعنی انھیں صرف ایک واسطے سے شارح صحیح حافظ ابن حجر عسقلانی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ اسی بنا پر طلبائے حدیث کا ہجوم ان کے گرد جمع ہو گیا اور اس اعتبار سے یہ اس شرف سے بہرہ ور ہیں جس سے بڑا اہل علم کے نقطۂ نظر سے اور کوئی شرف نہیں ہے۔

النور السافر کے مصنف شیخ عبد القادر حضرمی نے بھی مختلف نشستوں میں ان سے صحیح بخاری کا سماع کیا۔ وہ اپنے بارے میں لکھتے ہیں: "میں اس زمانے میں کم سن تھا تاہم شیخ نے مجھے زبانی سند و اجازہ عطا فرمایا۔" وہ مزید لکھتے ہیں: "میرے والد نے ان سے درخواست کی کہ منظوم شکل میں اس اجازت کا ذکر فرما دیا جائے تاکہ یہ اپنے قصائد کے ساتھ اسے شامل کر لیں، لیکن اللہ نے اس کا موقع نہ دیا۔"

شیخ عبد المعطی مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں "کتاب اسماء رجال البخاری" ہے۔ اس کتاب میں شیوخ بخاری سے لے کر راوی حدیث صحابی تک تمام راویوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو وہ مکمل نہ کر پائے۔ صرف ایک ہی ضخیم جلد معرض تصنیف میں لا سکے۔ اگر یہ کتاب مکمل ہو جاتی تو دو جلدوں پر مشتمل ہوتی۔ یہ اپنے موضوع میں بہت مفید

کتاب ہے۔

شیخ موصوف شاعر بھی تھے۔ شمع کے بارے میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ومشوقۃ ہیفاء لدن قوامہا	من البیض تزدی بالمثقفۃ السمر
اذا اصبحت امست تحد لسانہا	تفتق درع اللیل من طلعۃ البدر
قصیر سناھا قد محی آیۃ الدجیٰ	فصار نہارًا ابیضا ساطع الفجر
تمد لسانا طائلا غیر ناطق	ومن غیر اجفان مدامعہا تجری
وجلبا بہا یحکی لجینا بیاضہ	واحشاؤھا ازرت علی لہب الجمر
اذا اجمعت تسمع بتصحیفہ ولا	ت حین مناص جاء فی محکم الذکر
فدونک لغزا واضحا قد شرحتہ	وبینتہ لکن بنوع من الستر

ان اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

وہ (یعنی شمع) دُبلی اور پتلی جسامت والی ہے اور نرم ہے۔ اس کا مادّہ سفید ہے، جو گندمی رنگ سے ملا ہوا ہے۔

وہ جب صبح کرتی ہے تو اس کی زبان تیز ہو جاتی ہے اور وہ جلوۂ ماہتاب سے لباسِ شب کو چاک کر دیتی ہے۔

اس کا نیزہ بہت مختصر ہے جو تاریکی کا نشان مٹا دیتا ہے اور فجر کا جھٹپٹا سفید دن بن جاتا ہے۔

وہ بغیر کچھ بولے، اپنی لمبی زبان کو بڑھاتی ہے، اور بغیر آنکھوں اور پپوٹوں کے اس کے آنسو بہتے ہیں۔

اس کے گھونگھٹ کی سفیدی چاندی سے مشابہ ہے اور اس کے اندر کا حصّہ انگارے کے شعلوں سے بازی لے گیا ہے۔

یہ تمام اوصاف جو شمع کے بیان کیے گئے ہیں، اگر جمع ہو جائیں تو تم اس کی تحریم کو سن لوگے۔

تم ایک واضح چیستان کو پلّے باندھ لو، جس کو میں نے اگرچہ وضاحت کے ساتھ

بیان کر دیا ہے، مگر ایک پردۂ خفا باقی رکھ لیا ہے۔

یہ اشعار بھی ان ہی کے ہیں:

قم یا ندیم فذا الصباح قد انفلق ومحی بآیة نوره ظلم الغسق

قرب صبوحک فالزمان مساعد وادر بروقه حکت لون الشفق

قام سقاه کئوسها فی خضرة والمسک والکافور فیها قد عبق

قمر یدیر الشمس فی کأساته وبثغره مثل المدامة بل ارق

قد یحاکی السمهری ومقلة کالسیف واللحظ السهام اذا رشق

قوس الحواجب موتر لقتالنا ولنا قلوب العاشقین غدت درق

علق الوشاح بخصره وتراه قد صحت خلاخله ودملجه نطق

قرت نواظر عاشقیه بحبه لکن من الصد المبرح فی ارق

قرأ المحب علی صحیفة خده هذا العمر الله احسن من خلق

قد کنت همت بحسن وجماله اذ کان جفن شبیبتی فیه رمق

قضیت ایامی سدی وسبهللا ترک الخلاعة والصبابة بی احق

قد آن ان اثنی العنان عن الهوی واعود عنه عود عبد قد ابق

قدم المشیب فکان ابلغ زاجر ومضی الشباب کانه طیف طرق

ترجمہ: اے ندیم! اٹھ جا۔ دیکھ، صبح کی پو پھٹ گئی ہے اور اس کی روشنی نے شب کی تاریکیوں کو مٹا دیا ہے۔

اپنا بادۂ صبح گاہی قریب لا، اس لیے کہ وقت اس کا تقاضا کرتا ہے، اور وہ جامِ شراب گردش میں لا، جس کا رنگ شفق سے مشابہت رکھتا ہے۔

ندیم کھڑا ہوا، اور اس نے شراب پلائی، جو سبز رنگ کے جاموں میں تھی اور مشک و کافور کی خوشبو، اس میں مہک رہی تھی۔

یہ ایک چاند ہے جو اپنے پیالے میں سورج کو گردش دیتا ہے اور اس کے دانتوں میں شراب بلکہ اس سے بھی رقیق ترشے موجود ہے۔

قد نیزے کی مانند اور آنکھ خنجر کی طرح ہے، اور گھورتا ہے تو نگاہ نیزہ بن جاتی ہے۔
ابرو کی کمان ہمیں قتل کرنے کے لیے چلّہ چڑھائے ہوئے ہے، اور اس کے لیے عاشقوں کے دل ڈھال بن گئے ہیں۔
تلوار کمر سے لگی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اس کے گھنگرو تو خاموش ہیں اور بازو بند بول رہے ہیں۔
اس کے عاشقوں کی آنکھیں تو ٹھنڈی ہو جاتی ہیں لیکن تکلیف دہ رکاوٹ کی وجہ سے نیند اڑ جاتی ہے۔
عاشق اس کے صحیفۂ رخسار پر یہ تحریر پڑھتا ہے کہ خدا کی قسم، یہ حسین ترین مخلوق ہے۔
اس کے حسن و جمال سے کبھی اس وہم میں پڑ جاتا ہوں کہ یہ میری جوانی کی آخری سانسیں ہیں۔
میں نے اپنی زندگی بے کار و بے مقصد گزار دی، میرے لیے نفسانی خواہشوں کی بندگی اور عشق بازی کو چھوڑ دینا زیادہ صحیح ہے۔
اب وقت آگیا ہے کہ خواہشِ نفسانی سے یوں باز آجاؤں جیسے بھاگا ہوا غلام واپس آجاتا ہے۔
بڑھاپا آگیا جو سب سے زیادہ مؤثر تنبیہ کرنے والا ہے، اور جوانی اس طرح گزر گئی جیسے رات کا خیالِ خواب۔
شیخ عبد المعطی مکی گجرات کے شہر احمد آباد میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ وہیں ۲۷ ذی الحجہ ۹۸۹ھ میں وفات پائی اور اسی شہر میں دفن ہوئے۔[۶۳]

---

۶۳ النور السافر، ص ۳۶۴ تا ۳۷۰ — شذرات الذہب ج ۸ ص ۴۱۷، ۴۱۸۔
نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۱۴ تا ۲۱۶ —
ہدیۃ العارفین، ج ۱، ص ۶۲۲۔

۱۶۶۔ مفتی عبدالملک امروہوی

مفتی عبدالملک بن محمود بن عطاء اللہ حسینی امروہوی اپنے دور کے خطۂ ہند کے شیخ اور فقیہ تھے اور اپنے تمام بھائیوں سے زیادہ عالم اور ذی فہم تھے۔ امروہہ کی مسندِ افتا پر ان کے والدِ مکرم مفتی محمود بن عطاء اللہ حسینی متمکن تھے، ان کی وفات کے بعد ۹۱۷ھ کو سلطان سکندر لودھی کے عہد میں یہ منصب اسی عالمِ دین کے سپرد ہوا، جس پر وہ عمر بھر فائز رہے معلوم ہوتا ہے، انھوں نے ۹۵۰ھ کو یا اس کے لگ بھگ وفات پائی، کیوں کہ ان کے بعد ان کے بیٹے مفتی عبدالغفور اسی سال امروہہ کی سندِ افتا پر متمکن ہوئے تھے[۲۶۵]

۱۶۷۔ شیخ عبدالملک احمد آبادی

شیخ عبدالملک عباسی احمد آبادی علاقہ گجرات کے عالم دین اور محدثِ وقت تھے۔ اس عصر کے کبار و ممتاز علما میں سے تھے۔ زاد بوم اور خواب گاہ دونوں احمد آباد (گجرات) ہیں۔ اپنے بڑے بھائی شیخ قطب الدین عباسی کے شاگرد تھے، جنھوں نے حدیث کی سند حافظ ابن حجر عسقلانی کے تلمیذ اور مشہور امام صاحبِ الضوء اللامع شیخ شمس الدین بن محمد مصری سخاوی سے لی تھی۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور علومِ عربیہ میں ماہر تھے اور اس سلسلے میں استاذِ زمان کے مرتبے کو پہنچ گئے تھے۔ قرآنِ مجید اور صحیح بخاری کے لفظاً اور معناً حافظ تھے۔ ہمیشہ اپنے حجرے اور مسجد میں وظائف و اوراد اور نماز میں مشغول رہتے گھر میں بہت کم جاتے تھے، کبر سنی کی بنا پر آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی مگر دل کی قوت بڑھ گئی تھی۔ تیز ذہن اور تیز فکر عالم تھے۔ تمام علوم کا درس زبانی دیتے۔ توکل اور تجرید میں اس زمانے میں کوئی شخص ان کا مثیل نہ تھا۔ مولانا کمال محمد عباسی گجراتی

---

[۲۶۵] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۱۷، ۲۱۸ بحوالہ نخبۃ التواریخ۔

جو اُجین مالوہ کے مفتی تھے، علمِ حدیث میں ان کے شاگرد تھے۔ شیخ عبدالملک عباسی نے ۹۷۰ھ کے بعد وفات پائی۔[۱۶۵]

۱۶۸۔ شیخ عبدالنبی گنگوہی

شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی حنفی المسلک تھے اور ارضِ ہند کے مشاہیر علما و محدثین میں سے تھے۔ گنگوہ میں پیدا ہوئے اور علم و فضل کی آغوش میں پرورش پائی۔ علوم قرآن، فقہ اور باقی علوم کی تحصیل گنگوہ اور اس کے گرد و نواح کے فاضل اساتذہ سے کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حرمین شریفین کے لیے رختِ سفر باندھا۔ وہاں مختلف اساتذہ سے جن میں شیخ محمد بن حجر مکی بھی شامل ہیں، حدیث کا درس لیا۔ اس سلسلے میں ان کا کئی بار ارضِ حجاز اور ہندوستان میں آنا جانا ہوا۔ وہ طویل عرصہ تک مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے اور بہت سے اساتذہ سے استفادہ کیا۔ علمِ حدیث میں کامل رسوخ کے بعد ہندوستان کو مراجعت کی۔ ان کے خاندان میں آبا و اجداد سے سماع و تواجد اور انعقادِ اعراس کا سلسلہ چلا آرہا تھا۔ نیز ان کے اسلاف مسلک وحدت الوجود سے بھی تعلق و انسلاک رکھتے تھے اور ان تمام رسوم و عوائد پہ عامل تھے جو اکثر مشائخ صوفیہ میں مروج ہیں۔ لیکن شیخ عبدالنبی نے ان سب امور کی شدت سے مخالفت کی اور خالص سنتِ محمدیہ اور طریقہ سلفیہ کی نصرت و اعانت کا علم بلند کیا۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنی تائید میں کتاب و سنت سے دلائل و براہین پیش کیں اور ایسے مقدمات سے استدلال کیا جو فقط فرامینِ خداوندی اور احکامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی ہیں۔ اس باب میں انھوں نے اپنے والدِ گرامی شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس اور چچاؤں کی مخالفت کی اور ان کے طریقِ عمل کو ہدفِ تنقید ٹھہرایا۔ اس صدائے حق کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں مخالفین کی طرف سے سخت اذیتیں پہنچائی گئیں اور سنتِ رسول اللہ کی تبلیغ کے جرم میں کئی قسم کی تکلیفوں میں مبتلا کیا گیا۔ مگر انھوں نے اس کی

---

[۱۶۵] اذکار ابرار، ص ۳۱۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۱۸۔ یاد ایام ص ۶۲

کوئی پرواہ نہ کی اور اپنی تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ انھوں نے تقویٰ و پرہیزگاری کو اپنا معمول ٹھہرایا، وہ ہر آن اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے۔ لیکن ان کے خاندان کے عام لوگوں اور بزرگوں نے ان کو گھر اور وطن سے نکال دیا، اور وہ عرصہ تک باہر رہے۔

منصبِ صدر الصدور

اسی اثنا میں ان کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب آیا اور ان کی علمی شہرت بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر تک پہنچی۔ اس نے ان کی علم و فضل کی وسعتوں سے متاثر ہو کر ان کو ۹۷۱ھ میں مظفر خاں وزیر کی سفارش سے ہندوستان کے منصبِ صدارت پر فائز کر دیا۔ یہ اس دور کا بہت بڑا اعزاز تھا اور ملک کے تمام علما و قضات ان کے ماتحت تھے۔ شیخ عبدالنبی طویل عرصہ تک اس عہدۂ جلیلہ پر متمکن رہے۔ ہندوستان میں بہت سے بادشاہوں نے تختِ حکومت بچھایا اور بے شمار لوگوں نے صدارت کا منصب سنبھالا، مگر جو عزت و احترام، جو وقار و عظمت اور مال و دولت شیخ عبدالنبی کو حاصل ہوا، وہ اور کسی صدر کے حصے میں نہیں آیا۔ جس قدر وظیفے اور امانتیں انھوں نے جاری کیں، اس کا دسواں حصہ بھی کسی صدر نے جاری نہ کیا ہوگا۔ مغل حکمرانوں میں سے جلال الدین اکبر بہت رعب اور دبدبے کا حکمران تھا، وہ ان کا از حد معتقد تھا اور ان سے اس درجہ تکریم سے پیش آتا کہ ان کی جوتیاں سیدھی کر کے آگے رکھتا تھا، سماعِ حدیث کے لیے خود ان کے گھر جاتا اور ان کے اشاروں کا منتظر رہتا۔ ملک کے ہر طبقۂ خیال کے لوگوں اور عوام و خواص میں ان کو بڑی عزت و قبولیت حاصل تھی۔

مسجد کی جگہ مندر کی تعمیر اور ایک ہندو کا قتل

پھر ایک دور ایسا آیا کہ شاہِ ہند جلال الدین اکبر تمام حق پرست علما اور صحیح العقیدہ مشائخ کی مخالفت پر اتر آیا اور مختلف حیلوں بہانوں سے انھیں مصائب و مشکلات میں ڈالنا شروع کر دیا۔ شیخ عبدالنبی بھی ان ہی علما کی جماعت میں شامل ہیں۔ اس کی اصل وجہ ملا مبارک اور ان کے بیٹے ابوالفضل اور فیضی تھے، جنھوں بادشاہ کو علما کی مخالفت پر اکسایا اور اس کے دل سے ان کے اثر و رسوخ کو ختم کیا۔

ان ہی دنوں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ قاضی عبدالرحیم نے جو متھرا کے منصب قضا پر متعین تھے، صدر الصدور شیخ عبدالنبی کی خدمت میں یہ استغاثہ بھیجا کہ متھرا کے مسلمان ایک مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے، اس کے لیے انھوں نے جگہ کا انتظام بھی کر لیا تھا اور عمارتی سامان بھی وہاں رکھ لیا گیا تھا۔ لیکن یہاں کے ایک سرکش اور سرمایہ دار برہمن نے وہ تمام عمارتی سامان خود اٹھا لیا، اور مسجد کی جگہ پر اسی سامان سے ایک بت خانہ کی تعمیر شروع کر دی۔ میں نے جب اس سے باز پرس کی تو اس نے لوگوں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر سبّ وشتم کیا۔ اسلام کی اہانت کی اور مسلمانوں کے لیے سخت توہین آمیز الفاظ استعمال کیے۔

ظاہر ہے، یہ معاملہ انتہائی سنگین نوعیت کا حامل تھا اور ملک کے صدر الصدور کی حیثیت سے شیخ عبدالنبی کے لیے اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ شیخ نے اس ہندو کو طلب کیا، مگر وہ حاضر نہ ہوا۔ بالآخر معاملہ بادشاہ تک پہنچا تو اس نے اپنے دربار کی دو بڑی شخصیتوں کو جن میں سے ایک مسلمان تھا یعنی ابوالفضل اور دوسرا ہندو تھا یعنی بیربر۔ متھرا بھیجا اور حکم دیا کہ وہ اس ہندو کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر کریں۔ وہ ہندو تو نہ آیا، لیکن واپس آکر ابوالفضل نے بادشاہ کے سامنے وہ سب کچھ بیان کیا جو اس نے لوگوں سے سنا تھا اور کہا کہ اس بات کی تحقیق ہو گئی ہے کہ متھرا کے ہندو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سبّ وشتم کیا ہے، اسلام کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں اور مسلمانوں کی توہین کی ہے۔

شاتم رسول کی سزا۔ علما کے دو گروہ

اس برہمن کو تو جیل میں ڈال دیا گیا مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ اس کو اس جرم کی کیا سزا دی جائے؟ اس پر علما کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا، اور دوسرے نے اس کی تشہیر اور جرمانے وغیرہ پر زور دیا۔ بحث زیادہ طول پکڑ گئی تو شیخ عبدالنبی نے بادشاہ سے اس کے قتل کی اجازت طلب کی اور اس پر اصرار کیا۔ بادشاہ نے صاف لفظوں میں تو اجازت نہ دی، البتہ یہ کہا کہ شرعی سزاؤں کا

معاملہ آپ سے متعلق ہے، ہم سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ شیخ نے بادشاہ سے کئی مرتبہ اس کے قتل کے لیے کہا، مگر وہ بدستور شیخ کو یہی الفاظ کہہ کر ٹالتا رہا کہ شرعی تنازعوں کے سلسلے میں ہم دخل دینا نہیں چاہتے، اس کا تعلق آپ کی ذات اور علم سے ہے۔ برہمن اس جھگڑے میں مدتوں قید میں پڑا رہا۔ شاہی حرم میں ہندو عورتیں بھی موجود تھیں، انھیں واقعہ کا علم ہوا تو وہ بادشاہ سے اس برہمن کی رہائی کے لیے سفارشیں کرنے لگیں۔ بادشاہ سب کچھ سنتا لیکن خاموش رہتا، کیوں کہ اس کو شیخ کا بہت لحاظ تھا نہ وہ صاف لفظوں میں اس کے قتل کی اجازت دیتا تھا اور نہ رہائی کا حکم جاری کرتا تھا۔

اب شیخ نے بادشاہ سے پھر اس کے قتل کے لیے کہا تو اس نے جواب دیا، ہم تو آپ سے کہہ چکے ہیں کہ جو مناسب سمجھتے ہیں کریں، ہم سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بادشاہ کی یہ بات سن کر شیخ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا مگر جب بادشاہ کے علم میں یہ بات آئی تو اسے سخت غصہ آیا۔ اُدھر ہندو رانیوں نے جو شاہی حرم میں داخل تھیں، اور ہندو مصاحبوں نے جو دربار سے تعلق رکھتے تھے، بادشاہ کو بھڑکانا شروع کیا اور کہا کہ ان ملاؤں کو آپ نے اپنی مہربانیوں اور نرم رویے سے سر پر چڑھا لیا ہے۔ اب یہ یہاں تک جری ہو گئے ہیں کہ ان کو بادشاہ کی مرضی اور پسند کا بھی کوئی خیال نہیں رہا۔ وہ آپ کے حکم اور منظوری کے بغیر ہی اپنا اختیار اور دبدبہ جتانے کے لیے لوگوں کو قتل کرنے لگے ہیں۔ نہ ان کو آپ کی پرواہ ہے اور نہ رعایا کے احساسات کا کوئی خیال۔ الغرض بعض عناصر نے بادشاہ کے اس طرح کان بھرے کہ اس کے لیے مزید تحمّل ممکن نہ رہا، معاملہ اس کی قوتِ برداشت سے باہر ہو گیا اور جو مادّہ ایک مدّت سے اندر ہی اندر پک رہا تھا، پھوٹ کر بہہ نکلا۔

ایک رات انوپ تلاؤ کی محفل میں بادشاہ نے یہ معاملہ دربار کے نئے نئے مفتیوں کے سامنے پیش کیا اور اس مسئلہ سے متعلق ان کی رائے طلب کی۔ یہاں مختلف قسم کے لوگ موجود تھے، ہر ایک نے اپنی فکری اور ذہنی بساط کے مطابق اس بحث

میں حصہ لیا۔ کسی نے کہا، اس مقدمے میں نہ تو گواہوں پر کما حقہ، جرح کی گئی ہے اور نہ ان کی پوری تعدیل کی گئی ہے کسی نے کہا، شیخ عبدالنبی اپنے آپ کو امام ابو حنیفہ کے اولاد میں شمار کرتے ہیں، حالاں کہ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے ماتحت کافر اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بدزبانی کریں تو ان کی یہ حرکت نقضِ عہد اور ابرائے ذمہ کا باعث نہیں بن سکتی۔ یہ بات حنفی فقہ کی کتابوں میں وضاحت سے موجود ہے۔ حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ شیخ کو اپنے جدِّ امجد کے مذہب سے کیوں کر اختلاف کی جرأت ہوئی۔

مُلا عبدالقادر سے اکبر کا استفسار

اس موقع پر مُلا عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ اس مجلس میں، مَیں بھی موجود تھا اور بادشاہ سے کسی قدر دُور تھا۔ دورانِ بحث مَیں ناگہاں دُور سے بادشاہ کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ میری طرف متوجہ ہوا، اور میرا نام لے کر بلایا اور کہا۔

"آگے آؤ۔"

میں قریب گیا تو پوچھا۔

کیا تم نے بھی یہ مسئلہ سنا ہے کہ اگر ایک شخص کے قتل پر ننانوے[۹۹] روایتیں ہوں اور رہائی کے لیے صرف ایک روایت ملتی ہو مفتی کو اس ایک روایت کو ترجیح دینا چاہیے[۶]۔

مَیں نے کہا۔ "ہاں ایسا ہی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

ان الحدود والعقوبات تندرء بالشبہات۔ مَیں نے اس کا مطلب فارسی میں سمجھایا (کہ شبہات حدود اور سزاؤں میں کمی کر دیتے ہیں)"

میری یہ بات سن کر بادشاہ نے افسوس کے ساتھ پوچھا۔

مگر شیخ عبدالنبی بریں مسئلہ مطلع نہ بود کہ آں برہمن بیچارہ را کشت و ایں خود چگونہ باشد۔

کیا شیخ عبدالنبی کو اس مسئلے کا علم نہ تھا۔ اس نے بیچارے برہمن کو قتل کرا دیا۔ آخر ایسا

---

[۶] ایسی کوئی روایت ہمیں نہیں ملی جس کے یہ الفاظ ہوں یا اس سے ملتے جلتے ہوں۔

کیوں ہوا ؟

میں نے کہا۔ شیخ خود بڑے عالم ہیں۔ وہ ضرور جانتے ہوں گے۔ اس روایت کے باوجود، اگر انھوں نے حکم دیا ہے تو ضرور کوئی مصلحت ہو گی۔

فرمودند مصلحت چیست ؟

بادشاہ نے پوچھا۔ کیا مصلحت ہوسکتی ہے ؟

میں نے کہا۔ فتنہ وفساد کی روک تھام اور عوام کی دلیری کا سدّ باب ۔!

یہاں مُلا عبدالقادر لکھتے ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں قاضی عیاض کی شفا کی ایک روایت جو میری نظر سے گزر چکی تھی. بیان کی لیکن حاضرین مجلس میں سے بعض خبیث النفس لوگوں نے کہا۔

قاضی عیاض مالکی است سخنِ او در دیار حنفی سند نیست۔

قاضی عیاض مالکی مسلک کے حامل ہیں، ان کی بات حنفی ملک میں سند نہیں بن سکتی۔

ان کے اس اعتراض پر بادشاہ نے مجھ سے پوچھا۔ تمھارے پاس اس کا کیا جواب ہے ؟

میں نے کہا۔ وہ یقیناً مالکی ہیں، لیکن اگر کوئی محقق اور مفتی سیاسی مصلحت کی بنا پر ان کے فتوے پر عمل کرے تو شرعاً جائز ہے۔

مُلا عبدالقادر رقم طراز ہیں کہ میری یہ بات وہاں موضوعِ بحث بن گئی اور بحث خاصی طول پکڑ گئی۔ بادشاہ اس وقت بہت غصے میں تھا۔ بدایونی لکھتے ہیں:

وموئے سُبلت شاہنشاہی را دراں وقت مردم می دیدند کہ چوں موئے شیر برخاستہ بود۔ واز عقب سرمرا مانع از بحث می آمدند۔ یکبارگی اعراضی شدہ۔ فرمودند۔ ایں نامعقول است کہ می گوئی۔

یعنی لوگوں نے دیکھا کہ شاہنشاہ کی مونچھوں کے بال شیر کے بالوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے اور حاضرین مجلس پیچھے سے میرا دامن کھینچ کر مجھے بحث سے روک رہے تھے۔ اتنے میں بادشاہ نے جھلا کر مجھ سے کہا۔

تم یہ نامعقول باتیں کر رہے ہو۔

مَیں فوراً تسلیمات بجالایا اور واپس آکر اپنی صف میں کھڑا ہو گیا۔ اس دن سے میں نے پیش قدمی اور کسی معاملے میں سبقت کرنا چھوڑ دیا اور بحث و مباحثہ سے کنارہ کشی کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ بس کبھی کبھی کورنش بجالاتا اور اپنے کام میں مشغول رہتا۔

اس واقعہ کے بعد شیخ عبدالنبی کو برابر زوال آتا گیا۔ ان کے اور بادشاہ کے درمیان ایک حجاب سا حائل ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے ملاقات اور گفتگو سے گریز کرنے لگے۔ یہاں تک کہ شیخ نے دربار میں جانا بالکل بند کر دیا اور ۹۸۶ھ میں وہ عہدۂ صدارت سے معزول ہو گئے۔

مُلا مبارک کی تجویز

اسی اثنا میں مُلا مبارک کسی سلسلے میں بادشاہ کو مبارک باد دینے کے لیے آگرہ سے فتح پور گئے۔ بادشاہ نے ان سے سارا واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا۔ "آپ خود مجتہدِ دوراں اور امامِ زماں ہیں۔ شرعی اور ملکی احکام کے اجرا میں ان مُلّاؤں کے محتاج کیوں بنتے ہیں، جو بجز جھوٹی شہرت کے ذرہ برابر بھی علم سے لگاؤ نہیں رکھتے۔"

بادشاہ نے مُلا مبارک سے کہا۔ "تم ہمارے استاد ہو، ہم تم سے سبق پڑھتے رہیں گے، کسی طرح ہمیں ان لوگوں کے دباؤ سے نکالو۔"

بادشاہ کی یہ بات سن کر مُلا مبارک کو پرانی دشمنیوں کا بدلہ لینے کا خوب موقع ملا۔ اس نے نہایت بدباطنی کے ساتھ بادشاہ سے کہا۔ "آپ اجتہاد کا دعویٰ کر دیں اور اس دعوے پر عالموں سے محضر لکھوالیں۔"

اس سے آگے بدایونی لکھتے ہیں:

یہی وہ واقعہ تھا، جس کی بنیاد پر مُلا مبارک نے بادشاہ کے اجتہاد اور تمام مجتہدوں پر اس کی افضلیت کے متعلق محضر تیار کیا اور ضمیر فروشوں کی اس مجلس میں شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری کو زبردستی سے پکڑ کر لایا گیا۔ کسی نے ان کی تعظیم

نہ کی۔ بے چارے جوتیوں کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ پھر ان پر ایسی سختی کی گئی کہ ان سے بہ جبر و اکراہ اس محضر پر دستخط کرائے گئے[۱۶۷]

شیخ کا غرور و تکبّر

مُلا عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں اپنے عہد اور دورِ اکبری کے جن علما کا ذکر کرتے ہیں، ان سے وہ ذاتی طور واقف ہیں، ان کے اخلاق و کردار سے آگاہ ہیں اور ان کی زندگی کا ہر پہلو ان کے سامنے ہے۔ وہ ان کی علمی حیثیت کو بھی پہچانتے ہیں اور ذاتی کردار کے مختلف گوشوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری اور صدر الصدور شیخ عبدالنبی کے علم و فضل کے مداح ہیں، لیکن ساتھ ہی ان کی زندگی کے ایسے گوشوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں، جو ان کے علم و فضل سے قطعی ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ایک عالمِ دین کو بہر حال ایسی چیزوں سے محترز رہنا چاہیے اور صاف ستھری زندگی بسر کرنے کی سعی کرنا چاہیے۔

بادشاہِ ہند جلال اکبر ابتدا میں شیخ عبدالنبی کا بے حد قدر دان تھا، اس نے ان کو بہت سے اختیارات دے رکھے تھے، جن کی وجہ سے ان میں بڑا غرور اور تکبر پیدا ہو گیا تھا اور اس درجہ رعونت آگئی تھی کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے' ان کے محکمے میں کھلے بندوں رشوت لی اور دی جاتی تھی اور مملکت کے بڑے بڑے اہل کار بھی ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ اس ضمن میں بدایونی کی مندرجہ ذیل سطور قابلِ مطالعہ ہیں:

بادشاہ نے حکم دیا کہ جب تک ممالکِ محروسہ کے تمام ائمہ اپنے وظائف، اوقاف اور معاش کے فرامین پر صدر شیخ عبدالنبی کی مہر نہ کرائیں، کروڑی ان کی رقوم کا اجرا نہ کریں۔ اس فرمانِ شاہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے مشرقی کنارے سے لے کر بھکر تک کے اہلِ غرض شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان میں سے جن کی

---

[۱۶۷] تفصیل کے لیے دیکھیے منتخب التواریخ ص ۳۰۵ تا ۳۰۷

سفارش کسی امیر اور مقرّب نے کر دی، اس کا کام حسبِ منشا تکمیل پا گیا اور جن کو کسی کی سفارش میسّر نہ آئی، وہ بے چارے سیّد عبدالرسول اور شیخ کے دیگر کارندوں کے ہاں دھکے کھاتے رہے۔ نہ صرف ان کو بلکہ انھیں شیخ کے فراشوں دربانوں، سائیسوں اور حلال خوروں تک کو بھاری رشوتیں دینا پڑتیں، جب کہیں ان کا کام بنتا۔ جو یہ بھی نہ کر پاتے وہ دربانوں کے ڈنڈے کھاتے رہتے۔ ایسا بھی ہوا کہ بہت سے بدنصیب اس ہجوم اور بھاگ دوڑ میں گرمی کی شدت کی تاب نہ لا کر وہیں جاں بحق ہو گئے۔ یہ بات بادشاہ کے علم میں بھی آ چکی تھی، لیکن وہ اس صدر عالی قدر کی تعظیم کے علاوہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

جب شیخ اپنی مسند جاہ و جلال پر متمکن ہوتا اور عالی مرتبت امیر مختلف اہلِ علم کو ساتھ لے کر سفارش کے لیے اس کی خدمت میں حاضری دیتے تو اس کے تیور دیکھنے کے لائق ہوتے تھے۔ اس موقع پر تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ شیخ کسی کو تعظیم و تکریم سے پیش آتا، بلکہ وہ ہر ایک کو نہایت سخت الفاظ میں مخاطب ہوتا اور ڈانٹ ڈپٹ پر اُتر آتا تھا۔ جب بے چارا سائل انتہائی عاجزی اور خوشامد کا اظہار کرتا تو ان علمائے کرام کے لیے جو فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ اور دیگر منتہی کتابوں کا درس دیتے تھے سَو بیگھہ کے لگ بھگ اراضی منظور کر کے باقی زمین، جس پر وہ مدّتِ دراز سے قابض تھے، ان کے نام سے قلم زد کر دیتا تھا۔ ان کے مقابلے میں جاہلوں، کمینوں بلکہ ہندوؤں تک کو بہترین زمینیں عطا کر دیتا — اس طرح اس کے ہاتھوں علم اور اہلِ علم کی قدر و منزلت روز بروز گھٹتی چلی گئی۔

اس سے آگے بدایونی لکھتے ہیں:

اپنے اجلاس میں دوپہر کے بعد جب شیخ نہایت غرور و تکبّر سے کرسی پر بیٹھا وضو بناتا تو اس کے مستعملہ پانی کے چھینٹے بڑے بڑے امیروں اور خاص خاص مصاحبوں کے سروں اور کپڑوں پر گرتے اور اس کو ذرّہ بھر بھی اس کا احساس

نہ ہوتا۔ وہ لوگ بھی اہلِ علم اور فقرا کا کام نکالنے کے لیے سب کچھ برداشت کرتے اور خوشامد، چاپلوسی اور اس کی دل جوئی کی خاطر طرح طرح کی ذلتیں اٹھاتے۔ پورے شاہی عہد میں کسی صدر الصدور کا یہ اثر اور دبدبہ نہیں رہا جتنا کہ شیخ عبد النبی کو حاصل ہوگیا تھا۔

اس سے بڑی بات کیا ہوسکتی ہے کہ خود بادشاہ تعظیم و احترام کے جذبات کے ساتھ کبھی کبھی حدیث سننے کے لیے اس کے گھر جاتا۔ ایک دو مرتبہ تو بادشاہ نے اس کی جوتیاں بھی سیدھی کیں۔ بڑے شہزادے کو بھی تعلیم کے لیے اسی کے حجرے میں بٹھایا گیا تھا، وہ عموماً مولانا عبد الرحمٰن جامی کی چہل حدیث کا درس دیا کرتا تھا۔

تصنیفات

شیخ عبد النبی تصنیفی ذوق بھی رکھتے تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں ایک رسالہ حرمتِ سماع سے متعلق ہے۔ یہ رسالہ انھوں نے اپنے والدِ مکرم شیخ احمد گنگوہی کے اس رسالے کے رَد میں لکھا تھا جس میں انھوں نے سماع کو ضروری قرار دیا تھا۔

ایک اور رسالہ قفال مروزی شافعی کے ان اعتراضات کے رَد اور جواب میں تحریر کیا جو انھوں نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر وارد کیے ہیں۔

ان کے علاوہ وظائف النبی فی الادعیۃ الماثورۃ اور سنن الہدیٰ فی متابعۃ المصطفیٰ بھی ان کی تصنیفات میں سے ہے۔

معلوم ہوتا ہے، ان کی تصنیفات اور بھی ہیں، لیکن ان کا ہمیں علم نہیں ہوسکا۔

اکبر کے حکم سے حجاز کو روانگی

مخدوم الملک مولانا عبد اللہ سلطان پوری اور صدر الصدور شیخ عبد النبی گنگوہی اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود بہت بڑے عالم تھے اور دونوں کے درمیان شدید معاصرانہ رقابت تھی۔ جلال الدین اکبر شروع شروع میں مخدوم الملک کو بے حد احترام کی نظر

دیکھتا تھا، لیکن بعض واقعات اس قسم کے پیش آئے کہ وہ اکبر کی نظروں سے گر گئے اور ان کا عروج، زوال میں بدل گیا۔ اس اثنا میں شیخ عبد النبی کو ممالک محروسہ کا صدر الصدور بنا دیا گیا اور ان کا مرتبۂ اعزاز انتہائی بلندیوں کو چھونے لگا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے)، بادشاہِ ہند کے دل میں شیخ عبد النبی کے متعلق بھی تنفر کے جذبات اُبھر آئے۔ چوں کہ بادشاہ ان سے نفرت کرنے لگا تھا، اس لیے وزرا و امرا کے گروہ میں بھی ان کا کوئی حامی نہ رہا اور یہ دونوں بزرگ اپنی علمی ہمہ گیری کے باوصف اپنے ہی ملک میں اجنبی ہو کر رہ گئے۔ اکبر نے ایک تو نیا دین ایجاد کر لیا تھا اور اسے ان کی طرف سے مخالفت کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، دوسرے وہ ان دونوں کی روز روز کی مخاصمت اور معاصرانہ چپقلش سے تنگ آ گیا تھا، لہٰذا اس نے ان کو دیارِ ہند سے نکل جانے اور مکہ معظمہ چلے جانے کا حکم دیا۔ اور اس دور میں حکمران لوگ بطورِ سزا کے بھی مخالفین کو حرمین بھیجتے تھے۔ چنانچہ یہ کچھ عرصہ وہاں رہے۔ بعد ازاں شیخ عبد النبی رجب ۹۸۹ ہجری کو بادشاہ سے اجازت حاصل کیے بغیر وارد ہند ہوئے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے شیخ کو اپنے خرچ سے ۹۸۸ھ میں مکہ معظمہ بھیج دیا تھا۔

وفات

ایک روایت کے مطابق بادشاہ نے ان کو محاسبہ و بازپرس کے لیے اپنے وزیر راجہ ٹوڈر مل کے حوالے کر دیا تھا، اس نے ان کو جیل میں ڈال دیا اور شدید تکلیفیں پہنچائیں، جن کی تاب نہ لا کر وہ ۹۹۱ھ میں وفات پا گئے۔

دوسری روایت کے مطابق بادشاہ نے ان کا معاملہ ملا ابو الفضل کے سپرد کر دیا۔ وہ بھی راجہ ٹوڈر مل کی طرح پہلے سے ان سے شدید مخالفت و عداوت رکھتا تھا۔ اس نے ان کو محبوس کر کے بہت سی ذہنی اور جسمانی اذیتوں میں مبتلا کیا اور بالآخر گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا۔[۵۶۵]

---

[۵۶۵] تفصیل کے لیے دیکھیے: منتخب التواریخ، ص ۲۲۰، ۲۲۱ و ۳۰۵ تا ۳۰۷۔ حزب الامائل

ملّا بدایونی ان کی وفات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

شیخ عبدالنبی مکّہ مکرمہ سے اکبر کے پاس فتح پور پہنچے۔ اکبر کے سامنے انھوں نے نہایت تلخ گفتگو کی اور اسے بہت بُرا بھلا کہا۔ ان کی باتیں سن کر اکبر کو بھی غصّہ آ گیا اور ان کے بے باکانہ اسلوبِ کلام کو گستاخی پر محمول کیا۔ اس نے شیخ کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا۔ شیخ نے چلا کر کہا "ایک ہی بار چھُری مار کر میرا کام تمام کیوں نہیں کر دیتے"؟ اکبر نے ان کو راجہ ٹوڈرمل کے حوالے کر دیا اور حکم دیا کہ شیخ سے اس ستّر ہزار روپے کا حساب لیا جائے جو مکّہ معظمہ جاتے وقت انھیں دیا گیا تھا۔ کروڑیوں نے ان کو کچہری کی حوالات میں طویل عرصے تک مقیّد رکھا۔ آخر ایک رات گلا گھونٹ کر ان کو زندگی کی قید سے رہائی دلا دی۔ کس درجہ عبرت کی بات ہے کہ شیخ عبدالنبی جیسے مقتدر شخص کا یہ حشر ہوا کہ قتل کے دوسرے دن مناروں والے میدان میں اس کی لاش ظہر کی نماز تک بے گور و کفن پڑی رہی۔ یہ واقعہ ۹۹۲ھ میں رونما ہوا۔ ان کی تاریخ "شیخ کنبی" سے نکالی گئی اور یہ شعر کہا گیا۔

گرچہ الشیخ کالنبی گفتند
کالنبی نیست شیخ ماکنبی است [۶۹]

شیخ اور ان کا خاندان

شیخ عبدالنبی ولد شیخ احمد ولد شیخ عبدالقدوس کا اصل وطن اندری علاقہ گنگوہ تھا۔ ان کا

بتراجم الافضل ص ۱۸۱ تا ۲۲۰ — مآثر الامراء ج ، ص — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۱۹ تا ۲۲۲ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۳۴ — دربار اکبری، ص ۳۲۰ تا ۳۲۷ نیز ملاحظہ ہو، ص ۳۳۵ تا ۳۳۷ (در حالات شیخ مبارک اللہ) — رودِ کوثر، ص ۹۴ تا ۱۰۷ — تذکرہ مولانا آزاد — بزمِ تیموریہ ص ۹۳، ۹۴ - ماثر الامرا، ج ۳، ص ۲۵۶، ۲۵۷، ۳۴۸، ۳۴۹۔

۶۹ منتخب التواریخ، ص ۲۴۱ تا ۲۴۳

تعلق ایک مشہور خاندان مشائخ سے تھا۔ مکہ اور مدینہ جاکر علم حدیث کی تحصیل کی، واپس آکر تصوّف کے مسلک کو ترک کر دیا اور علوم دین کی تدریس میں مصروف ہوگئے۔ ۹۷۲ھ (یا ۹۷۱ھ) میں جبکہ مظفر خاں وزیر کل تھا، شیخ دربار میں آئے اور مظفر خاں کی سفارش پر صدر الصدور بنائے گئے۔ شیخ عبد النبی کو دراصل مُلّا مخدوم الملک (مولانا عبداللہ انصاری سلطان پوری) کا اثر گھٹانے کے لیے یہ اعزاز و ترقی دی گئی تھی۔ اکبر ابتدا میں شیخ کا نہایت معتقد تھا اور ان کے گھر جاکر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ اس نے ان کی جوتیاں تک سیدھی کیں۔ ۹۸۵ھ تک فیضی اور ابو الفضل بھی دربار میں آچکے تھے۔ ان دونوں نے اکبر کو اس طرح قابو میں کیا کہ وہ الحاد و بے دینی کی طرف مائل ہوگیا اور علما کی قدر اس کے دل سے جاتی رہی۔ شیخ کے زوال اور عبرتناک انجام کا باعث دراصل یہی دو بھائی تھے۔ معتمد خاں نے اقبال نامہ میں صاف لکھا ہے کہ ابو الفضل نے بادشاہ کے اشارے سے شیخ کو مروا ڈالا۔ ان کی تاریخ وفات کے بارے میں جو شعر درج ہے اس کے دوسرے مصرع "کنبی" کا لفظ "کنب" سے لیا گیا ہے، جس کے معنی بھنگ کے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہمارا شیخ بھنگ نوش ہے۔ بے چارے کو مرنے کے بعد بھی لوگوں نے نہیں بخشا اور طنز و طعن سے نہیں چوکے۔[۴۰]

شیخ عبد الحق محدّث دہلوی نے بھی اخبار الاخیار میں شیخ عبد القدوس گنگوہی کے حالات کے ضمن میں شیخ عبد النبی کا ذکر کیا ہے۔[۴۱]

شیخ محمد اکرام کا تجزیہ

شیخ محمد اکرام مرحوم نے اپنی تصنیف رودِ کوثر میں مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری اور صدر الصدور شیخ عبد النبی کا خاصی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور

۴۰؎ منتخب التواریخ، ص ۵۰۲ (اردو ترجمہ)

۴۱؎ اخبار الاخیار، ص ۲۲۲، ۲۲۳۔

ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی کی طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تذکرہ میں اکبر کی تبدیلیِ مذہب اور علما سے نفرت کا باعث مخدوم الملک اور صدرالصدور کی شخصی کوتاہیوں کو قرار دیا ہے اور حضرت مجدد الف ثانی نے اکبری دَور کے بعض علما کو جو "علمائے سوٗ" قرار دیا ہے تو اس سے مخدوم الملک عبداللہ اور شیخ عبدالنبی مراد لیے ہیں۔ شیخ محمد اکرام نے عہدِ اکبری کے ان دو علما کے کردار کا تجزیہ بڑے محتاط انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

بدایونی کے علاوہ عہدِ مغلیہ میں علما کے جتنے تذکرے لکھے گئے اور جن کا ماخذ منتخب التواریخ نہیں، ان میں بالعموم شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کی تعریف کی گئی ہے۔ مثلاً حضرت مجدد کے شاگرد اور خلیفہ (اور ان کی مشہور سوانح عمری حضرات القدس کے مصنف) جنھیں سترہ سال مرشد کی خدمت میں رہنا نصیب ہوا، (سنوات الاتقیا (قلمی) میں شیخ عبدالنبی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد حنفی رضی اللہ عنہ عالم و محدث بود ..... تسرع بر کمال داشت، و در اتباع سنت و رفع بدعت رسوخ تمام نصیب وقت او شدہ بود۔ و در امرِ معروف و نہی منکر بر سلاطین و امرا شدت کردے ..... صاحب تصانیف شریفہ است۔ ازاں جملہ وظائف النبی است۔ در سنہ نہصد و نود و یک در عہدِ عرش آشیانی شہادت یافت: ع

صاحب فیض گفت سالش عقل [۵۲]

{یعنی شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد حنفی رضی اللہ عنہ عالم و محدّث تھے ..... مرتبۂ کمال پر فائز تھے۔ اتباعِ سنت اور رفع بدعت میں بڑے تیز تھے اور ان کا

---

[۵۲] رودِ کوثر، ص ۹۷۔ اس تاریخ وفات کا بدایونی کے بیان سے مقابلہ کیا جائے تو اندازہ کیجیے دونوں میں کتنا بُعد ہے۔

تمام وقت اسی کام پر صرف ہوتا تھا۔ سلاطین و امرا سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سختی کا برتاؤ کرتے تھے.... بہترین تصانیف کے مصنف تھے، جن میں ایک وظائف النبی ہے۔ ۹۹۱ھ کو عہدِ اکبری میں شہادت پائی۔ تاریخ وفات اس مصرعہ سے نکلتی ہے:

[صاحبِ فیض گفت سالش عقل]

اکرام مرحوم اس سے آگے لکھتے ہیں:

اخبار الاصفیا (قلمی) میں جو ابو الفضل کے بھانجے عبدالصمد نے اسی زمانے میں لکھی (شیخ عبدالنبی کے بارے میں) اسی طرح کا اظہارِ خیال کیا ہے:

شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی، عنوانِ صحیفہ دین و دانش و فہرستِ جریدہ علم و عمل بود۔ در عنفوانِ برنائی.... بحرمین شریفین شتافت و حدیث دران خیر البقاع نزد شیخ ابن حجرؒ.... استماع نمودہ بوطن گاہ خرامید و (کمر) در رواج ارکانِ شریعت غرا بربستہ..... آرام گاہ فتح پور۔ کتاب سنن الہدیٰ از و یادگار است۔

[یعنی شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی، عنوانِ صحیفۂ دین و دانش اور فہرستِ جریدۂ علم و عمل تھے عنفوانِ شباب میں...... حرمین شریفین چلے گئے تھے اور اسی ارض مقدس میں شیخ ابن حجر..... سے سماعتِ حدیث کی۔ وطن واپس آکر ارکانِ شریعت غرا کی ترویج و اشاعت کے لیے کمر بستہ ہوئے۔ آخری آرام گاہ فتح پور ہے۔ ان کی تصنیفات میں سے ایک کتاب سنن الہدیٰ ہے]

اکرام صاحب مرحوم مزید لکھتے ہیں:

دوسرے معاصرانہ تذکروں میں بھی (مثلاً مرآۃ العالم میں۔ سوائے ان کے جنھوں نے طبقاتِ شاہ جہانی کی طرح بدایونی پر انحصار کیا ہے)۔ شیخ عبدالنبی بلکہ مخدوم الملک کا ذکر بھی تعریف کے ساتھ کیا گیا ہے اور بالخصوص حضرت مجددؒ کے شاگرد اور سوانح نگار خواجہ بدرالدین سرہندی کی شیخ عبدالنبی کی تعریف کے بعد

یہ قیاس کہ حضرت مجدد نے انھیں "علمائے سو" میں سے شمار کیا ہوگا، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔[۴۳]

اس عبارت کا مطلب بالکل ظاہر ہے۔ یعنی مولانا ابوالکلام تذکرہ میں واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ مجدد الف ثانی نے "علمائے سوء" مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور صدر الصدور شیخ عبدالنبی کو قرار دیا ہے، لیکن اکرام صاحب اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ "علمائے سوء" سے مجدد صاحب کی مراد ملا مبارک کے دونوں بیٹے ابوالفضل اور فیضی ہیں۔ اس ضمن میں اکرام صاحب کا یہ استدلال بڑا وزنی ہے کہ خود مجدد صاحب کے مرشد اور سوانح نگار خواجہ بدرالدین سرہندی جنھوں نے سترہ سال کا طویل عرصہ اپنے عظیم مرشد کی خدمت میں بسر کرنے کی سعادت حاصل کی، اپنی تصنیف سنوات الاتقیا میں اور ابوالفضل کے بھانجے شیخ عبدالصمد، اپنی کتاب اخبار الاصفیا میں شیخ عبدالنبی کی تعریف میں ایسے بہترین الفاظ استعمال کرتے ہیں (جو اوپر گزر چکے) تو ان کو مجدد صاحب کے الفاظ "علمائے سو" کا منطوق کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے۔ اکرام صاحب کے نزدیک مجدد صاحب کا مشارٌ الیہ ابوالفضل اور فیضی ہیں، نہ کہ مخدوم الملک اور صدر الصدور۔!

اکرام صاحب لکھتے ہیں:

حضرت مجدد نے "علمائے سوء" کی وضاحت نہیں کی، لیکن اس معاملے میں مولانا محمد ناظم ندوی کی رائے ہمیں صحیح معلوم ہوتی ہے، جنھوں نے تعلیماتِ مجددیہ کے پیش لفظ میں "علمائے سو" سے "مبارک ناگوری کے دونوں ذہین و طباع بیٹے ابوالفضل اور فیضی، اور تاج الدین دہلوی (کذا) مراد لیے ہیں۔ شاید ان کے علاوہ قاضی خاں بدخشی کی طرف بھی اشارہ ہو جنھوں نے بادشاہ کے لیے سجدۂ تحیت جائز قرار دیا۔"[۴۴]

۴۳۔ رودِ کوثر، ص ۹۸

۴۴۔ ایضاً، ص ۹۷ — قاضی خاں بدخشی سے نظام الدین بدخشی مراد ہیں، جن کو اکبر نے پہلے قاضی خاں اور پھر غازی خاں کا خطاب دیا تھا۔

بدایونی کی وجہِ مخالفت

مُلّا عبدالقادر بدایونی شیخ عبدالنبی کے معاصر ہیں اور نہایت طنانہ مورخ ہیں ان کے قلم کا نشتر انتہائی تیز ہے۔ بہت کم لوگ ان کے طنز و تعریض سے محفوظ رہے ہوں گے۔ اتفاق سے یہ دونوں بزرگ اکبر کے دربار سے منسلک تھے اور بدایونی کو بعض معاملات میں ان سے واسطہ بھی پڑا تھا۔ بدایونی کا ذریعۂ معاش محدود تھا اور ان کو خزانہ شاہی سے اتنی مالی مدد نہ ملتی تھی، جس کے یہ متمنی تھے۔ اس کا انھوں نے اکبر سے کئی مرتبہ اظہار بھی کیا مگر ناکام رہے۔ ان کے خیال میں اس میں شیخ بھی رکاوٹ ڈالتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

اس مختصر معاش پر بھی شیخ عبدالنبی نے کہا، ہم نے تمھارے گروہ کے آدمیوں میں سے کسی کو اتنی امداد نہیں دی [۷۵]

ممکن ہے بدایونی کی طرف سے شیخ کی مخالفت کی ایک وجہ ان کا اپنا ذاتی معاملہ ہو۔ یہ بھی امکان ہے کہ لوگوں نے شیخ کی مخالفت اس لیے شروع کر دی ہو کہ بادشاہِ وقت ان کا مخالف ہو گیا تھا [۷۶]

فیضی کے اشعار

شیخ عبدالنبی اپنے دورِ اقتدار میں اہلِ علم کے نزدیک نہایت عزت واحترام کے مالک تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۹۸۳ھ کو دہلی میں انھوں نے ایک مسجد تعمیر کی۔ تذکرہ علمائے ہند کے مترجم جناب محمد ایوب قادری رقم طراز ہیں کہ اس پر جو کتبہ نصب ہے، وہ فیضی نے لکھا اور وہ ان اشعار پر مشتمل ہے۔ ان اشعار میں شیخ کی بے حد تعریف کی گئی ہے:

۷۵؎ منتخب التواریخ (اردو ترجمہ)، ص ۴۳۸۔

۷۶؎ شیخ عبدالنبی کے حالات میں النور السافر، ص ۳۷۹، ۳۸۰ بھی دیکھیے۔ نیز ملاحظہ ہو طبقاتِ اکبری، ص ۳۹۰

فی زمان الخلیفۃ الاکبر ایدالله ذاته النفاع
قد بنی بقعۃ مقدسۃ مثلها لایکون فی الاقطاع
شیخ الاسلام ظاہر الحرمین شیخ اہل الحدیث بالاجماع
شیخ عبدالنبی نعمانی معدن العلم منبع الانفاع
سال تاریخ این بنا فیضی سأل العقل قال خیربقاع

خلیفہ جلال الدین اکبر کے زمانے میں، جس کی ذات ایسی سود مند ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تائیدات اس کے شامل حال ہوں۔

انھوں نے ایک ایسا بقعہ مقدس تعمیر کیا ہے کہ جس کی نظیر اقطاعِ عالم میں نہیں ملتی۔

اور یہ وہ ہیں جن کو حرمین میں شیخ الاسلام کہا جاتا ہے اور جن کو متفقہ طور پر اہلِ حدیث کا شیخ قرار دیا جاتا ہے۔

وہ شیخ عبدالنبی نعمانی ہیں، جو معدنِ علم اور سرچشمۂ برکات ہیں۔

اس کی تعمیر تاریخ فیضی نے عقل سے پوچھی تو اس نے کہا۔ "خیربقاع" (یعنی بہترین مقام) ۹۸۳ھ

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے دورِ صدرالصدوری میں خود فیضی کے نزدیک وہ کس درجہ قدر و منزلت کے حامل تھے۔[۵۵]

شاتمِ رسول کی سزا

اوپر گزر چکا ہے کہ شیخ عبدالنبی گنگوہی نے ایک ہندو شاتمِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کی سزا دی تھی اور بادشاہ ہند جلال الدین اکبر نے یہ مسئلہ علما کی مجلس میں پیش کیا تھا اور پھر اس کو جس انداز سے موضوع بحث ٹھہرایا گیا، اس میں شرعی اعتبار سے شیخ کے فیصلے کو سراسر غلط قرار دیا گیا تھا۔ یہ مسئلہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اختصار کے ساتھ اس کی شرعی حیثیت اور ائمۂ دین کے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی جائے۔

---

[۵۵] تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ)، ص ۳۲۶

امام ابن تیمیہ نے الصارم المسلول میں اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ان من سب النبی صلی اللہ علیہ وسلم من مسلم او کافر فانہ یجب قتلہ۔ ھذا مذھب علیہ عامۃ اھل العلم۔ قال ابن المنذر اجمع عوام اھل العلم علی ان حد من سب النبی صلی اللہ علیہ وسلم القتل؛ وممن قالہ مالک واللیث واحمد واسحاق، وھو مذھب الشافعی[۷۸]

جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دیتا ہے، وہ مسلمان ہو یا کافر، اس کو قتل کر دینا واجب ہے۔ یہ عامہ اہلِ علم کا مذہب ہے۔ ابن المنذر کہتے ہیں، عوام اہلِ علم کا اس پر اجماع ہے کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دیتا ہے، اس پر حدِ قتل نافذ کر دی جائے۔ امام مالک، لیث، احمد بن حنبل اور امام شافعی کا یہی مذہب ہے۔

اس ضمن میں امام احمد بن حنبل کے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے امام ابنِ تیمیہ لکھتے ہیں:

کل من شتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم او تنقصہ، مسلما کان او کافرا، فعلیہ القتل[۷۹]

جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دیتا ہے یا آپ کی تنقیص کرتا ہے، وہ مسلمان ہو یا کافر، اسے قتل کر دیا جائے۔

ساتھ ہی مرقوم ہے: لیس علی ھذا المطو العھد والذمۃ۔

یہ معاملہ اس قدر سنگین ہے کہ اس پر عہد اور ذمہ کی سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں۔

ابو الصفرا لکھتے ہیں:

سألت ابا عبد اللہ عن رجل من اھل الذمۃ شتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ماذا علیہ؟ قال اذا قامت البینۃ علیہ یقتل من شتم النبی صلی اللہ علیہ مسلما کان او کافرا۔[۸۰]

---

۷۸ الصارم المسلول علی شاتم الرسول، ص ۳۔ ۷۹ ایضاً ص ۴۔ ۸۰ ایضاً

میں نے امام احمد سے سوال کیا، اگر کوئی ذمی آنحضرتؐ کو گالی دے تو اس کو کیا سزا دی جائے؟ فرمایا، جب اس کے خلاف ثبوت فراہم ہو جائے کہ وہ آنحضرتؐ کو گالی دینے کا مرتکب ہوا ہے تو وہ مسلمان ہو یا کافر اس کو قتل کر دیا جائے۔

اسی طرح وہ مختلف اہلِ علم اور اصحابِ امام احمد کے مسلک کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

وذکروا ان سابہ یقتل وان کان ذمیا، وان عہدہ ینتقض [۸۱]

آنحضرتؐ کو گالی دینے والے کو قتل کر دیا جائے گا، اگرچہ وہ ذمی ہو، اور اس کا عہد ٹوٹ جائے گا۔

امام مالک اور اہلِ مدینہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

وان کان ذمیا فانہ یقتل ایضاً فی مذہب مالک واھل المدینۃ... و ھو مذہب احمد وفقہاء الحدیث۔ [۸۲]

اگر شاتم رسول ذمی ہو، جب بھی اسے مذہب امام مالک اور مذہب اہلِ مدینہ کے مطابق قتل کر دیا جائے گا..... امام احمد اور اہل حدیث کا یہی مذہب ہے۔

امام شافعی سے شاتم رسول کے بارے میں منقول ہے:

ان عہدہ ینتقض بسب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وانہ یقتل۔ [۸۳]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب وشتم کی وجہ سے اس کا مسلمانوں سے عہد ٹوٹ جائے گا اور اسے قتل کر دیا جائے گا۔

امام شافعی کتاب الامّ میں فرماتے ہیں کہ ذمیوں سے شرائط صلح لکھتے وقت یہ عہد لینا چاہیے کہ وہ آنحضرتؐ، کتاب اللہ اور دینِ اسلام کے بارے میں توہین آمیز

---

[۸۱] الصارم المسلول علی شاتم الرسول ص ۶

[۸۲] ایضاً ص ۴ [۸۳] ایضاً ص ۸

الفاظ استعمال نہیں کریں گے، اگر کریں گے تو عہد ٹوٹ جائے گا اور ان کے مال و جان کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔ اس ضمن میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ ہیں:

اذا اراد الامام ان یکتب کتاب الصلح علی الجزیۃ، کتب وذکر الشرط، الی ان قال۔ وعلی ان احدا منکم ان ذکر محمدا صلی اللہ علیہ وسلم او کتاب اللہ او دینہ بما لا ینبغی ان یذکرہ فقد برئت منہ ذمۃ اللہ ثم ذمۃ امیر المؤمنین وجمیع المسلمین، ونقض ما اعطی من الامان، وحل لامیر المومنین مالہ ودمہ کما تحل اموال اہل الحرب ودمائہم[۸۴]

جب امیر المومنین، جزیہ کے بارے میں اہلِ ذمہ سے صلح نامہ معرضِ کتابت میں لانے لگے تو باقاعدہ ان شرائط کو ضبطِ تحریر میں لائے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں یا قرآنِ مجید اور اللہ کے دین کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کرے گا تو وہ اللہ کی ذمہ داری، پھر امیر المومنین اور تمام مسلمانوں کی ذمہ داری کے حلقے سے باہر نکل جائے گا، اور جو امان اسے دی گئی ہے، وہ ٹوٹ جائے گی، اور امیر المومنین کے لیے اس کا جان و مال اسی طرح حلال قرار پائے گا جس طرح کہ اہلِ حرب کے مال و جان حلال قرار پاتے ہیں۔

اس سے آگے امام شافعی فرماتے ہیں، اگر کوئی ذمی مسلمان عورتوں کی عزت کو ملحوظ نہیں رکھے گا، یا کسی مسلمان پر ڈاکہ ڈالے گا یا اس کے دین کے سلسلے میں رکاوٹ پیدا کرے گا یا ان لوگوں کی اعانت کرے گا جو مسلمانوں کے محارب اور ان سے برسرِ پیکار ہیں یا ان کو اہلِ اسلام کے رازوں سے آگاہ کرے گا اور ان کی اندر کی باتیں انھیں بتائے گا تو اسے یاد رکھنا چاہیے۔

فقد نقض عہدہ وحل دمہ ومالہ[۸۵]

اس نے اپنا عہد توڑ دیا اور اس کا خون اور مال مسلمانوں پر حلال ہو گیا۔

۸۴؎ الصارم المسلول ص ۸

۸۵؎ ایضاً

امام شافعی یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے مال اور عزت کو نقصان پہنچانے کی جو کوشش بھی کرے گا، اس کو نقضِ عہد پر محمول ٹھہرایا جائے گا اور اس سے ابرائے ذمہ ہو جائے گا۔

ثم قال فهذه الشروط اللازمة ان رضيها فبها، وان لم يرضها فلا عقد له ولا جزية۔[۸۶]

یہ بنیادی شرائط ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ ان پر رضامند ہے تو بہتر، ورنہ عہد اور جزیہ کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔

بہرحال اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ شاتمِ رسول کی سزا قتل ہے اور ائمہ اربعہ کا یہی مذہب ہے:

ان الساب ان كان مسلما فانه يكفر ويقتل بغير خلاف، وهو مذهب الائمة الاربعة وغيرهم۔[۸۷]

آنحضرتؐ کو گالی دینے والا اگر مسلمان ہو تو وہ دائرۂ کفر میں داخل ہو جاتا ہے اور بلااختلاف اس کی سزا قتل ہے۔ ائمہ اربعہ اور دیگر اہلِ علم کا یہی مذہب ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ذمی یا کافر گالی دے تو اس کا کیا کیا جائے؟۔ اس ضمن میں مختصر الفاظ میں امام احمد، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کا مذہب بیان ہو چکا۔ وہ اس کے قتل کا فتویٰ دیتے ہیں، مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر ان سے قدرے مختلف ہے:

واما ابوحنيفة واصحابه فقالوا، لا ينتقض العهد بالسب ولا يقتل الذمي بذلك، لكن يعزر على اظهار ذلك كما يعزر على اظهار المنكرات التي ليس لهم فعلها من اظهار اصواتهم بكتابهم ونحو ذلك۔[۸۸]

امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا کہنا ہے کہ آنحضرت کو گالی دینے سے ذمی کا عہد نہیں

---

[۸۶] ایضاً [۸۷] ایضاً ص ۸ [۸۸] ایضاً ص ۱

ٹوٹتا اور نہ اس سے اس کو قتل کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے اظہار پر اسے تعزیر کی سزا دی جائے گی، (حد کی نہیں)، جیسے کہ ان منکرات کے اظہار پر تعزیر کی سزا دی جاتی ہے، جن کا ان کی مذہبی کتاب کی رُو سے زبان سے اظہار کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

آنحضرتؐ اور آپ کے صحابہ نے جن شاتمانِ رسول کو قتل کیا یا قتل کا حکم دیا، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کو مصلحت و سیاست پر محمول کرتے ہیں تاکہ لوگ اس میں جری نہ ہو جائیں اور فتنے کا دروازہ نہ کھل جائے۔

ویحملون ما جاء عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ من القتل فی مثل ھذہ الجرائم علی انہ رأی المصلحۃ فی ذلک ویسمونہ القتل سیاسۃ وکان حاصلہ ان لہ ان یعزر بالقتل فی الجرائم التی تغلظت بالتکرار وشرع القتل فی جنسہا۔[۸۹]

اس قسم کے جرائم میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے جو قتل منقول ہے، وہ مصلحت پر مبنی ہے اور وہ اس کو ایسا قتل قرار دیتے ہیں جو سیاسی وجوہ کی بنا پر ضروری ہو، اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اس کو تعزیراً قتل کی سزا ان جرائم میں دی جائے گی، جن کا ارتکاب بکثرت و بتکرار کرنے سے، ان جرائم میں اضافہ ہو جائے، اور اس قسم کے جرائم میں قتل مشروع ہو۔

اس کے بعد امام ابنِ تیمیہ لکھتے ہیں:

وھذا افتی اکثرھم بقتل من اکثر من سب النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اھل الذمۃ وان اسلم بعد اخذہ، وقالوا، یقتل سیاسۃ وھذا متوجہ علی اصولھم۔[۹۰]

اسی بنیاد پر ان میں سے اکثر نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر ذمی کثرت سے آنحضرتؐ کو گالی دیتا ہے تو اس کو سیاستاً قتل کر دیا جائے، اگرچہ وہ گرفتاری یا مواخذہ کے بعد اسلام

۸۹ھ ایضاً ص ۱۰، ۱۱

۹۰ھ ایضاً ص ۱۱

قبول کرلے، اور یہ بات ان کے اصول کے مطابق ہے۔

حاصل کلام یہ کہ شاتم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باب میں اصولی طور پر ائمۂ اربعہ کا ایک ہی نقطۂ نظر ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ امام ابن تیمیہؒ نے کتاب و سنت، صحابۂ کرام اور ائمۂ دین کے اقوال وارشادات کی روشنی میں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ از روئے شریعت شاتمِ رسول قابلِ قتل ہے۔

۱۶۹- شیخ عبدالوہاب اکبرآبادی

شیخ عبدالوہاب اکبرآبادی، اکبرآباد (آگرہ) کے رہنے والے تھے، شیخ ابوالفتح مکّی اکبرآبادی کے بڑے لڑکے تھے اور شیخ بدھا کے عرف سے معروف تھے۔ حسنِ صورت اور عمدہ سیرت سے آراستہ اور دانش و بینش سے پیراستہ تھے۔ کتبِ درسیہ اور فنون کی تحصیل میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ بالخصوص تفسیر اور حدیث میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ شیخ مبارک بن شہاب الدین گوپاموی وغیرہ علما سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس اور افادۂ طلبا میں مصروف ہو گئے تھے۔ وعظ و تلقین سے گریزاں رہتے تھے۔ نیکی اور صالحیت کا یہ عالم تھا کہ ان کو دیکھ کر اور ان کی مجلس میں بیٹھ کر خدا یاد آتا تھا۔ بندگانِ خدا کے حالات و کوائف کے سوا دوسری باتوں میں بہت ہی کم دلچسپی لیتے۔ تاریخ و سیرت کے بے شمار عبرت آموز واقعات زبانی یاد تھے۔ ان واقعات کو بڑے ناصحانہ انداز میں بیان کرتے۔ جواں مردی اور سخاوت ان کے خمیر میں داخل تھی۔ اگر کوئی چیز پاس نہ ہوتی اور ضرورت مند آجاتا تو گھر کے مال اسباب میں سے جو کچھ ہاتھ پڑ جاتا، اہلِ خانہ سے چھپا کر اس کو دے دیتے۔ بسا اوقات لوگوں سے قرض لے کر بھی دوسروں کی ضرورتیں پوری کرتے۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ آگرہ کے حاکم نے ان کی ہمت اور وسعتِ قلبی کا امتحان لینے کے لیے باشندگانِ شہر کو حکم دے دیا تھا کہ اس درویش عالمِ دین کو کوئی شخص کچھ بھی بطور قرض نہ دے، کیوں کہ یہ سب کچھ غربا میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ مگر بایں ہمہ لوگوں نے نہایت تعجب کے ساتھ دیکھا کہ ان کے مہمان خانے کا خرچ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے اور ان کا دستر خوان مزید بہتر اور وسیع ہو گیا ہے۔ روزانہ بے شمار سائل ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کامیاب واپس جاتے۔ ان کے دروازے سے کبھی کوئی ناکام اور خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔

جہاں یہ علومِ ظاہری کے بہت بڑے عالم تھے، وہاں تصوف و طریقت کے بھی ماہر تھے چنانچہ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ذکر و شغل کی تلقین اور معارف و حقائق تصوّف کی تعلیم کا سلسلہ بھی ان کے ہاں جاری تھا۔

برصغیر پاک و ہند کے اس بلند کردار اور نامور صوفی نے ۴ شعبان ۹۷۰ھ کو آگرہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے[۵۸۹]

۱۷۰- مولانا عبدالوہاب کشمیری

مولانا عبدالوہاب بن مفتی فیروز حنفی کشمیری علاقہ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے عصر کے مشاہیر اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ دسویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کے معروف شیخ و عالم اور فقیہ تھے۔ علومِ حکمیہ میں بھی کامل عبور رکھتے تھے اور تصنیفی ذوق سے بھی بہرہ ور تھے۔ شرح شمسیہ اور شرح المواقف پر تعلیقات و حواشی تحریر کیے[۵۹۰]

---

[۵۸۹] اذکار ابرار ص ۲۸۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۲۲

[۵۹۰] حدائق الحنفیہ ص ۳۸۲ بضمن حالات مفتی فیروز کاشمیری — لطائف قدسی ص ۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۲۵

افسوس ہے اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

۱۷۱- مولانا عزیز اللہ ردولوی

مولانا عزیز اللہ بن اسماعیل بن صفی الدین بن نصیر الدین حنفی ردولوی، ردولی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ اپنے والد گرامی شیخ اسماعیل سے کتب درسیہ کی تحصیل کی۔ ایک عرصہ تک ان سے منسلک و ملازم رہے۔ یہاں تک کہ ان کا شمار اپنے دور کے جید علما میں ہونے لگا اور مسندِ تدریس پر فائز ہوئے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں یگانہ روزگار تھے۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے اخذِ علم کیا۔[91]

۱۷۲- مولانا عزیز اللہ تلنبی

مولانا عزیز اللہ تلنبی ملتانی حنفی المسلک تھے۔ اپنے دور کے بہت بڑے عالم، محقق، شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ مختلف علوم و فنون میں بے حد درک اور مہارت رکھتے تھے بلکہ کہنا چاہیے کہ اس ضمن میں درجہ امامت پر فائز تھے۔ نہایت ذہین و ذکی اور تیز فکر تھے۔ ساتھ ہی عابد و زاہد، متقی اور پرہیزگار بھی تھے۔ لوگوں سے بہت کم میل جول رکھتے تھے اور تنہائی پسند تھے۔ کتابوں پر نظر و استحضار کا یہ عالم تھا کہ تدریس کے وقت کتاب بینی اور مطالعہ کی قطعی ضرورت محسوس نہ کرتے اور مشکل سے مشکل مسائل نہایت آسانی سے کتاب دیکھے بغیر حل کر دیتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ امتحان کی غرض سے دقیق اور الجھے ہوئے مسائل لے کر علما و طلبا ان کے پاس آئے اور انھوں نے پوری تفصیل سے مسئلہ زیر بحث کی وضاحت کر دی۔ بے حد فیاض اور سخی تھے، طلبا پر بہت مہربان اور ان کے مشفق تھے۔ ان کی ضروریات خود فراہم کرتے۔

مولانا عزیز اللہ درحقیقت ضلع ملتان کے قصبہ تلنبہ کے رہنے والے تھے۔

---

۹۱ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۲۵۔

سکندر شاہ لودھی کے عہد میں دہلی گئے، وہاں سے عازمِ سنبھل ہوئے اور پھر وہیں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور عمر بھر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان سے بے شمار علما نے کسب علم کیا، جن میں شیخ نظام الدین خیر آبادی اور شیخ حاتم سنبھلی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔

مولانا عزیز اللہ تلنبی نے ۹۳۲ھ کو وفات پائی۔[۹۲]

۱۷۳۔ مولانا علاء الدین لاہوری

مولانا علاء الدین بن منصور لاہوری، مہدِ علم و فضل میں پیدا ہوئے اور معرفت و تصوف کے ماحول میں پرورش پائی۔ اپنے زمانے کے عالم و فاضل، شیخ اور برگزیدہ شخص تھے۔ علوم و فنون پر عمیق نگاہ رکھتے تھے اور اس ضمن میں اپنے اقران و معاصرین سے فائق تر تھے۔ تصنیفی اور تدریسی ذوق سے بہرہ ور تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ملا سعد اللہ تفتازانی کی شرح العقائد پر حاشیہ سپرد قلم کیا۔ عرصہ تک خان خاناں کی صحبت و رفاقت میں رہے۔ پھر بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر سے تقرب پیدا ہوا، اس نے ان کے علم و فراست اور عقل و دانش سے متاثر ہو کر اپنے ندماء و مصاحبین کی جماعت میں شامل ہونے کی درخواست کی، مگر انھوں نے انکار کر دیا اور تمام معاملاتِ دنیوی سے منقطع ہو کر درس و تدریس کو اپنا اصل مشغلہ قرار دے لیا۔ ان کی تمام مساعی طلبا کی خدمت کے لیے وقف تھیں۔ جو چیز کہیں سے حاصل ہوتی، طلبا کے حوالے کر دیتے، خود تکلیف اٹھاتے مگر اپنے تلامذہ کو حتی الامکان کسی تکلیف میں مبتلا نہ ہونے دیتے۔ ان کے لیے بے حد مہربان اور سخی تھے۔ زندگی کے آخری دور میں حجاز تشریف لے گئے۔ حج و زیارت کی سعادت حاصل

---

[۹۲] منتخب التواریخ ص ۸۶ — نزہتہ الخواطر، ج ۴ ص ۲۲۵، ۲۲۶ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۹، ۱۴۰۔

کی اور وہیں وفات پائی۔[۹۳]

۱۷۴۔ شیخ علی متقی بن حسام الدین برہان پوری

شیخ علی متقی بن حسام الدین بن عبدالملک بن قاضی خاں۔ ان کا لقب متقی تھا۔ ان کے آباو اجداد درحقیقت جون پور کے رہنے والے تھے، وہاں سے علاقہ دکن کے شہر برہان پور میں جاکر سکونت پذیر ہوگئے تھے۔

شیخ علی کی ولادت ۸۸۵ھ کو برہان پور میں ہوئی۔ انھوں نے عفت وطہارت کی گود اور زہد وتقویٰ کی آغوش میں پرورش پائی۔ ابھی سات آٹھ سال کی عمر کو پہنچے تھے کہ والدِ مکرم شیخ حسام الدین ان کو شاہ باجن چشتی کی خدمت میں لے گئے جو اس زمانے میں برہان پور میں مقیم تھے۔ باپ نے اپنے اس بچے کو ان کے حلقۂ ارادت میں داخل کرادیا۔ اس سے چند روز بعد والد بزرگ وار انتقال کر گئے، ان کے انتقال کے بعد علی کچھ عرصہ غیر علمی مشاغل میں مشغول رہے۔ نوجوانی کے زمانے میں مانڈو میں ایک بادشاہ کی ملازمت اختیار کرلی اور اس اثنا میں کچھ دولت بھی جمع کی۔ ملازمت کے دور میں ان پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ دنیوی معاملات سے نفرت پیدا ہوگی اور دنیا اور اس کی بے ثباتی کا ایسا نقش دل میں بیٹھا کہ ہر طرف سے دامن سمیٹ کر شاہ باجن کے لڑکے شیخ عبدالحکیم کی خدمت میں جا پہنچے۔ چوں کہ طبعی طور پر نیک تھے اور فطرت میں تقویٰ اور پرہیزگاری کے نشو ونما کا غلبہ تھا، لہٰذا ملتان کا قصد کیا اور وہاں شیخ حسام الدین متقی کے حلقے میں شامل ہوگئے۔ دو سال ان کے پاس رہے۔ اس عرصے میں ان سے تفسیر بیضاوی اور کتاب عین العلم کا مذاکرہ کیا۔ ملتان سے عازم حرمین شریفین ہوئے اور مکہ معظمہ کے شیخ الحدیث شیخ ابوالحسن شافعی بکری کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے احادیث کی کتابیں پڑھیں اور تصوف وطریقت کے بعض

---

[۹۳] منتخب التواریخ ص ۴۳۱۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۳۱

سلسلوں کا درس لیا۔ شیخ محمد بن محمد سخاوی مصری سے بھی اخذ طریقت کیا۔ اس اثنا میں حصولِ علم کی طرف بھی پوری توجہ مبذول کیے رکھی اور شیخ ابوالحسن شافعی بکری کے علاوہ شیخ شہاب الدین احمد بن حجر مکّی سے اخذِ علمِ حدیث کیا۔ عرصہ تک مکہ مکرمہ میں قیام رہا، وہاں پہلے تو خود حصولِ علم میں مشغول رہے، بعدازاں حدیث و تصوّف کے موضوع سے متعلق کتابوں کی تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔

قیام ملتان کے زمانے میں

قیامِ ملتان کے زمانے میں شیخ علی متقی کبھی ایک جگہ مستقل طور پر سکونت پذیر نہ ہوتے تھے۔ گرد و نواح کے مختلف علاقوں اور قصبوں میں گھومتے پھرتے رہتے۔ جہاں نیک اور متدین لوگوں کی چھوٹی بڑی جماعت دیکھتے، وہاں مقیم ہو جاتے اور اللہ کی عبادت اور ذکر و فکر کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ ان کا معمول تھا کہ سفر میں دو تھیلے اپنے ساتھ رکھتے۔ ایک میں ضروریات اور کھانے پینے کا سامان ہوتا، مثلاً چاول، ماش، تیل گندم، نمک اور کھانے پکانے کے لیے چند برتن وغیرہ۔ دوسرے میں قرآن مجید، چند کپڑے اور مطالعہ کی ضروری کتابیں۔ جنگل سے خود لکڑی کاٹتے اور اسی کو استعمال میں لاتے۔ دو دن کا سامان چار روز تک چلاتے۔ کبھی مسجد میں نہ ٹھہرتے، کرایہ کے مکان میں رہتے۔ وضو کے لیے لوٹا اور پانی کا مشکیزہ ساتھ رکھتے۔ سب کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ کسی سے اپنے ذاتی کام کے لیے نہ کہتے۔ اگر مجبور ہو کر کہتے بھی تو پہلے اس کو اُجرت عطا فرما دیتے۔

شیخ علی متقی جس زمانے میں ملتان میں قیام پذیر تھے، شیخ حسام الدین متقی ملتانی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدّث دہلوی لکھتے ہیں۔

دراں ہنگام کہ ایشاں بملتان در صحبت شیخ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ می بودند در خلوت نشستہ می بودند۔ شیخ حسام الدین کتاب ہا را بر سر خود نہادہ بدر حجرہ می آمدند و استیذان می نمودند و می گفتند، حسام آمدہ است چہ می فرمایند؟ یک دو بار ہمیں نوع می گفتند۔ اگر در حجرہ می کشادند، می نشستند و باہم مذاکرہ تفسیر بیضاوی می نمودند، آں مقدار کہ وقت خدمت شیخ اتساع داشت، می نشستند۔ و اگر در نمی

کشادہ، باز می گشتند ۹۴ھ

یعنی شیخ علی، اپنے ملتان کے قیام کے زمانے میں، جب کہ وہ شیخ حسام الدین کی صحبت میں رہ رہے تھے، خلوت نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شیخ حسام الدین کی کیفیت یہ ہوتی کہ وہ سر پر کتابیں اٹھائے، شیخ علی کے دروازے پر آکر کھڑے ہو جاتے اور اندر آنے کے لیے ان الفاظ میں اجازت طلب کرتے "حسام الدین حاضر ہے۔ کیا ارشاد ہے"؟ ایک دو بار اسی طرح کہتے۔ اگر شیخ حجرے کا دروازہ کھول دیتے تو وہ بیٹھ جاتے اور دونو اتنی دیر تک تفسیر بیضاوی کے بارے میں مذاکرہ فرماتے، جب تک کہ وقت کی گنجائش ہوتی۔ اگر شیخ حجرے کا دروازہ نہ کھولتے تو شیخ حسام الدین واپس تشریف لے جاتے۔

گجرات میں

شیخ علی متقی گجرات میں بھی مقیم رہے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو تختِ گجرات پر سلطان بہادر متمکن تھا۔ اس کو شیخ کے اوصاف و کمالات کا علم ہوا تو وہ ان کے حلقۂ معتقدین میں داخل ہو گیا — اس نے ان کو کئی دفعہ مختلف قسم کے انعامات سے نوازنا چاہا، اور جاگیریں عطا کرنے کی کوشش کی مگر شیخ نے ہمیشہ انکار کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب ان کے عقیدت مندوں کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کی صحبت میں بیٹھنے کو سعادت سمجھتے تھے۔ لیکن شیخ کا معمول یہ تھا کہ دروازہ بند کر کے حجرے میں بیٹھ جاتے اور کسی سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔ ان ہی دنوں سندھ کے ایک عالم و فاضل اور متقی و صالح بزرگ شیخ عبداللہ سندھی گجرات تشریف لائے۔ وہ حج کو جاتے ہوئے اپنے اہل و عیال سمیت چند روز کے لیے گجرات ٹھہرے۔ شیخ علی متقی سے ان کو بڑی عقیدت تھی۔ والیِ گجرات سلطان بہادر سے بھی ان کے مراسم تھے سلطان نے ان سے کہا، وہ شیخ علی سے ملاقات کرنے اور ہم کلام ہونے کا خواہاں ہے مگر وہ اس کا موقع نہیں دیتے۔ اگر شیخ اس کو حاضر خدمت ہونے کا شرف بخشیں تو ان کی عنایت

۹۴ھ اخبار الاخیار، ص ۲۵۹

ہو گی۔ شیخ عبداللہ نے شیخ علی متقی سے بات کی مگر شیخ نے معذرت کر دی۔ شیخ عبداللہ نے ان سے یہ بھی کہا، آپ سلطان سے بالکل ہم کلام نہ ہوں، خاموشی سے بیٹھے رہیں، ہم خود اس سے باتیں کرتے رہیں گے۔ شیخ نے فرمایا۔ بادشاہ کا لباس اور وضع قطع غیر شرعی ہے، یہ کیوں کر ممکن ہے کہ میں اس کو دیکھوں اور پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کروں۔ اس پر کچھ لوگوں نے عرض کیا کہ وہ خود مناسب الفاظ میں بادشاہ کو نصیحت کریں گے۔ آپ صرف یہ مہربانی فرمائیں کہ اس کو حاضر ہونے کی اجازت دے دیں۔ خاصی رد و قدح کے بعد سلطان کو حاضری کا موقع دیا گیا اور شیخ کے معتقدین نے اس کو وعظ نصیحت کی۔

اس ملاقات کے دوسرے دن سلطان نے ایک کروڑ "سکہ گجراتی بطور تحفہ شیخ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ تمام رقم شیخ نے شیخ عبداللہ سندھی کے حوالے کر دی اور فرمایا۔

چوں باعثِ ملاقات و واسطہ حصولِ ایں مبلغ شما بودید، ایں مبلغ ہم بشما تعلق داشتہ باشد[۹۵]

چوں کہ بادشاہ کی ملاقات آپ کی وساطت سے ہوئی اور وہ آپ کے ذریعے یہاں آیا تھا، اور اس رقم کے حصول کا باعث بھی آپ ہیں۔ لہٰذا اس کے حق دار آپ ہی ہیں۔

ایک وزیر کی دعوت میں شرکت

شیخ علی متقی سے ملوک و سلاطین اور وزرا و امرا بے حد عقیدت مندانہ جذبات رکھتے تھے اور ان کو اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دیتے اور اس پر اصرار کرتے تھے۔ مگر وہ ان کے گھر جانے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیتے۔

ایک مرتبہ ایک وزیر بے حد مصر ہوا کہ وہ اس کے مکان پر تشریف لے جائیں اور وہاں جا کر اس کے لیے دعا فرمائیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

یکے از وزرائے آں جا ایشاں را تکلیف ضیافت کرد، یک بار بہ خانہ بندہ تشریف

---

[۹۵] اخبار الاخیار، ص ۲۶۰

آرند تا در وی برکتے باشد۔ فرمودند مرا معذور دارید، ہم ازیں جا دعائے بکنیم، خدائے تعالیٰ شمارا برکتے دہد۔ چوں آں شخص بسیار کرد۔ فرمودند بعض می آیم، امّا بہ سہ شرط۔

یکے آں کہ ہر جا کہ خواہیم بنشینیم، مارا تکلیف نہ کنند کہ بالاتر بیایند و بر صدر نشینند، گفت ہم چنیں باشد۔ ہر جا کہ حضرت را خوش آید بنشینند۔

دوم آں کہ تکلیف نکنند کہ ایں بخورید و یا آں بخورید۔ ہر چہ مارا خوش آید بخورم۔

سوم آں کہ ہر گاہ کہ خوش آید برخیزم وبیایم۔ تکلیف نکنند کہ یک ساعت دیگر بنشینند[۹۶]

یعنی ایک دفعہ (مملکت گجرات کے) ایک وزیر نے شیخ کو دعوتِ طعام دی اور عرض کی کہ ایک بار غریب خانہ پر تشریف لے جا کر بندہ کو شکر گزار فرمائیں، اور دعائے برکت کریں۔ فرمایا، مجھے گھر پہ جانے سے معذور سمجھیے۔ فقیر یہیں بیٹھے ہوئے دعا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ برکت عطا کرے گا۔ لیکن اس نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا، میں آجاؤں گا مگر تین شرطوں کے ساتھ۔

پہلی شرط یہ ہے کہ جہاں چاہوں گا، بیٹھوں گا۔ آپ مجھے بلند جگہ پر اور صدر مقام پہ بیٹھنے کے لیے اصرار نہیں کریں گے۔ اس نے کہا، اسی طرح ہو گا۔ جہاں آپ کا جی چاہے، تشریف رکھیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اس پر اصرار نہ کیا جائے کہ یہ کھائیے اور وہ کھائیے۔ میں جو چاہوں گا، کھاؤں گا۔

تیسری یہ کہ جب چاہوں گا، آپ کی مجلس سے اٹھ کھڑا ہوں گا اور واپس آجاؤں گا۔ آپ اصرار نہ کریں گے کہ تھوڑی دیر اور ٹھہریے۔

اس سے آگے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رقم فرماتے ہیں:

---

۹۶ اخبار الاخیار، ص ۲۶۲

آں شخص ہمہ ایں شرائط از ایشاں قبول کرد و وعدہ کردند کہ فردا بیایم۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ چوں فردا شد، نان پارہ در خریطہ کہ دائم در گردن خود آویختہ می داشتند انداختند وتنہا بمنزل وے آمدند وہم نزدیک در بنشستند۔ آں مرد فرشہا بتکلف انداختہ وجائے ملوکانہ ساختہ بود۔ گفت ایں جا بنشینید، بالا بنشینید۔ گفتند آخر نہ شرط است کہ ہر جا کہ خوش آید بنشینیم۔ آں شخص ملزم شد۔ چیزے نتوانست گفت، گفتند زود باشید کہ وقت تنگ است۔ طعامہا کشیدند۔ ایشاں نانِ پارہ کہ داشتند از خریطہ خود بر آوردند وبخوردند۔ آں شخص التماس کرد کہ ازیں طعامہا چیزے بچشید۔ گفتند آں چناں بود کہ ہرچہ خوش آید بخوریم۔ دیگر برخاستند و وداع کردند کہ شرط بود ہرگاہ کہ خواہیم برآئیم۔ والسلام[۹۷]

اس وزیر نے شیخ کی یہ تینوں شرطیں منظور کرلیں تو فرمایا، ان شاء اللہ تعالیٰ، کل آئیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن روٹی کے چند ٹکڑے اس تھیلی میں ڈالے جس کو ہمیشہ گردن میں آویزاں رکھتے تھے اور تنہا اس وزیر کے گھر پہنچے اور دروازے کے قریب جاکر بیٹھ گئے۔ حالاں کہ اس نے بطریق شاہانہ بڑے تکلّف کے ساتھ فرش آراستہ کیے تھے اور شاہی انداز سے نشست کا انتظام کیا تھا۔ وزیر نے عرض کیا، یہاں تشریف رکھیے اور اونچی جگہ پر بیٹھیے۔ فرمایا شرط یہ طے پائی ہے کہ جہاں جی چاہے گا بیٹھیں گے۔ چنانچہ وہ شرط یاد کرکے خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد فرمایا۔ جلدی کرو، وقت بہت کم ہے، چنانچہ دسترخوان پر نوع بنوع کھانے چنے گئے لیکن شیخ نے اپنی تھیلی سے روٹی کے چند ٹکڑے نکالے اور کھانے لگے۔ وزیر نے بہت خوشامد کی کہ ان کھانوں میں سے بھی کچھ چکھیے۔ فرمایا، شرط یہ تھی کہ جو مرضی ہوگی، کھائیں گے۔ اس کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا، شرط یہ تھی کہ جب چاہیں گے، آجائیں گے۔ پھر السلام علیکم کہہ کر محل سے باہر نکل گئے۔

۹۷؎ اخبار الاخیار، ص ۲۶۲

حلال ذریعے کی کمائی ضائع نہیں جاتی۔

شیخ علی متقی جہاں بہت بڑے عالم وفقیہ تھے، وہاں تقویٰ وصالحیت میں بھی بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ فرمایا کرتے، حلال کے ذریعے جو چیز کمائی جائے وہ کبھی ضائع نہیں جاتی۔ اگر ایسی چیز گم بھی ہو جائے تو دوبارہ مل جاتی ہے۔

اس سلسلے میں وہ خود اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم چند آدمی سمندر کے سفر میں کشتی پر سوار تھے، اچانک سمندر میں طوفانی لہریں اٹھیں اور کشتی پاش پاش ہو گئی۔ ہم میں کے کئی آدمی ایک ایک تختے کے سہارے ساحل پر پہنچے۔ ہمارے پاس کتابیں بھی تھیں جو بالکل بھیگ گئی تھیں۔ سمندر سے باہر نکلنے کے بعد ہم لوگ پیدل سفر کر رہے تھے اور یہ عرب کی سرزمین تھی۔ پیدل سفر کی وجہ سے ان کتابوں کو ساتھ لے جانا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ ہم نے اللہ کا نام لے کر ایک گڑھا کھودا، اس میں کتابیں دفن کیں، اس پر ایک علامت قائم کی اور مکہ معظمہ کو روانہ ہو گئے۔ راستے میں سخت پیاس لگی مگر عرب کے صحرا میں پانی کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ رفقائے سفر نے شدتِ پیاس سے مجبور ہو کر کہا، اب وقتِ دعا ہے۔ میں نے کہا میں اللہ سے دعا کرتا ہوں، آپ آمین کہتے جائیے۔ چنانچہ دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور اتنا پانی برسا کہ ہم سب نے خوب جی بھر کر پیا اور اپنے مشکیزے بھی بھر لیے۔ چند روز بعد مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ کعبۃ اللہ کا طواف کیا اور صفا ومروہ کے درمیان سعی کی۔ اس اثنا میں چند دیہاتی عرب آئے اور انھوں نے ہم سے کہا، ہمارے پاس کچھ کتابیں ہیں۔ اگر آپ خریدنا چاہیں تو حاضر ہیں۔ ہم نے دیکھا تو وہی کتابیں تھیں جنھیں ہم جنگل میں دفن کر آئے تھے۔ ہم نے وہ کتابیں خرید لیں۔ بھیگ کر سوکھنے کی وجہ سے ان کے اوراق ایک دوسرے سے چپک گئے تھے ہم نے ان کو پانی لگا کر اس طرح الگ الگ کیا کہ ایک حرف بھی ضائع نہیں ہوا اور وہ سب دوبارہ قابلِ استفادہ ہو گئیں۔[۹۷]

---

[۹۷] اخبار الاخیار، ص ۲۶۳

سلطان محمود گجراتی کی عقیدت،

والیِ گجرات سلطان محمود، شیخ علی متقی کا بہت عقیدت مند تھا اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ لیکن چوں کہ وہ غیر مسنون لباس زیب تن کرتا تھا۔ اس لیے شیخ اس کی طرف نظرِ التفات اور عنانِ توجہ مبذول نہ فرماتے تھے۔ ایک روز وہ ملی کا سالباس پہن کر آیا تو شیخ نے اس کو رضامندی کی نگاہ سے دیکھا۔ اس سے سلطان بہت خوش ہوا، اور اپنے مکان پہ تشریف لے جانے کی درخواست کی تاکہ اس کے سب اہل خانہ شیخ کے نقش قدم پہ چلیں اور ان کے فرمان پہ عمل پیرا ہوں۔

منقول ہے کہ سلطان محمود پانی پینے میں بہت شکی مزاج تھا اور دیکھ دیکھ کر گلاس لبوں سے لگاتا اور گھونٹ حلق سے نیچے اتارتا تھا۔ شک کی یہ کیفیت اس کے دل سے نکلتی نہ تھی۔

شیخ علی متقی کو معلوم ہوا تو انھوں نے پانی سے بھرا ہوا ایک طشت منگایا، اس میں اپنی ٹوپی دھوئی اور پانی پھینک دیا۔ یہ عمل انھوں نے تین مرتبہ کیا۔ چوتھی مرتبہ اس طشت میں صاف و شفاف پانی بھروا کر سلطان سے فرمایا۔

بابا محمود! ایں آبِ است کہ در شریعت مطہرہ پاک ولطیف است و شک کردن دریں معنی از وسواس ست، و وسواس کارِ شیطان ست۔ ایں آب را بخورید و ہیچ شبہ را بخود راہ ندہید۔[۹۸]

بابا محمود! شریعتِ مطہرہ کی رُو سے یہ پانی پاک و صاف ہے۔ اس میں کسی قسم کا شک کرنا وسواس ہے اور وسواس شیطانی کام ہے۔ پانی پی لو اور کوئی وسوسہ دل میں نہ لاؤ۔

چنانچہ سلطان محمود نے وہ پانی پیا اور اس کے پیتے ہی سلطان کے دل سے وسوسے اور شک کی بیماری دُور ہو گئی۔

---

[۹۸] اخبار الاخیار، ص ۲۶۳

شیخ جب دوسری مرتبہ مکہ مکرمہ سے واردِ ہند ہوئے تو گجرات میں سکونت اختیار کی۔ ان دنوں گجرات کا فرماں روا سلطان محمود شاہ تھا، جو شیخ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ شیخ نے اس کو شریعت پر عمل پیرا ہونے اور ملک میں احکامِ شرع کے نفاذ کی تلقین کی۔ چناں چہ اس نے اپنے تمام وزرا و امرا کے نام حکم جاری کر دیا کہ خلافِ شرع رسوم وعوائد کو ختم کر دیا جائے اور مملکت میں حدودِ شرعی کی تنفیذ کی جائے۔

مکہ مکرمہ میں

شیخ طویل عرصہ تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے اور ان کی وفات بھی اسی ارضِ پاک میں ہوئی۔ شعرانی طبقاتِ کبریٰ میں لکھتے ہیں کہ ۹۴۷ھ میں مکہ مکرمہ میں شیخ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ میں ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ وہ کبھی میرے ہاں آتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ورع و تقویٰ اور زہد و عبادت کے زیور سے آراستہ عالمِ دین تھے۔ کم خوری بلکہ بھوک کی وجہ سے اس درجہ نحیف البدن تھے کہ جسم پر چند اوقیہ سے زیادہ گوشت نظر نہ آتا تھا۔ خاموشی اور عزلت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ صرف نمازِ جمعہ کے لیے گھر سے نکلتے اور حرم میں آتے۔ بیت اللہ کے ایک کونے میں آکر بیٹھ جاتے اور نماز سے فارغ ہو کر تیزی سے باہر نکل جاتے۔

شعرانی مزید لکھتے ہیں: میں ان کے گھر گیا۔ میں نے وہاں دیکھا کہ فقرائے صادقین کی ایک جماعت بیٹھی ہے۔ ان میں سے کوئی قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہے، کوئی مطالعۂ کتب میں مصروف ہے، کوئی متوجہ الی اللہ ہو کر عبادتِ الٰہی میں مستغرق ہے اور کوئی ذکر و مراقبہ کی کیفیت میں ہے۔ مکہ مکرمہ میں وہ اپنی نوعیت کی واحد مجلس تھی، جس سے میں بے حد متاثر ہوا۔

قیامِ مکہ کے دوران میں شیخ کی شہرتِ علمی اور ادائے عبادت و زہد دُور دُور تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں تک کہ ترکی کے عثمانی حکمران سلطان سلیمان کو بھی اس کا علم ہوا۔ وہ بڑا شجاع اور نیک خو بادشاہ تھا۔ وہ ان کے گوناگوں اوصاف سے مطلع ہوا تو اس کے دل میں ان کی قدر و منزلت نے کروٹ لی، اور اس نے ایک مکتوب کے ذریعے

ان سے دعائے خیر کی التجا کی۔

علمی و تصنیفی خدمات

شیخ علی متقی کی علمی اور تصنیفی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ یا تو مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے یا عبادت اور ذکرِ الٰہی میں اپنا وقت صرف کرتے۔ وہ قلیل النوم، قلیل الطعام اور قلیل الکلام بزرگ تھے۔ ہمہ وقت لکھنے پڑھنے میں مشغول رہنے کی وجہ سے ان کی جسمانی حالت اس درجہ کمزور ہو گئی تھی کہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچا ہو کر رہ گئے تھے۔ مکہ معظمہ چلے گئے تھے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کی تصنیفات کی تعداد سنو سے اوپر ہے، جن میں سے اہم اور مشہور کتابیں یہ ہیں:

۱۔ شئون المنزلات: یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ اس میں انھوں نے مستند اور مسلّمہ حوالوں سے مختلف آیاتِ قرآنی کے شانِ نزول اور محلِ نزول کا تذکرہ کیا ہے نیز بعض الفاظ و آیات کی نحوی اور لسانی نقطۂ نظر سے وضاحت کی ہے۔ یہ کتاب آیت بہ آیت پورے قرآن مجید کی تفسیر نہیں ہے، بلکہ صرف ان آیات کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہے، جو صرف و نحو، بیان و معانی اور سبب نزول کی وجہ سے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں اور جن کے مطالب کی وضاحت ان کے نزدیک ضروری تھی۔

۲۔ کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال: اہلِ علم میں شیخ علی متقی کی یہ ایک نہایت مشہور کتاب ہے۔ یہ کتاب کس طرح معرضِ تصنیف میں آئی، اس کو سمجھنا ضروری ہے۔ امام سیوطی نے ایک کتاب مرتب کی جس کا نام جمع الجوامع رکھا۔ یہ کتاب احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہترین مجموعہ ہے۔ اس کتاب کی ترتیب یہ رکھی تھی کہ تمام قولی احادیث، حدیث کے پہلے لفظ کے اعتبار سے اور فعلی احادیث، راویوں کے نام کے اعتبار سے مرتب کی گئی تھیں۔ یہ کتاب بہت ضخیم ہو گئی تھی، چنانچہ سیوطی نے الجامع الصغیر کے نام سے اس کو ملخص کیا، جس میں افعالِ رسول اللہ کو چھوڑ دیا اور صرف مختصر اقوالِ رسول ﷺ شامل کیے۔

شیخ علی متقی نے جمع الجوامع کی تمام احادیث کو کتبِ فقہ کی ترتیب کے مطابق مختلف عنوانات کے تحت مرتب کیا ۔ سب سے پہلے جامع الصغیر کی احادیث مرتب کیں اور اس کا نام منہاج العمال فی سنن الاقوال رکھا۔ اس کے بعد جمع الجوامع کی بقیہ قولی احادیث کو اکمال منہاج العمال کے نام سے ترتیب دیا۔ پھر اپنے دونوں مجموعوں کو ایک کتاب کی شکل دی اور اس کو غایۃ العمال کے نام سے موسوم کیا ۔ کچھ عرصہ بعد شیخ علی متقی نے جمع الجوامع کی فعلی احادیث کو بھی ایک مجموعہ کی صورت میں مرتب کیا اور اس کا نام مستدرک الاقوال رکھا۔ بعد میں انھوں نے ان تینوں مجموعوں کو یک جا کر دیا اور اس کو کنز العمال کے نام سے موسوم فرمایا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ کنز العمال شیخ کی وہ کتاب ہے جو غایۃ العمال اور مستدرک الاقوال کا مجموعہ ہے ، اور غایۃ العمال میں منہاج العمال فی سنن الاقوال اور اکمال منہاج العمال دونوں شامل ہیں۔

کنز العمال کی ترتیب یہ ہے کہ پوری کتاب چند حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ ہر حصے کا نام کتاب رکھا ہے اور ان کو حروفِ تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے۔ پہلا حصہ یا کتاب غایۃ الکمال پر مشتمل ہے جو کئی ابواب میں منقسم ہے۔ دوسرے حصے یا کتاب کے تحت مستدرک کو شامل کیا گیا ہے۔ غایۃ العمال میں پہلے منہاج اور اس کے بعد اکمال کو شامل کیا ہے۔ یہ دونوں الگ الگ کتاب کے تحت نہیں بلکہ کتاب کے ذیلی ابواب کے تحت شامل کی گئی ہیں۔

کنز العمال، آٹھ جلدوں میں حیدر آباد دکن (ہندوستان) میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کی فہرست مضامین نہایت عمدہ اور آسان ہے۔ تمام احادیث پر نمبر لگائے گئے ہیں۔ اس میں مندرج احادیث کی تعداد ۴۶۱۸۰ ہے ۔ حدیث کے مطالعہ اور حوالے کے لیے یہ بڑی مفید اور اہم کتاب ہے ۔ شیخ علی متقی کے استاذ شیخ ابوالحسن بکری شافعی اس کتاب کے بارے میں کہا کرتے تھے :

للسیوطی منۃ علی العٰلمین وللمتقی منۃ علیہ ۔

کہ امام سیوطی نے جمع الجوامع مرتب کر کے ساری دنیا پہ احسان کیا اور علی متقی نے کنز العمال کے نام سے اس کو دوبارہ ترتیب دے کر خود سیوطی پہ احسان کیا ہے۔

۳۔ تلخیص البیان فی علامات مہدی اخر الزمان: یہ کتاب بھی عربی زبان میں ہے اور ان احادیث کا مجموعہ ہے جو مہدی منتظر کے بارے میں مروی ہیں۔ اس کی وجہ تالیف سید محمد جون پوری (متوفی ۹۱۰ھ) کے معتقدین کو راہِ ہدایت دکھانا ہے، اس لیے کہ سید محمد جون پوری نے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا۔ یہ ان کی کوئی خاص تصنیف نہیں ہے بلکہ امام سیوطی کی عرف الوردی فی اخبار المہدی کی تلخیص ہے۔ سیوطی نے اس کو باقاعدہ مرتب اور ابواب میں تقسیم نہیں کیا تھا، شیخ علی متقی نے اس کو تراجم و ابواب میں مرتب کر دیا ہے۔ نیز اس میں سیوطی کی جمع الجوامع اور عقد الدرر فی اخبار المہدی المنتظر سے بھی بعض احادیث شامل کی گئی ہیں۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور تیرہ ابواب پر محتوی ہے۔ مقدمۂ کتاب میں شیخ علی متقی نے یہ وضاحت کی ہے کہ سید محمد جون پوری مہدی نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علی متقی، سید محمد جون پوری کو ولی تو مانتے تھے، مگر ساتھ ہی انھوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ بعض اوقات ولی بھی مرتکبِ خطا ہو جاتا ہے۔ مبرہ عن الخطا ہونا صرف انبیا علیہم السلام کا خاصہ ہے اس مجموعے میں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت احادیث مرتب کی گئی ہیں:

کراماتِ مہدی

اس کا سلسلۂ نسب

حلیہ

ظہورِ مہدی سے قبل کے حالات

علاماتِ مہدی

مہدی کی بیعت کس طرح کی جائے گی

معاونینِ مہدی

فتوحاتِ مہدی

حضرت عیسیٰ سے مہدی کی ملاقات
مہدی کے قیام کی مدت
وفات
مدعیانِ مہدویت کا ذکر
مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے علما کا فتویٰ۔

۴۔ جوامع الکلم فی المواعظ الحکم: یہ کتاب اخلاقی نصائح اور متصوفانہ اقوال پر مشتمل ہے۔ اس میں کم و بیش تین ہزار نصائح جمع کیے گئے ہیں، جن میں سے پانچ سو اقتباسات قرآن مجید سے درج کیے گئے ہیں۔ پانچ سو احادیث رسولِ اکرم سے ماخوذ ہیں اور ان کے ساتھ بطور تمہید ہم معنی تشریحی فقرات بھی مندرج ہیں۔ علاوہ ازیں تین سو اقوال ابوعطا اسکندری (متوفی ۷۰۹ھ) کے اور ایک سو اقوال ان کے شاگرد کے ہیں۔ باقی حصہ متقدمین کے اقوال کو محیط ہے۔

یہ تمام مواد مذکورہ بالا ترتیب کے مطابق تقریباً اسّی ابواب کے تحت حروفِ تہجی کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ کتاب صرف ان لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہے جو حافظ، مفسّر یا محدث ہیں۔ نیز تصوف سے بھی شغف رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ ان کی تصنیفات یہ ہیں، جن میں بعض تصوّف و سلوک کے موضوع سے متعلق ہیں اور بعض مختلف مسائل کے بارے میں بعض اہلِ علم کے جواب میں لکھی گئی ہیں:

البرہان الجلی فی معرفۃ الولی۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے
المواھب العلیۃ فی الجمع بین الحکم القرآنیۃ و الحدیثیہ
العنوان فی سلوک النسوان
تبویب شرح الحکم العطائیۃ المسمّٰی بالتنبیہ
زاد الطالبین
اسرار العارفین

نعم المعیار والمقیاس لمعرفۃ مراتب الناس۔
فتح الجواد
نظم الدرر
النہج الاتم فی ترتیب الحکم
الوسیلۃ الفاخرۃ فی سلطنۃ الدنیا والآخرۃ۔
تلقین الطریق۔
ایک رسالہ سید محمد جون پوری کے دعوی مہدویت کے ابطال میں ہے۔

تلامذہ

شیخ علی متقی کے تلامذہ و مسترشدین کا حلقہ بہت وسیع تھا، جن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ محمد بن طاہر پٹنی اور شیخ عبدالوہاب بن ولی اللہ خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔ شیخ عبدالحق دہلوی اور شیخ محمد بن طاہر پٹنی اسلامی ہند کے بہت بڑے عالم اور محدث و فقیہ تھے۔ یہ دونوں بزرگ متعدد کتابوں کے مصنف اور اپنے عصر کے عظیم انسان تھے۔ اسی طرح شیخ عبدالوہاب بھی اپنے دور کے جلیل القدر بزرگ اور بہت سے اوصاف و کمالات کے حامل تھے۔

شیخ کے حالات و سوانح میں عبدالقادر بن احمد فاکہی نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے، جو "القول النقی فی مناقب المتقی" کے نام سے موسوم ہے۔

وفات

شیخ علی متقی نے ستاسی اور ایک روایت کے مطابق نوّے برس کی عمر پاکر منگل کی شب، سحری کے وقت ۲ جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ کو مکہ مکرمہ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور صبح کو قبرستان معلاۃ میں دفن کیے گئے۔

ان کی تاریخ قرآن مجید کے ان الفاظ سے نکلتی ہے۔ قضی نحبہ [10]

---

[10] شذرات الذہب ج ۸ ص ۳۷۹ — اخبار الاخیار، ص ۲۵۷ تا ۲۶۹ —

۱۷۵- مولانا عمر جاجموی

مولانا عمر بن ابو عمر جاجموی حنفی المسلک تھے۔ اپنے عصر کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ تمام عمر درس و تدریس اور افادۂ طلبا میں مصروف رہے۔ شیخ محمد بن ابو سعید حسینی ترمذی کالپوی اور بہت سے علما و طلبا نے ان سے اخذِ علم کیا [۱]

دسویں صدی ہجری کی سرزمین ہند کے اس عالم و فقیہ کے حالات، افسوس ہے، اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکے۔

ف

۱۷۶- شیخ فخر الدین اکبر آبادی

شیخ فخر الدین بن داؤد بن شیخ شاہ صدیقی اکبر آبادی، صالح عالم دین اور

مرآت سکندری ص ۲۹۶ — خزینۃ الاصفیا، ج ۱ ص ۴۲۹ تا ۴۳۱ — مفتاح التواریخ ص ۱۷۷ — ابجد العلوم ص ۸۹۵ — ماثر الکرام، ج ۱، ص ۱۷۶ تا ۱۷۹ — تاریخ برہان پور، ص ۱۱۶ تا ۱۱۹ — مرآت احمدی ص ۸۵ تا ۸۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۴۳۲ تا ۴۴۲ — رود کوثر، ص ۳۵۳ تا ۳۵۵ — سبحۃ المرجان ص ۴۳ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۶، ۱۴۷ — ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۲۴۶، ۲۴۷ — معجم المؤلفین ج ۷ ص ۵۹، ج ۱۳ ص ۴۰۶ — حدائق الحنفیہ ص ۳۸۲، ۳۸۳ — اتحاف النبلاء، ص ۳۲۶، ۳۲۷ — کشف الظنون ج ۱ ص ۹۹۷ — کشف الظنون ج ۲ ص ۱۵۱۸، ۲۰۳۰ — الاعلام ج ۵ ص ۷۹، ۱۲۴ — النور السافر ص ۳۱۴ تا ۳۰۹ — اذکار ابرار ص ۴۰۲، ۴۰۳ — ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون — یاد ایام ص ۴۰۔

[۱] نزہۃ الخواطر، ج ۱ ص ۲۵۰۔

شیخ زمان تھے۔ ان کا شمار اُس دَور کے زہاد و عباد فقہا اور بلند مرتبت علما میں ہوتا تھا۔ شیخ حسام الدین متقی ملتانی اور شیخ اللہ داد بن صالح سرہندی سے تحصیل علوم کی۔ پھر بہار گئے، وہاں شیخ اللہ داد چند ھوسی بہاری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اخذِ فیض کیا۔ بعد ازاں اس دَور کے مشہور بزرگ سید جمن ہلسوی سے منسلک ہوئے اور ان سے استفاضہ کیا۔ پھر آگرہ کا قصد فرمایا اور سید رفیع الدین محدث کے جوار میں سکونت اختیار کی۔

دیارِ ہند کے اس عالم و فقیہ نے ایک سو سینتالیس (۱۴۷) سال عمر پا کر جمعہ کے روز ۱۹ جمادی الاخریٰ ۱۰۰۷ھ کو آگرہ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[۱]

۱۷۷۔ شیخ فخر الدین جون پوری

شیخ فخر الدین بن کبیر الدین جون پوری، جون پور میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اپنے عصر کے مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ــــــ عابد و زاہد اور عالم و فقیہ تھے۔ تصوّف و طریقت سے بھی گہرا لگاؤ تھا اور سلسلۂ سہروردیہ سے تعلق رکھتے تھے بلکہ سلسلۂ تصوّف کے مشائخ میں سے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دس سال تک درس و تدریس اور افادۂ طلبا میں مصروف رہے۔ پھر خدمتِ دین کے اس پہلو سے کنارہ کش ہو کر زہد و عبادت میں مشغول ہو گئے۔ ان سے فیض حاصل کرنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے ۲۴ شعبان ۹۹۴ھ کو وفات پائی۔[۲]

۱۷۸۔ قاضی فضل اللہ دیوبندی

قاضی فضل اللہ دیوبند کے رہنے والے تھے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے۔

---

[۱] اذکارِ ابرار ص ۲۸۱ تا ۲۸۳ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۵۶

[۲] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۵۷ بحوالہ گنج ارشدی

شیخِ وقت اور عالم کبیر تھے۔ دسویں صدی ہجری کے مشاہیر فقہا میں سے تھے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے معاصر تھے[۳]۔

افسوس ہے اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

۱۷۹۔ مولانا فضل اللہ رہتکی

مولانا فضل اللہ درحقیقت ہندوستان کے علاقہ گجرات کے باشندے تھے۔ اپنے عصر کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ حنفی المسلک تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ کسی زمانے میں ترکِ وطن کر کے گجرات سے نکلے تو اثنائے سفر میں مشرقی پنجاب کے شہر رہتک کے مقام پر پہنچے۔ وہاں سے آگے نہ بڑھ سکے، مجبوراً وہیں بود و باش اختیار کرنا پڑی اور نسبت وطن کے اعتبار سے رہتکی مشہور ہوئے۔ اس نواح کے بے مثل عالم دین تھے۔ متوکل علی اللہ اور عبادت گزار تھے۔ ہر وقت اللہ کی یاد میں مشغول رہتے۔ کسی سے کوئی چیز قبول نہ کرتے۔ کہتے ہیں، ایک تاجر ان کے مریدوں میں سے تھا۔ ایک روز اس نے اپنا تمام اثاثہ اٹھایا اور شیخ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مگر انھوں نے قبول کرنے سے معذرت کر دی اور کسی شے کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس ذی علم اور صاحبِ تصوّف بزرگ نے دسویں صدی ہجری کے نصف اوّل میں وفات پائی[۴]۔ اس سے زیادہ نہ ان کے حالات کا علم ہو سکا ہے اور نہ ان کی علمی اور تدریسی سرگرمیوں کا پتا چل سکا ہے۔

ق

۱۸۰۔ شیخ قاسم بن یوسف سندھی

شیخ قاسم بن یوسف بن رکن الدین بن شہاب الدین شہابی سندھی، سرزمین

---

[۳] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۵۹ بحوالہ لطائف قدوسی

[۴] اذکار ابرار ص ۲۰۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۴، ص ۲۵۹

سندھ میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اسی نواح میں تحصیل علم کی۔ پھر ۹۵۰ھ میں سندھ سے گجرات گئے اور مختلف بلاد و امصار میں گھومے پھرے۔ حدیث اور فقہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ درس و تدریس اور افادۂ علما و طلبا ان کا مشغلہ تھا۔ ان سے خلقِ کثیر نے اخذِ علم کیا، جن میں عیسیٰ بن قاسم بھی شامل ہیں۔ وہ بعض کتابوں کے مصنف تھے، لیکن ان کتابوں کے ناموں کا علم نہیں ہو سکا۔ انھوں نے ۹۸۰ ہجری میں وفات پائی۔[1]

۱۸۱۔ مولانا قاسم دیوان سندھی

مولانا قاسم دیوان سندھی، عظیم المرتبت عالم اور شیخ تھے۔ حنفی المسلک تھے اور ان کا شمار اس دور کے مشہور فقہا میں ہوتا تھا۔ شیخ میران سندھی سے علم حاصل کیا۔ علم معانی و بیان کی معروف کتاب ،مطول ان ہی سے پڑھی۔ بعد ازاں مزید تحصیل کے لیے ارضِ فارس کا قصد کیا۔ وہاں کے علما سے خوب استفادہ کیا۔ پھر اپنے وطن واپس آگئے اور درس و افادۂ طلبا کے لیے کمر ہمت باندھی۔

اپنے دور کے بہت بڑے مدرس اور عالم دین تھے۔ ان کی فراوانیِ علم و فضل کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب سلطان محمود خاں حکومت سیوی پر مامور ہوا تو اس نے مولانا قاسم دیوان کو اپنی رفاقت کے لیے منتخب کیا، ان سے باقاعدہ قرآن مجید پڑھا اور بعض دیگر کتابوں کے لیے بھی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مولانا ممدوح بھکر میں مقیم تھے اور وہاں اشاعتِ علم کرتے تھے۔

دسویں صدی ہجری کے جن علما و فقہا کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ مولانا قاسم دیوان سندھی بھی ان ہی میں شامل ہیں۔ ان کا سالِ وفات ۹۷۷ھ ہے۔[2]

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۶۲ بحوالہ بحر زخار

[2] مآثر رحیمی ج ۲ ص ۳۳۸ ـ تاریخ معصومی ص ۲۳۳ ـ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۶۳

۱۸۲- قاضی قاضن بھکری سندھی

قاضی قاضن بن ابوسعید بن زین الدین بھکری، عالم وفقیہ اور شیخ وقت تھے۔ شہر بھکر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا، اور قرأت و تجوید سیکھی۔ پھر حصولِ علم میں مشغول ہو گئے، اور تفسیر، حدیث، فقہ، تصوّف، علومِ عربیہ اور انشا وغیرہ میں مہارت پیدا کی، یہاں تک کہ ان کا شمار اپنے دور کے جلیل القدر علما، عظیم المرتبت فقہا اور مشہور شیوخ میں ہونے لگا۔

قاضی قاضن سفر و سیاحت کے بہت شائق تھے۔ حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ وہاں سے مختلف بلاد و امصار کی راہ لی اور متعدد مشائخ و علما سے ملاقات کی، ان کے فیضِ صحبت سے مستفیض ہوئے اور علم و ادراک کی نعمت حاصل کی۔ بعد ازاں واپس سندھ آئے تو والیِ سندھ مرزا شاہ حسین نے ان کو شہر بھکر کا قاضی مقرر کر دیا۔ ایک عرصہ تک اس منصب پر فائز رہے۔ پھر مدعیِ مہدویت سید محمد جون پوری کے حلقۂ متبعین میں داخل ہو گئے مگر علما نے اس پر ان کو مطعون گردانا۔ اور مرزا شاہ حسین نے انھیں عہدۂ قضا سے معزول کر دیا۔ ایک روایت کے مطابق خود ہی کبر سنی کی بنا پر اس منصب سے مستعفی ہو گئے تھے اور ان کی جگہ ان کے برادرِ صغیر قاضی نصر اللہ کو قاضی مقرر کر لیا گیا تھا۔

قاضی قاضن امرائے سندھ کے نزدیک انتہائی قابلِ احترام شخصیت تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب ۱۱ محرم ۹۲۶ھ کو ٹھٹھہ کے مقام پر جام فیروز اور امیر شاہ بیگ کے درمیان جنگ ہوئی اور شاہی بیگ اس میں فتح یاب ہوا تو ۲۰ محرم تک اس کا لشکر ٹھٹھہ میں لوٹ مار اور قتل و غارت کرتا رہا۔ اس اثنا میں بہت سے معزز گھرانوں کے اہل و عیال اسیر ہوئے۔ جام فیروز کے بیٹے بھی شہر میں رہ گئے تھے۔ چنانچہ شاہی بیگ کو اس کا پتا چلا تو اس نے چند ممتاز لوگوں کو جام فیروز کی حویلی پر ان کی حفاظت کے لیے مامور کیا اور ان کی بدرجہ غایت عزت کی اور ان کی حفاظت کا اہتمام کیا۔

شہر میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا جو بازار گرم تھا، وہ اس وقت کے جید عالم اور معروف فاضل قاضی قاضن کی کوشش سے سرد ہوا۔ خود قاضی موصوف کے اہل و عیال کو بھی گرفتار کر کے زنداں میں ڈال دیا گیا تھا اور یہ ان کی تلاش کے لیے شہر ٹھٹھہ کے گلی کوچوں میں دیوانوں کی طرح گھومتے پھرتے تھے۔ لیکن جب وہ ان کو تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو ایک خط میں ٹھٹھہ کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا۔ یہ خط حافظ محمد شریف امام نے شاہی بیگ کو پیش کیا، وہ اس سے بہت متاثر ہوا، اور اس نے منادی کرا دی کہ آئندہ ٹھٹھہ کے مال و اسباب کو کوئی شخص ہاتھ نہ لگائے اور نہ کسی کو قتل کرے۔ اس کے بعد اپنے ترکش میں سے ایک تیر نکال کر قاضی کے حوالے کیا اور اپنے آدمی ان کے ساتھ بھیج کر حکم دیا کہ جس شخص کی طرف یہ اشارہ کریں، اسے ان کے حوالے کر دیا جائے۔[۵۳]

شاہی بیگ ان کی اس درجہ تکریم کرتا اور ان پر اعتماد کرتا تھا کہ اس نے ایک موقع پر ان کو دریا خاں کے بیٹے محمود کے پاس بھیجا تاکہ وہ اسے وعظ و نصیحت کے ذریعے اس کی مخالفت سے روکیں، لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو ان لوگوں نے ان سے ملنا تک گوارا نہ کیا۔[۵۴] قاضی قاضن نے ۹۵۸ھ میں وفات پائی۔[۵۵]

ک

۱۸۳۔ شیخ کبیر الدین جون پوری

شیخ کبیر الدین بن جہاں گیر جون پوری، صالح عالم دین اور مشہور مشائخ میں

---

۵۳ تاریخ معصومی ۱۵۵، ۱۵۶۔ تحفۃ الکرام ص ۱۷۵۔ مآثر رحیمی ج ۲ ص ۲۹۱

۵۴ تاریخ معصومی ص ۱۵۹

۵۵ تاریخ معصومی ص ۲۷۶، ۲۷۷۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۶، ۱۶۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۶۵، ۲۶۶۔ تحفۃ الکرام ص ۳۳۴۔ اذکار ابرار، ص ۲۷۵

سے تھے۔ فقہ اور تصوّف میں یگانہ روزگار، پیکر زہد و قناعت اور مجسمہ ایثار و توکل تھے۔ ابھی بارہ سال کی عمر کو پہنچے تھے کہ والدِ مکرم انتقال کر گئے۔ ان کے بعد حصولِ علم کی طرف متوجہ ہوئے اور فضل و کمال میں مرتبہ بلند تک پہنچے۔ یہاں تک کہ جون پور کی مسندِ مشیخت پر فائز ہوئے۔

۶۳

شیخ کبیر الدین سے بہت سے علما و مشائخ نے کسبِ فیض اور اخذِ علم کیا۔ تریسٹھ سال عمر پا کر ۲۸ شعبان ۹۶۲ھ کو اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔[1]

۱۸۴۔ مولانا کریم الدین سندھی

مولانا کریم الدین سندھی، دسویں صدی ہجری کے علاقہ سندھ کے عالم و فاضل اور شیخ تھے۔ حنفی المسلک تھے اور ٹھٹھہ کے رہنے والے تھے۔ فقہ و اصول، منطق و حکمت اور نحو و لغت میں مہارت رکھتے تھے اور اپنے دَور کے نامور علما میں سے تھے۔ ورع و تقویٰ میں بھی عدیم المثال تھے۔ تمام عمر درس و تدریس اور افادۂ طلبا میں مصروف رہے۔[2]

م

۱۸۵۔ شیخ مبارک بنارسی

شیخ مبارک بن ارزانی عمری بنارسی، اپنے دَور کے عالم و فاضل اور محدّث تھے۔ ان کا اصل وطن مشرقی پنجاب کا شہر رہتک تھا، وہاں سے ان کے آبا و اجداد بنارس منتقل ہو گئے تھے، اور اس کے جنوب میں ایک قریہ میں سکونت اختیار

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۷۳ بحوالہ گنج ارشدی۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۶۶۹۔

[2] تاریخ معصومی ص ۲۹۸۔ تحفۃ الکرام ص ۶۶۰۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۷۴، نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۷۴۔

کرلی تھی، جس کا نام بکھرہ تھا۔ شیر شاہ سوری اور اس کے بیٹے سلیم شاہ سوری کے عہد میں یہ عرصہ تک مسندِ وزارت پر فائز رہے۔ علمِ حدیث میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ ماہِ رجب ۹۵۲ھ میں مدارج الاخبار کے نام سے ایک کتاب مرتب کی، جو حدیث کے بارے میں ہے۔ اس میں انھوں نے شیخ حسن صغانی لاہوری کی مشہور کتاب مشارق الانوار کی احادیث کو مصابیح کے انداز سے ترتیب دیا۔

شیخ مبارک بنارسی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ انھوں نے ۹۸۰ھ میں وفات پائی۔[1]

۱۸۶۔ قاضی مبارک گوپاموی

قاضی مبارک بن شہاب الدین بن علاء الدین عمری گوپاموی، شیخ مبارک ناصحی بلخی کی اولاد سے تھے۔ گوپامئو میں پیدا ہوئے اور وہیں علم و تصوّف کی گود میں تربیت پائی۔ شیخ نظام الدین امیٹھوی سے علم حاصل کیا اور عرصہ تک ان سے منسلک رہے۔ ان کی نیکی اور حصولِ علم میں رغبت کی بنا پہ شیخ ان سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اپنے عصر کے عالم اور فقیہ تھے۔ صوفی اور صاحبِ طریقت بھی تھے۔ گوپامئو کے منصب قضا پر متعین تھے۔ کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالمِ دین تھے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا، جن میں شیخ عبدالوہاب بن ابوالفتح اکبر آبادی اور شیخ محی الدین حسینی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ جلیل القدر عالم و فقیہ تھے جو تمام عمر مسندِ قضا پر فائز رہے اور زندگی کے آخری لمحے تک طلبا کو درس دیتے رہے۔[2]

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۷۷، ۲۷۸ بحوالہ گنج ارشدی۔

[2] منتخب التواریخ ۳۲۳ — تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۷۴ — نزہۃ الخواطر ج ۴، ص ۲۷۹۔

۱۸۷۔ شیخ مبارک جھنجھانوی

شیخ مبارک بن عبد المقتدر بن فاضل علوی جھنجھانوی ثم جون پوری اپنے زمانے کے فقیہ تھے اور علم و فضل اور زہد و طریقت کی دولت سے مالا مال تھے۔ چونکہ تصوف میں مقام عالی پر فائز تھے، اس لیے بالادست کے لقب سے معروف تھے یعنی شیخ مبارک بالادست۔ شیخ عبد الرزاق جھنجھانوی کے بھتیجے اور رضاعی بھائی تھے شیخ علی بن قوام الدین شطاری جون پوری سے علم طریقت حاصل کیا اور طویل عرصہ تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے، اس لیے جون پوری کہلائے۔ اس عالم و فقیہ کی زادبوم بھی جھنجھانہ ہے اور خواب گاہ بھی وہیں ہے[۵۳]

۱۸۸۔ شیخ مبارک سندھی

شیخ مبارک بن ابو المبارک پاتری سندھی، علاقہ سندھ کے ایک مقام موضع پاتر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ شیخ عباس بن جلال سندھی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور طویل مدت تک ان کی خدمت میں رہے، یہاں تک کہ فقہ، اصول، کلام اور علوم عربیہ میں مہارت حاصل کی۔ بعد ازاں نوشتۂ تقدیر نے احمد آباد میں لا ڈالا۔ وہاں ناصر الملک کی مسجد میں سکونت پذیر ہوئے اور عرصہ تک مسندِ تدریس پر فائز رہے۔ پھر برہان پور تشریف لے گئے اور قصبہ چوپڑہ کے منصب قضا پر متعین ہوتے۔ کئی سال یہ عہدہ ان کے سپرد رہا۔ ان دنوں صوبہ برار کا وزیر اعظم تفاول خاں تھا۔ اس کے کہنے پر ایلچ پور کا قصد کیا۔ تفاول خاں ان کا بہت مداح تھا اور بے حد احترام کرتا تھا۔ اس نے ان کو ایلچ پور کی مسندِ تدریس پیش کی، جس پر خاصا عرصہ متمکن رہے۔ پھر عازم علاقہ گجرات ہوئے۔ وہاں شیخ لشکر محمد عارف سے اخذِ طریقت کیا، وہاں سے

---

۵۳ اذکار ابرار، ص ۲۳۶ ــ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۷۹

دوبارہ برہان پور گئے۔ اپنے وقت کے عالم وفاضل اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔ خوف الٰہی سے ہر آن آنکھوں سے آنسو جاری رہتے۔ شب و روز بے داری میں کٹتے اور ہر وقت اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے۔ بے دار رہنے سے یوں سمجھیے کہ ان کے نزدیک شب ہم رنگِ دن ہوگئی تھی۔ ان کے اور شیخ طاہر بن یوسف سندھی کے درمیان گہری اور پکّی دوستی تھی۔

شیخ مبارک سندھی کے حلقۂ تلامذہ میں اس زمانے کی مشہور علمی شخصیتوں کے نام تذکروں میں مرقوم ہیں، جن میں شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی کا اسم گرامی بھی موجود ہے۔ یہ ان کے برہان پور کے دورِ قیام کے تلمیذ ہیں۔ انھوں نے ان سے علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ شیخ مبارک نے ۹۷۸ھ کو جمعہ کے روز وفات پائی اور شیخ ابراہیم بن عمر سندھی کے حظیرہ میں مدفون ہوئے۔[۵۴]

۱۸۹۔ شیخ مبارک الوری

شیخ مبارک بن ابو المبارک الوری حنفی المسلک تھے اور دسویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کے نامور عالم وفقیہ تھے۔ زہد وصلاح کے زیور سے آراستہ تھے۔ منقول ہے کہ وہ اولادِ بنی ہاشم سے تھے۔ اسی وجہ سے افغانوں میں انھیں بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ خود سلطان سلیم شاہ سوری ان کی مجلس میں حاضر ہوتا، ان سے دعا و برکت حاصل کرتا اور اپنے ہاتھوں سے ان کی جوتیاں ان کے سامنے رکھتا تھا اور احتراماً انھیں شاہ مبارک کہا کرتا تھا۔

افغانوں کے نزدیک شیخ مبارک الوری کی عزت و توقیر کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ جب شیخ سلیم بن بہاء الدین چشتی سیکری، افغانوں کے ہاتھوں مبتلائے آلام ہوئے اور انھیں رنتھنبور کے قلعہ میں محبوس کیا گیا تو انھوں نے شیخ سلیم کی سفارش

---

۵۴ اذکار ابرار، ص ۳۱۵، ۳۱۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۸۰، ۲۸۱

کی جس کے نتیجے میں انھیں قید سے رہائی حاصل ہوئی اور وہ دوبارہ عازم مکہ مکرمہ ہوئے۔

مُلا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے ۹۸۷ھ میں ان کو دیکھا تھا۔ ان کی صحیح تاریخ وفات کا تو علم نہیں ہو سکا، مگر بقول بدایونی کے وہ نوّے سال عمر پا کر تقریباً اسی زمانے میں فوت ہوئے جس زمانے میں ان کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔[۵۵]

۱۹۰- شیخ محب اللہ سدھوری

شیخ محب اللہ کا سلسلہ نسب یہ ہے: محب اللہ بن خواجگی بن خیرالدین بن علی بن نظام الدین انصاری ہروی۔ ثم ہندی سدھوری۔ ان کے اسلاف دراصل ایران کے شہر ہرات کے باشندے تھے اور وہاں سے واردِ ہند ہوئے تھے۔ یہاں آکر انھوں نے علاقہ اودھ کے ایک بڑے قریہ سدھور میں سکونت اختیار کی۔ شیخ محب اللہ کی ولادت اسی گاؤں میں ہوئی۔ انھوں نے یہیں پرورش پائی اور اپنے والد سے تحصیلِ علم کی۔ ان کے والد مولانا خواجگی اپنے عصر کے معروف عالمِ دین تھے۔ یہ طویل عرصہ تک ان سے وابستہ رہے اور ان سے خوب فیض حاصل کیا۔ مولانا خواجگی تصوّف و طریقت سے بھی بہرہ ور تھے، شیخ محب اللہ کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہوئی اور یہ علم بھی ان سے اخذ کیا۔ والد کی وفات کے بعد ان کی جگہ مسندِ مشیخت پر فائز ہوئے۔ شیخ محب اللہ سدھوری اپنے علاقے کے مسلمہ اور مشاہیر فقہا میں سے تھے۔ ان سے خلقِ کثیر نے استفادہ کیا۔[۵۶]

۱۹۱- علامہ محمد بن احمد فاکہی

علامہ محمد بن احمد بن علی فاکہی مکی کی کنیت ابوالسعادات تھی، اور یہ ابوالسعادات

---

۵۵ منتخب التواریخ ص ۳۱۵، ۳۱۶ — نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۸۱

۵۶ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۸۲

گجراتی کے نام سے معروف تھے۔ بہت بڑے عالم اور شیخ وقت تھے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے حنبلی تھے۔ عبدالقادر حضرمی نے النور السافر میں انھیں کبار علما میں سے گردانا ہے۔

علامہ محمد بن احمد ۹۲۳ھ میں پیدا ہوئے اور مذاہب اربعہ کے مسائل و احکام کی تمام کتابیں دقت نظر سے پڑھیں۔ یہی وجہ ہے کہ علوم مروجہ پر انھیں پوری دسترس حاصل تھی۔ ان کے شیوخ میں اکابر علما اور مشاہیر وقت محققین شامل ہیں، جن میں علامہ ابوالحسن بکری، شیخ ابن حجر ہیثمی اور شیخ محمد بن خطاب کے اسمائے گرامی لائق تذکرہ ہیں۔ انھوں نے مکہ مکرمہ، حضرموت اور زبید وغیرہ کے اساتذہ سے اخذ علم کیا۔ کہتے ہیں جن اہل علم کے سامنے انھوں نے زانوئے تلمذ تہ کیا اور سند و اجازہ سے بہرہ ور ہوئے، ان کی تعداد نوّے (۹۰) سے زائد ہے۔ انھوں نے باقاعدہ اساتذہ سے اتنی کتابیں پڑھیں کہ ان کو حیطۂ شمار میں لانا ناممکن ہے۔ جو کتابیں حفظ یاد کیں، ان میں اربعین نوویہ، عقائد نسفیہ، فقہ حنبلی کی المقنع، اصول فقہ کی جمع الجوامع، علم نحو کی الفیہ ابن مالک، معانی و بیان کی تلخیص المفتاح، فن قرأت کی الشاطبیہ اور سیر و تاریخ سے متعلق ابن سید الناس کی نور العیون، شامل ہیں۔ قرآن مجید کے حافظ تھے۔ اور قرأت سبعہ کے ساتھ تجوید سے پڑھتے تھے۔

علامہ موصوف، بہت اچھے مصنف بھی تھے۔ انھوں نے کئی عمدہ رسائل تصنیف کیے، جن میں ایک آیۃ الکرسی کے متعلق ہے۔ اس میں انھوں نے آیۃ الکرسی کے متعلق بعض نہایت مفید نکات بیان کیے ہیں۔ ایک کتاب فقہ شافعی کے موضوع پر ہے، جس کا نام نور الابصار ہے۔ یہ کتاب مختصر الانوار کی شرح ہے۔ ایک رسالہ لغت کے بارے میں ہے۔ ایک بڑی اہم کتاب سلاطین کے متعلق ہے۔

بہت خوش مزاج اور حاضر جواب عالم تھے۔ خود بیان کرتے ہیں کہ میں وزرا کی ایک مجلس میں بیٹھا تھا کہ استفہام انکاری کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔

ایک اہلِ علم نے اس کی مثال دیتے ہوئے بطور طنز و تعریض کے میری طرف اشارہ کر کے یہ آیت پڑھی :

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ۵۷

مَیں اس کی تعریض کو فوراً سمجھ گیا اور جلدی سے اس کو مخاطب کر کے یہ آیت پڑھی اور کہا، استفہام انکاری یہ ہے۔

اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ط فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ط اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ ۵۸

یہ آیت سن کر وہ صاحب بڑے شرمندہ ہوئے۔

صاحبِ النور السافر عبدالقادر حضرمی کہتے ہیں، شیخ محمد بن احمد کو میرے والد شیخ الاسلام کے نام سے یاد فرماتے تھے۔ وہ بہت فراخ دست اور سخی تھے کچھ لوگوں کا کہنا ہے، کوئی شخص ان سے زیادہ سخی نہ تھا۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ جو عالم سرزمینِ عرب یا کسی اور ملک سے آتا، اس کی ہر ممکن طور پہ امداد کرتے اور کوئی شے اس سے چھپا کر نہ رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت مقروض رہتے تھے۔

---

۵۷ سورہ البقرہ آیت ۴۴۔ ترجمہ : یہ کیا بات ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو فراموش کر دیتے ہو، حال آنکہ تم (اللہ کی) کتاب بھی پڑھتے ہو۔ کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟

۵۸ سورۃ الجاثیہ۔ آیت نمبر ۲۳۔ ترجمہ : بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور باوجود جاننے بوجھنے کے (گمراہ ہو رہا ہے تو) خدا نے (بھی) اس کو گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پہ پردہ ڈال دیا۔ اب خدا کے سوا کون اس کو راہ ہدایت پر لا سکتا ہے۔ بھلا تم کیوں نصیحت نہیں پکڑتے ہو؟

دوسروں کی امداد کے لیے لوگوں سے اس منت وسماجت سے قرض لیتے کہ ان کے بعض رفقا اسے تملق سے تعبیر کرتے۔

وہ پہلی مرتبہ ہندوستان آئے تو مدتِ مدید تک یہاں رہے۔ پھر ۹۵۷ھ میں اپنے وطنِ مالوف مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ اس سال حج کیا۔ دوسرے سال بھی یہ سعادت حاصل کی اور ۹۶۰ھ میں واپس ہندوستان آئے۔ پھر زندگی کی آخری سانس تک یہیں اقامت گزیں رہے۔

ان کے فاضل تلمیذ شیخ عبداللطیف الدبیر نے ان کی مدح میں یہ قصیدہ کہا:

یا علامۃ الدنیا و یا عالم غدا	یقصر عن غایاتہ فی العلاء البدر
ومن لاح مثل الصبح فضل کمالہ	فضاء بہ الاقطار وافتخر العصر
ویا ایھا البحر الخضم لعاملہ	وبالرفق للطلاب یا ایھا البر
وفاکھۃ الدنیا بنھاہ ذا الھنا	وجمع علوم فاح من طیبھا النشر
اب لسعادات واصل محامد	فمن امہ بالنجح آل کذا الیسر
تباھت لہ گجرات لماثوی بھا	فان فخرت یوما یحق لھا الفخر

ترجمہ: اے وہ شخص جو موجودہ حالات کو بھی جانتا ہے اور مستقبل سے بھی باخبر ہے اور وہ جس کی بلندیوں کو پانے سے چاند بھی قاصر ہے۔

اور وہ جس کا فضل و کمال سپیدۂ صبح کی طرح روشن ہوا، اقطارِ عالم اس سے چمک اٹھتا ہے اور زمانہ اس پر ناز کرتا ہے۔

اے علم کے بحرِ فیاض اور اے طالبانِ علم کے لیے حسنِ سلوک کے برِ عظیم۔

وہ دنیا کا ایسا پھل ہے جو اپنی خوش گواری میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے، اس کے جمعِ علم کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔

وہ سخاوتوں کی اساس اور فضائل و مناقب کی جڑ ہے، جو شخص حصولِ کامرانی کے لیے اس کی طرف رجوع کرتا ہے تو یسر و کامرانی اس کی طرف چل پڑتی ہے۔

گجرات اس پہ نازاں ہے، کیوں کہ وہ اس کی آرام گاہ ہے اور اگر وہ اس پہ

ناز کرے تو یہ ناز اسے زیب دیتا ہے۔

شیخ محمد بن احمد فاکہی نے جمعہ کے روز ۲۱ جمادی الاولی ۹۹۲ھ کو شہر احمد آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔[۹]

۱۹۲۔ شیخ محمد بن احمد نہروالی

شیخ محمد بن احمد بن محمد بن محمود نہروالی۔ ان کا لقب قطب الدین اور والد کا علاء الدین تھا اور چوں کہ یہ اپنے زمانے کے مفتی تھے، اس لیے مفتی قطب الدین بن علاء الدین مکّی کے نام سے معروف تھے۔ علامۂ دوراں اور محدّثِ زماں تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول اور انشا و شعر کے ماہر علما میں سے تھے۔ فقہی مسلک کی رُو سے حنفی تھے۔

شیخ محمد بن احمد، ۹۱۷ھ کو لاہور میں پیدا ہوئے اور عمر کی کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد اپنے والدِ مکرم شیخ احمد ملقب بہ علاء الدین سے حصولِ علم میں مشغول ہوگئے۔ بعد ازاں مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ وہاں خطیب معمر احمد محب الدین بن ابو القاسم محمد العقیلی نویری مکی، محدث یمن وجیہ الدین عبدالرحمٰن بن علی دیبع شیبانی زبیدی، شیخ شہاب الدین احمد بن موسیٰ بن عبدالغفار مغربی مصری نزیل حرمین، شیخ محمد بن محمد بن عبدالرحمٰن خطاب مالکی اور ان کے والد شیخ محمد بن عبدالرحمٰن سے مختلف علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ ۹۴۳ھ کو عازم مصر ہوئے، وہاں ابو عبداللہ محمد بن یعقوب عباسی متوکل علی اللہ (متوفی ۹۵۰ھ) سے ملے۔ مصر اس زمانے میں مرکزِ علمائے عظام اور منبع فضلائے فخام تھا۔ وہاں اونچے درجے کے مشائخ کرام بھی موجود تھے، جن کے رشد و ہدایت کی ...ت سے پورا ملک بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔

شیخ قطب الدین محمد بن احمد کو تصوّف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ اس سلسلے

---

[۹] النور السافر، ص ۴۰۷، ۴۰۸ ــ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۸۳ تا ۲۸۵

میں وہ شیخ علاء الدین کرمانی نقشبندی (متوفی ۹۲۹ھ) سے غالباً سفرِ مصر سے قبل مستفیض ہوئے۔

شیخ محمد نہروالی کو یہ شرف حاصل تھا کہ اپنے زمانے میں ان کی صحیح بخاری کی سند ساری دنیا میں عالی تھی۔ وہ اس طرح کہ انھوں نے اپنے والد شیخ علاء الدین احمد بن محمد نہروالی سے، انھوں نے حافظ نورالدین ابوالفتوح احمد بن عبداللہ طاؤسی شیرازی سے، انھوں نے شیخ معمر بابا یوسف ہروی سے، انھوں نے محمد بن شابخت فارسی فرغانی سے، انھوں نے شیخ ابولقمان یحییٰ بن عمار بن مقبل بن شاہان ختلانی سے سماعت کی، انھوں نے محمد بن یوسف فربری سے اور انھوں نے امام عالی مقام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری سے روایت کی۔ ایک روایت کے مطابق شیخ قطب الدین محمد نہروالی نے اپنے والد شیخ علاء الدین احمد بن محمد کے واسطے کے بغیر براہِ راست حافظ نورالدین ابوالفتوح طاؤسی سے بھی صحیح بخاری کی روایت کی ہے۔

شیخ محمد نہایت فصیح و بلیغ شخص تھے اور عربی کے بلند پایہ ادیب تھے۔ ترکی کے عثمانی حکمران اور عام ترک ان کی بے حد تکریم کرتے تھے، وہ حج کو جاتے تو رسوم حج کی ادائیگی میں ان ہی سے رہنمائی حاصل کرتے اور اس باب میں کسی دوسرے عالم کو قابلِ اعتنا قرار نہ دیتے۔ ترک حجاج ان کی مالی امداد بھی دل کھول کر کرتے۔ ان سے انھیں جو رقوم وصول ہوتیں، اس سے یا تو کتابیں خریدتے، یا پھر محتاجوں اور مستحق افراد کو دے دیتے۔ مکہ مکرمہ اور اس کے گرد و نواح میں ان کے احترام کا یہ عالم تھا کہ جدھر نکل جاتے، علما و ادبا کی جماعت ان کے ساتھ ہوتی۔

شیخ قطب الدین محمد بن احمد نے اپنی کتاب تاریخ مکہ میں خود اپنے حالات میں لکھا ہے کہ والئ گجرات سلطان احمد شاہ نے مکہ مکرمہ میں حرمِ محترم کے قریب جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس کا انتظام ان کے ہاتھ میں تھا۔ ممکن ہے، ان کے والد شیخ علاء الدین احمد بن محمد نے ان کو حجاز بھیجا ہو اور والد کی وفات کے بعد اس کی تولیت خود شیخ قطب الدین محمد بن احمد کے سپرد ہو گئی ہو۔

انھوں نے دو مرتبہ قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ ایک مرتبہ وہ ۹۶۵ھ میں قسطنطنیہ

گئے، جب عثمانی حکمران سلطان سلیمان بن سلیم نے انھیں خلعت عطا کی۔ سلطان مذکور نے مکہ مکرمہ میں مدارس قائم کیے تو شام کے اوقاف سے ان مدارس کے مدرسین، طلبا خدام، بوّاب اور فرّاش کے لیے وظائف مقرر کیے۔ شیخ قطب الدین محمد نے وہاں کے مدرسہ حنفیہ سلیمانیہ میں ہدایہ پورا، کچھ حصہ کشاف کا اور کچھ حصہ مفتی ابو السعود عمادی کی تفسیر کا پڑھا۔ اس مدرسہ میں خود انھوں نے حدیث، اصولِ حدیث اور علمِ طب کے کچھ اسباق پڑھائے۔ پھر وہ ابن ہمام کی شرح الہدایہ بھی اس مدرسہ میں پڑھاتے رہے۔ جس کی تکمیل مولانا شمس الحق احمد قاضی زادہ نے کی۔

عثمانی حکمران سلطان سلیم بن سلیمان بھی ان کا بے حد احترام کرتا تھا اور وہ اپنے زمانۂ ولی عہدی میں بھی اور خود مختار حکمران ہونے کے بعد بھی ان پر احسان و اکرام کرتا اور انھیں باقاعدہ ہر سال خلعتِ خاص سے نوازتا رہا۔ اسی طرح اس کے بیٹے سلطان مراد کے دل میں بھی ہر دور میں ان کا احترام جاگزین رہا اور اس نے ہمیشہ ان کی طرف عنانِ توجہ مبذول کیے رکھی۔ سلطان مراد نے ان کو مکہ مکرمہ کے منصب افتا پر متعین کیا اور بیت اللہ کی خطابت بھی ان ہی کے سپرد کی۔ مدرسہ سلیمانیہ کی تدریس کے لیے ان کو اور ان کی اولاد کو مقرر کیا۔ اس نے صفا کے مقام پر مدرسۂ عثمانیہ کے نام سے ایک مدرسہ کی تاسیس کی، اس کی مسندِ تدریس پر بھی ان ہی کو متعین کیا۔ اس مدرسہ میں یہ حدیث اور فقہ کا درس دیتے تھے۔

شیخ قطب الدین محمد بن احمد جہاں بہت بڑے عالم اور مدرس تھے، وہاں اپنے دور کے عظیم مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں:

۱۔ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام: یہ کتاب مکہ معظمہ کی مفصل تاریخ ہے، جو ایک مقدمہ، دس ابواب اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں مصنف نے اپنی اس کتاب کے مآخذ کی فہرست بھی دی ہے اور لکھا ہے کہ مکہ کا قدیم ترین مورخ عبدالولید محمد بن عبدالکریم الازرقی ہے۔ اس کتاب کی فہرستِ ابواب درجِ ذیل ہے۔ اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے:

باب اوّل: مکہ مکرمہ اور کعبہ کا جغرافیائی بیان۔

باب دوم: کعبہ کی بنا اور تعمیر۔

باب سوم: عہدِ جاہلیت اور آغازِ اسلام میں مسجد الحرام کی کیفیت۔

باب چہارم: عہدِ عباسیہ میں مسجد الحرام میں کیا اضافہ کیا گیا۔

باب پنجم: جو تعمیر منصور کے عہد میں شروع ہوئی اور اس کے بیٹے مہدی کے عہد میں مکمل ہوئی، اس کی تفصیل۔ نیز آئندہ چل کر عہدِ عباسیہ میں جو اہم اضافے ہوئے، ان کا تذکرہ۔

باب ششم: جراکسہ کے عہد میں مسجد الحرام کی مرمت۔

باب ہفتم: مسجد الحرام عہدِ عثمانیہ میں۔

باب ہشتم: مسجد الحرام سلیم اوّل کے عہدِ حکومت میں۔

باب نہم: مسجد الحرام سلیم دوم کے عہد میں۔

باب دہم: مسجد الحرام سلطان مراد کے عہد میں۔

ضمیمہ: مکہ کے مقاماتِ مقدسہ۔

تاریخ کعبہ کی مکمل وضاحت کی غرض سے مصنفِ شہیر نے عہدِ رسالت سے لے کر خود اپنے زمانے تک، مسلمانوں کی تاریخ کا ایک سرسری خاکہ بھی پیش کیا ہے۔

مغربی علما نے اس کتاب کو اپنے موضوع میں بہت اہم قرار دیا ہے اور اس قسم کی دوسری کتابوں کے ساتھ اس کو بھی ووسٹن فلڈ نے مرتب کیا ہے۔

۲۔ البرق الیمانی فی الفتح العثمانی: اس کتاب کو الفتوحات العثمانیہ للاقطار الیمنیہ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب ان واقعات کی تاریخ ہے جو دسویں صدی ہجری کے آغاز سے لے کر ۹۷۸ھ تک رونما ہوئے۔ یہ تین ابواب اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ پہلا باب تیرہ فصلوں میں منقسم ہے، جس میں دسویں صدی ہجری کے آغاز سے عثمانی ترکوں کی فتح یمن تک یمنی بادشاہوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ دوسرا باب سینتیس فصول کو محیط ہے۔ اس میں یمن پر ترکوں کے قابض ہونے سے لے کر سلطان سلیمان کے عہدِ حکومت تک کے واقعات درج کیے گئے

ہیں۔ تیسرے باب میں چھ فصلیں ہیں اور اس میں ان واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو سلطان سلیم کے عہدِ حکومت میں پیش آئے۔ خاتمۂ کتاب چار فصلوں کو محتوی ہے، اس میں سنان پاشا کی مصر کو واپسی اور اس کی تونس اور گولیتا کی فتوحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔

۳: منتخب التواریخ فی الترجمہ۔

۴: تمثال الامثال النادرة والتمثیل والمحاضرة بالابیات المفردة النادرة۔

۵: الکنز الاسمی فی فن المعمی۔

شیخ قطب الدین محمد شاعر بھی تھے۔ عثمانی حکمران سلطان مراد کی مدح میں انھوں نے یہ اشعار کہے:

ان سلطاننا مراد لظلّ الله فی الارض باھر السلطان
ملک صار من مضی من ملوک الارض لفظاً وجاء عین المعانی
ملِک وھو فی الحقیقة عندی ملک صیغ من صیغة الانسان
ملک عادل فکل ضعیف وقویّ فی حکمه سیّان
سیفه والمنون طرفا رھان لحلوق العدو یبتدران
کمل المسجد الحرام بناءً فاق فی العالمین کل المبانی
ھکذا ھکذا والا فلا لا انما الملک فی بنی عثمان

مراد ہمارا سلطان ہے، جو زمین پر اللہ کا سایہ ہے اور اس کی حکومت سب پر فائق ہے۔

وہ ایسا فرماں روا ہے جو واقعی و معنوی لحاظ سے فرماں روا ہے اور جو دیگر فرماں روا روئے زمین پر گزرے ہیں وہ صرف ظاہری و لفظی فرماں روا تھے۔

وہ ہے تو مَلِک (فرماں روا) لیکن میرے نزدیک دراصل وہ مَلَک (فرشتہ) ہے، جس نے انسانی شکل اختیار کر لی ہے۔

وہ ایسا عادل فرماں روا ہے کہ قوی اور ضعیف دونوں اس کی نگاہ میں برابر ہیں۔

اس کی تلوار اور موت گھوڑ دوڑ کے ایسے دو گھوڑے ہیں جو دشمن کو ختم کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کو دوڑ پڑتے ہیں۔

اس نے مسجد حرام کی تعمیر مکمل کر دی، جو ساری دنیا کی عمارتوں پر فوقیت رکھتی ہے۔

بلاشبہ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ یہ ملک (مراد) بنی عثمان میں سے ہے۔

امام شوکانی نے البدر الطالع میں شیخ قطب الدین محمد بن احمد نہروالی کی تاریخ وفات ۹۸۸ھ تحریر کی ہے اور عصامی کی روایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ انھوں نے ہفتہ کے روز ۲۷ ربیع الثانی ۹۹۰ھ کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔[۱]

۱۹۳۔ شیخ محمد بن اسحاق سندھی

شیخ محمد بن اسحاق حنفی سندھی، صالح عالم دین اور شیخ وقت تھے۔ بلادِ سندھ میں واقع اعمالِ سیوستان کے ایک گاؤں لاکدہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ شیخ عبدالرشید سندھی سے تحصیل کی اور فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ میں اپنے اقران و معاصرین سے فوقیت لے گئے۔ علاوہ ازیں نہایت صالح، متقی اور متدین بزرگ تھے۔ جام نظام الدین والیٔ سندھ کے عہد کے عالم و فقیہ تھے۔ ان کا شمار دسویں صدی ہجری کے باعمل ہندی علما میں ہوتا تھا۔ لوگوں کے کام کرانے میں بہت تیز تھے اور ان کی سفارش کے لیے امرا اور

---

[۱] البدر الطالع ج ۲ ص ۵۷، ۵۸۔ النور السافر ص ۳۸۳۔ نزہۃ الخواطر ص ۲۸۵ تا ۲۹۰۔ یادِ ایام ص ۶۴، ۶۵

ارکانِ حکومت کے پاس کثرت سے جاتے تھے۔[۱۱۱]

ان کے حالات اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کس سن میں پیدا ہوئے اور کب عالمِ جاودانی کو سدھارے۔

۱۹۴۔ علامہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی

شیخ محمد بن طاہر بن علی پٹنی، دسویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کے بہت بڑے عالم، محدث، لغوی، شیخ، مبلغ اور مصنف تھے۔ گجرات (کاٹھیاواڑ) کے شہر نہروالا کے باشندے تھے، جو بعد کو پٹن کے نام سے موسوم ہوا۔ اور اسی مناسبت سے یہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی کہلائے۔ ان کا لقب جمال الدین بھی تھا، اور مجد الدین بھی!

شیخ ممدوح ۹۱۴ھ کو شہر پٹن میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ ابتدائے عمر ہی سے حصولِ علم میں مصروف ہو گئے اور سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ ابھی سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے تھے کہ اپنے علاقہ کے مختلف اساتذہ سے علم حاصل کرنے لگے، جن میں مُلا ہمنہ، شیخ ناگوری، شیخ برہان الدین سمھوی اور مولانا یداللہ سوہی وغیرہ شامل ہیں۔ کم و بیش پندرہ سال حصول علم میں مصروف رہے اور مختلف علوم و فنون میں اپنے اقران و معاصرین سے سبقت لے گئے۔ تیس سال کی عمر کو پہنچے تو ۹۴۴ھ میں حرمین شریفین کا قصد کیا۔ حج و زیارت سے بہرہ مند ہوئے اور ایک مدت تک وہاں مقیم رہے۔ اس دوران میں انھوں نے حرمین شریفین کے مشاہیر اساتذہ سے بھی اخذِ علم کیا، جن میں شیخ ابوالحسن بکری شافعی، صاحب الصواعق المحرقہ شیخ شہاب الدین احمد بن حجر مصری ثم مکی، شیخ علی مدنی، شیخ جاراللہ بن فہد مکی، شیخ علی عبیداللہ سرہندی شیخ عبداللہ عیدروس، شیخ عبداللہ زبیدی، سید عبداللہ عدنی، شیخ علی عبیداللہ حضرمی،

---

[۱۱۱] تحفۃ الکرام ص ــــ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۹۰

اور شیخ برخوردار سندھی شامل ہیں۔ ان دنوں شیخ علی متقی بھی وہاں اقامت گزین تھے۔ شیخ محمد بن طاہر نے ان سے بھی اخذِ علم کیا اور ان سے منسلک و ملازم رہ کر مستفید و مستفیض ہوئے۔ اب انھوں نے فضل و علم میں کامل و مکمل ہو کر وہاں سے ہندوستان کو مراجعت فرمائی اور اپنے وطن پٹن کو اپنا مستقر ٹھہرایا جو اس زمانے میں علاقہ گجرات کا ایک نہایت اہم مقام تھا۔

شیخ محمد بن طاہر علاقہ گجرات کی بوہرہ برادری سے تعلق رکھتے تھے جو برصغیر کی مال دار اور تجارت پیشہ برادری تھی۔ بوہرے دو جماعتوں میں منقسم تھے۔ کچھ لوگ شیعہ اسماعیلیہ تھے، جو مہدویہ کہلاتے تھے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو محمد المہدی بن عبداللہ بن احمد بن محمد بن اسماعیل بن جعفر صادق کے پیرو بتاتے ہیں اور محمد بن عبداللہ کو مہدی آخرالزماں مانتے ہیں۔ کچھ لوگ جماعت اہل سنت سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ محمد بن طاہر نے بوہروں کی اصلاح کا عزم کیا اور ان میں جو بدعات و رسوم پیدا ہو گئی تھیں، ان کو ختم کرنے کی ٹھانی۔ نیز اپنے علاقے میں تعلیم عام کرنے اور لوگوں کو جہالت کی تاریکی سے نکالنے کا تہیہ کیا۔ انھوں نے ایک ایسی اصلاحی تحریک شروع کی جس کا بنیادی مقصد سنتِ رسول اللہ کی ترویج، احکامِ شریعت کی تنفیذ اور منکرات کا انسداد تھا۔

النور السافر میں عبدالقادر حضرمی رقم طراز ہیں کہ شیخ محمد بن طاہر اپنے باپ کی طرف سے بہت سے مال و دولت کے وارث ہوئے تھے، وہ خود روشنائی بنانے کا کام کرتے تھے۔ اس طرح علم و فضل کی فراوانی کے ساتھ ساتھ انھیں گجرات کی ایک مال دار شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ اپنا مال تعلیم و تبلیغ پر خرچ کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ لڑکوں کے مدرسے کے معلّم کے ذریعے ذکی اور فہیم لڑکوں کو اپنے ہاں طلب کرتے۔ اگر لڑکا مال دار ہوتا تو اسے علم حاصل کرنے کی تاکید فرماتے۔ اگر تنگ دست ہوتا تو اس کے اور اس کے گھر والوں کے مصارف کا بوجھ خود برداشت کرتے اور اس کو تعلیم میں مشغول رہنے کی ترغیب دیتے۔ اسی طرح غربا و مساکین اور مستحقین میں بھی مال و دولت تقسیم کرتے اور ہر ایک کو ضرورت کے مطابق باقاعدہ وظیفہ دیتے۔ اس طرح وہ کوشاں ہوتے

کہ لوگ فکرِ معاش سے بے نیاز ہو کر اللہ کے دین کی خدمت کو اپنا مقصدِ حیات ٹھہرالیں۔

شیخ محمد بن طاہر نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک ان کی قوم بدعات و منکرات کو ترک نہیں کر دیتی اور سنت پر عامل نہیں ہو جاتی، وہ سر پر عمامہ نہیں باندھیں گے قریب تھا کہ ان تمام بدعات کا قطعی طور سے خاتمہ ہو جاتا جو بلادِ گجرات میں مروّج تھیں کہ مغل حکمران جلال الدین اکبر نے ۹۸۰ھ میں گجرات فتح کیا، اکبر سے شیخ کی ملاقات ہوئی تو اس نے عمامہ نہ باندھنے کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے وجہ بتائی تو اکبر نے کہا، بدعات کا قلع قمع کرنا، دین کی نصرت اور سنت کا نفاذ عمل میں لانا میرے فرائض میں ہے اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ آپ ان امور کی پرواہ نہ کریں۔ چنانچہ اکبر نے اپنے ہاتھوں سے ان کے سر پر عمامہ باندھا اور ساتھ ہی والیٔ گجرات مرزا عزیز الدین کوکہ کو جو اکبر کا رضاعی بھائی تھا، شیخ کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کا حکم دیا۔ منقول ہے کہ اس نے اس سلسلے میں شیخ کی پوری اعانت کی اور ممکن حد تک رسوم بدعات کے ازالے کی سعی کی۔

لیکن جب مرزا عزیز الدین کوکہ کو معزول کر کے اس کی جگہ عبدالرحیم خان خاناں کو مقرر کیا گیا تو اس نے بوہروں کے عقیدۂ مہدویت کی حمایت کرنا شروع کر دی جس کے نتیجے میں وہ تمام مہدوی جو گوشۂ عزلت میں چلے گئے تھے دوبارہ باہر نکل آئے اور شیخ کی تحریکِ اصلاح بڑی حد تک دب گئی۔

شیخ کو اس کا بڑا قلق ہوا، انھوں نے دوبارہ عمامہ سر سے اتارا اور اکبر سے ملنے کی غرض سے آگرہ کا قصد کیا۔ در اصل ان کا مقصد اکبر کو اس کا وعدہ یاد دلانا اور اس ضمن میں جو کام ہو چکا تھا اس کی اطلاع دینا تھا، نیز عزیز الدین کوکہ کی معزولی اور عبدالرحیم خان خاناں کے تقرر کے نتیجے میں جو تغیر رونما ہو گیا تھا، اس کی تفصیلات سے اکبر کو آگاہ کرنا تھا۔ مگر اس کا انھیں موقع نہ ملا۔ وہ گجرات سے چلے تو کچھ لوگ جو فرقۂ مہدویہ سے تعلق رکھتے تھے، ان کے تعاقب میں نکلے۔ جب شیخ اُجین کے نواح میں پہنچے تو انھوں نے موقع پا کر ان کو قتل کر ڈالا۔ یہ حادثہ ۹۸۶ھ کو پیش آیا۔ شیخ کے رفقائے سفر ان کے جسدِ خاکی کو وہاں سے پٹن لے آئے اور انھیں ان کے آبائی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

شیخ محمد بن طاہر پٹنی متعدد علمی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں بہت اہم اور اہلِ علم میں زیادہ مقبول و معروف کتابیں یہ ہیں:

۱- مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل و لطائف الاخبار: یہ حدیث کا ایک لغت ہے، جو نہایت اہمیت اور جامعیت کا حامل ہے، اور دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ شیخ نے یہ معجم اپنے مرشد و استاذ، شیخ علی متقی کے نام معنون کیا ہے۔ یہ بڑی ضخیم کتاب ہے جو ۱۶۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی کتابت بہت گنجان ہے۔ اس کو حروفِ مصادر کی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے۔ جو الفاظ، احادیث میں استعمال ہوئے ہیں، ان کے مصادر اور مشتقات اس لغت میں موجود ہیں اور احادیث کا متن بھی اس میں درج کیا گیا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف الفاظ کے معنی لکھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ متعلقہ حدیث کے بارے میں وضاحت طلب نکات کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ اس لغت سے پہلے اس قسم کے جتنے بھی لغت مرتب کیے گئے ہیں، وہ اس کے سامنے کم اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ اہلِ علم میں یہ کتاب بڑی مقبول ہے۔

۲- تذکرۃ الموضوعات: یہ موضوع احادیث سے متعلق ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کے مقدمہ میں مصنف رحمہ اللہ نے یہ وضاحت کی ہے کہ کسی حدیث کو محض اس لیے موضوع نہیں قرار دے دینا چاہیے کہ کسی نے اسے موضوع کہا ہے۔ اس کا فیصلہ اس سلسلے کی مستند کتب سے رجوع کے بعد کیا جائے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے شیخ نے لکھا ہے کہ امام ابن جوزی نے اپنی کتاب الموضوعات میں بعض ان احادیث کو بھی موضوع قرار دیا ہے، جو دراصل حسن کا درجہ رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں بعض ضعیف احادیث کو بھی انھوں نے موضوع ٹھہرایا ہے۔ اس کے بعد شیخ نے ان احادیث پر عالمانہ و ناقدانہ بحث کی ہے جنھیں کسی نہ کسی عالم نے موضوع سے تعبیر کیا ہے۔ اس مسئلہ سے متعلق یہ ایک مفید کتاب ہے۔ یہ کتاب مصر میں چھپ چکی ہے اور مشہور اہلِ حدیث عالم مولانا عبدالجلیل سامرودی نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی ہے۔

۳- علاوہ ازیں المغنی فی ضبط اسماء الرجال :

۴- قانون الموضوعات فی ذکر الضعفاء والوضاعین : یہ کتاب مصر میں طبع ہوگئی ہے۔ اس کے مقدمہ میں مرقوم ہے کہ مصنفِ علام نے اس کو تذکرۃ الموضوعات کے بعد تصنیف کیا۔

اس کتاب میں مصنف نے ان رواۃ کو حروف تہجی کے اعتبار سے جمع کر دیا ہے جو موضوع حدیثیں وضع کرتے یا بیان کرتے تھے۔ آخری دو فصلوں میں ان کی کنیتیں اور نسب بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب کے بالکل آخر میں مولانا عبدالجلیل سامرودی مرحوم نے ترجمۃ المؤلف کے عنوان سے شیخ محمد بن طاہر کے حالات و سوانح تحریر کیے ہیں۔

فاضل مصنف نے، وضاع راویوں کے نام اور اوصاف باقاعدہ حوالوں کے ساتھ درج کیے ہیں اور ان کا ساقط الاعتبار یا غیر مستند ہونا متقدمین کی کتابوں سے ثابت کیا ہے۔ اس کا انداز اس قسم کا ہے۔ مثلاً :

غالب بن عبیداللہ الجزری۔ لیس بشیٔ۔

غریب بن عبد الواحد القرشی۔ مجہول۔

غسان بن ابان الحنفی۔ یروی عجائب۔

غیاث بن ابراہیم۔ کذاب۔

غلیل بن مجد۔ وضاع۔

الفرح بن فضالۃ۔ ضعیف۔

الفرات بن السائب۔ متروک۔

الفضل بن حرب البجلی۔ غیر محفوظ۔

الفضل بن عبداللہ بن مسعود یشکری۔ لا یجوز احتجاج بہ وغیرہ وغیرہ۔

۵- کفایۃ المفرطین : یہ شافیہ کی شرح ہے۔ اس کا ایک نسخہ احمد آباد میں پیر محمد شاہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

دسویں صدی ہجری کے اس عظیم المرتبت عالم اور محدّث وفقیہ نے ۹۸۶ھ میں اُجین اور سارنگ پور کے درمیان جام شہادت نوش کیا اور ان کے ساتھیوں اور خواہرزادہ شیخ نور محمد نے میت کو پٹن لاکر، ان کے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کیا۔[۱۲]

۱۹۸۔ شیخ محمد بن عاشق چریاکوٹی

شیخ محمد بن عاشق موضع چریاکوٹ میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ ذرا بڑے ہوئے تو اپنے علاقہ کے علمائے عظام سے تحصیلِ علم کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن چریاکوٹ میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس میں تدریس اور افادۂ طلبا کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ شیخ محی الدین عباسی چریاکوٹی کے لقب سے ملقب تھے۔ فاضل بزرگ تھے اور فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں التفسیر المحمدی، الجواہر العربیہ فی الفنون الادبیہ، اصولِ فقہ کی مشہور کتاب تلویح پر حاشیہ اور فرائض و مواریث میں الکوکب الدری شامل ہیں۔ اس عالم وفقیہ اور مصنف نے ۹۷۲ھ میں وفات پائی۔ ان کا تذکرہ احمد مکرم چریاکوٹی نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔[۱۳]

---

[۱۲] النور السافر، ص ۳۶۱، ۳۶۲۔ اخبار الاخیار، ص ۲۷۲۔ شذرات الذہب ج ۸ ص ۴۱۰۔ الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۱۳۔ الفوائد البہیہ حاشیہ ص ۱۶۴، ۱۶۵۔ معجم المولفین ج ۱۰ ص ۱۰۰۔ ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۲۵۵۔ کشف الظنون۔ ایضاح المکنون۔ اتحاف النبلاء، ص ۳۹۷ تا ۴۰۰۔ ابجد العلوم، ص ۸۹۵، ۸۹۶۔ مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۷۹ تا ۱۸۱۔ سبحۃ المرجان ص ۴۳ تا ۴۵۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۵، ۱۹۶۔ حدائق الحنفیہ ص ۳۸۵ تا ۳۸۷۔ الاعلام ج ۷ ص ۴۲، ۴۳، ۴۴۔ مرآت احمدی ج ۳ ص ۱۱۶، ۱۱۷۔ اذکارِ ابرار، ص ۲۲۳ تا ۲۲۴۔ رودِ کوثر ۳۹۲، ۳۹۴۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۴۳۶، ۴۳۷۔ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ترجمہ رسالہ مناقب۔ مؤلفہ شیخ عبدالوہاب اقضی القضاۃ (متوفی ۱۰۸۶ھ)۔ ترجمہ مولانا سید ابوظفر ندوی۔ [۱۳] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۳۰۲۔

۱۹۶- شیخ محمد بن عبدالملک قاری خالدی

شیخ محمد بن عبدالملک خالدی، اپنے عصر کے مشہور قاری، فقیہ اور شیخ تھے ساتھ ہی جود و سخا سے متصف۔ اکتب درسیہ اپنے والد گرامی شیخ عبدالملک سے پڑھیں، قرائت و تجوید کا علم بھی ان ہی سے سیکھا۔ پھر ذکر و عبادت میں مشغول ہو گئے اور علما و طلبا کی ایک بڑی جماعت ان کے گرد جمع ہو گئی۔ تمام عمر درس و تدریس اور اہلِ علم کو علمی فائدہ پہنچانے میں صرف کر دی۔ توکل و عفاف ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور طبیعت کو قناعت بالیسیر کا ایسا عادی بنا لیا تھا کہ ضرورت سے زیادہ کوئی چیز حاصل کرنے کی خواہش ہی دل میں باقی نہ رہی تھی۔ سخت تکلیف کے وقت بھی ملوک و امرا کے دروازے پر نہیں گئے۔ نہ کسی کے آگے کبھی ہاتھ پھیلایا اور نہ تنگ دستی کا شکوہ کیا۔ دسویں صدی ہجری کے اس ہندی عالمِ دین اور فقیہ و قاری نے ۱۴ رجب ۹۸۴ھ کو آگرہ میں وفات پائی[۱۴۵]

۱۹۷- شیخ محمد بن عمر بحرق حضرمی

شیخ محمد بن عمر بن مبارک بن عبداللہ بن علی حمیری حضرمی، بحرق کے نام سے مشہور تھے۔ شافعی المسلک تھے۔ علامۂ زماں اور محدثِ دوراں تھے۔ ان کا شمار اپنے عصر کے علمائے محققین اور فضلائے مدققین میں ہوتا تھا ـــــ لقب جمال الدین تھا۔ ۱۵ شعبان کی شب کو ۸۶۹ھ میں حضرت موت میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اسی نواح کے علما سے اخذِ علم کیا۔ پھر مزید تعلیم کے لیے زبید چلے گئے۔ وہاں شیخ زین الدین محمد بن عبداللطیف شرجی سے حدیث کا درس لیا اور شیخ جمال الدین محمد بن ابوبکر صائغ فقیہ سے اصول کی کتابیں پڑھیں۔ تصوف و طریقت کے لیے مختلف مشائخ کی خدمت میں گئے اور اس علم سے بہرہ ور ہوئے۔ ۸۹۴ھ

---

[۱۴۵] اذکارِ ابرار، ص ۳۳۷، ۳۳۸ ـ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۳۰۴

میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور حافظ شمس الدین سخاوی سے کسبِ فیض کیا۔

حصولِ علم کے بعد درس و تدریس اور افادۂ طلبا کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ حضرموت میں ان سے فقیہ محمد بن احمد باجرفیل نے تحصیل علم کی اور عدن میں ان کے سامنے عبداللہ بن احمد مخرمہ نے زانوے تلمذ تہ کیا۔ طلبا پر نہایت مہربان اور اہلِ خیر کے لیے بدرجہ غایت کرم فرما تھے۔ حق و صداقت کے علم بردار تھے۔ شحر کی مسندِ قضا پر بھی متمکن رہے۔ پھر اس منصب سے الگ ہو گئے اور عدن چلے گئے۔ وہاں کے امیر مرجان عامری کے نزدیک انھیں بڑی عزت و قبولیت حاصل ہوئی اور بے حد عز و جاہ کے حامل ہوئے۔

بعد ازاں دیارِ ہند کے لیے رختِ سفر باندھا اور والی گجرات سلطان مظفر بن محمود بیگڑہ کے پاس آئے۔ یہ حکمران ان سے نہایت تعظیم سے پیش آیا اور ان کی بے حد قدر و منزلت کی۔ اس نے اپنی قلمرو میں ان کی آمد کو مغتنم جانا اور ان سے اخذِ علم کیا۔

شیخ محمد بن عمر بحرق کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں ایک کتاب تبصرۃ الحضرۃ الشاھیۃ الاحمدیۃ بسیرۃ النبویۃ الاحمدیۃ ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ہندوستان آ کر فرماں روائے گجرات سلطان مظفر کے دربار سے منسلک ہونے کے بعد لکھی اور اسی بادشاہ کے نام منسوب کی۔ اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کے حالات و سوانح بیان کیے گئے ہیں۔[۱۵] اس کے علاوہ انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں:

۱- الحسام المسلول علی مبغضی اصحاب الرسول۔

۲- ترتیب السلوک الی ملک الملوک۔

۳- متعۃ الاسماع باحکام السماع۔

۴- المختصر من کتاب الامتاع۔

۵- مواھب القدوس فی مناقب العیدروس۔

۶- اختصار شرح لامیۃ العجم للصفدی۔

---

[۱۵] ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون، ج ا، ص ۲۲۱

۷- الاسرار النبویہ فی اختصار الاذکار النوویہ۔

۸- ذخیرۃ الاخوان المختصر من کتاب الاستغناء بالقرآن۔

۹- النبذۃ المنتخبۃ فی کتاب الاوائل للعسکری۔

۱۰- المنتخبۃ المختصرۃ فی الخصال المکفرۃ للذنوب المقدمۃ والمؤخرۃ

۱۱- الحدیقۃ الانیقۃ بشرح العروۃ الوثیقہ۔ اس کتاب کا ذکر کشف الظنون میں بھی ہے مگر مصنف کا نام درج نہیں ہے[۱۷۶] لیکن ایضاح المکنون میں بتایا گیا ہے کہ یہ مصنف کے ایک قصیدہ العروۃ الوثیقہ کی شرح ہے جو خود مصنف نے کی ہے[۱۷۷]۔

۱۲- الحواشی المفیدۃ علی ابیات الیافعی فی العقیدۃ۔ منقول ہے کہ شیخ عبداللہ بن اسعد یافعی کے ابیات پر انھوں نے تین شرحیں سپرد قلم کیں، ایک مفصل، دوسری اوسط درجے کی اور تیسری مختصر۔

۱۳- مختصر المقاصد الحسنۃ۔

۱۴- وصیۃ البنات والبنین فی ما یحتاج الیہ من امر الدین۔

۱۵- لامیۃ العجم۔ اس کی دو شرحیں سپرد قلم کیں۔

۱۶- شرح علی الملحنۃ۔

۱۷- رسالۃ فی الحساب۔

۱۸- رسالۃ فی الفلک وغیرہ۔

۱۹- مختصر الترغیب والترہیب للمنذری۔

۲۰- عقد اللد رد فی الایمان بالقضاء والقدر۔

شیخ بحرق شاعر بھی تھے۔ یہ شعر ان ہی کے ہیں:

انا فی سلوۃ علی کل حال ان اتانی الحبیب او ان اتانی

---

[۱۷۶] کشف الظنون ج ۱، ص ۶۴۵

[۱۷۷] ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون ج ۲، ص ۹۹۔ نیز دیکھیے ج ۱، ص ۳۹۷۔

اغنم الوصل ان دنا فی امان ۔۔۔ واذا ما نأ اعش بالا مانی

میرا دوست میرے پاس آنے سے انکار کرے یا آجائے۔ میں دونوں صورتوں میں مطمئن اور خوش ہوں۔

اگر وہ حالتِ اطمینان میں میرے پاس ہو تو میں لذتِ وصل سے بہرہ یاب ہوں گا اور اگر دور ہو تو آرزوؤں میں زندگی گزاردوں گا۔

درج ذیل اشعار بھی انہی کے ہیں:

یا من اجاد عذ اتہ انشد مقولا ۔۔۔ وا فاد من احسانہ و تفضلا
ان کنت ممتحنی بذاک فاننی ۔۔۔ لست الھیوبۃ حینما قیل انزلا
واذا تبادرت الجیاد بحلبۃ ۔۔۔ یوم النزال رأیت طرفی اذلا
قسما بآیات البدیع وما حوی ۔۔۔ من صنعتیہ موشحا ومسلسلا
لو کنت مفتخرا بنظم قصیدۃ ۔۔۔ لبنیت فی ھام المجرۃ منزلا
من کل قافیۃ یروق سماعھا ۔۔۔ ویعید سحبان الفصاحۃ باقلا
وتری لبید کم بلید اقلبہ ۔۔۔ حصرا وینقلب الفرزدق اخطلا
وعلی جریر تجر مطرف تیھھا ۔۔۔ وتیھھا نبیلا نسیج مھلھلا
ولئن تنبأ ابن الحسین فاننی ۔۔۔ ساکون فی تلک الصناعۃ مرسلا
اظننت ان الشعر یصعب صوغہ ۔۔۔ عندی وقد اضحی لدی مذللا
ابدی العجائب ان برزت مفاخرا ۔۔۔ اومادحا للقوم او متغزلا
لکننی رجل اصون بضاعتی ۔۔۔ عمن یساوم نجسھا متبذلا
واری من الجرم العظیم خریدۃ ۔۔۔ حسناء تھدی للئیم وتجتلا
ما کنت احسب عقربا تختلک با ۔۔۔ لافعی ولاجذعا یزاحم بزلا
فانا الغریب وانت ذاک وبیننا ۔۔۔ رحم یحق لمثلھا ان توصلا

اے وہ جس نے صیح صیح بڑی عمدہ بات کہی اور اپنے حُسن کلام سے بے حد فائدہ پہنچایا۔

اگر تو اس بات سے میرا امتحان لینا چاہتا ہے تو میں ڈرنے والا نہیں، خواہ کہیں

بھی مجھے ٹھہرنے کو کہا جائے۔

جب میدانِ جنگ میں عمدہ گھوڑے دوڑ رہے ہوں تو میرے اصیل گھوڑے کو سب سے اوّل پاؤ گے۔

ان آیاتِ بدیع کی قسم کھاتے ہوئے اور ان چیزوں کی قسم کھاتے ہوئے کہ جس میں توشیح و تسلسل پنہاں ہے۔

(میں کہتا ہوں) اگر کوئی قصیدہ منظوم کرنے پر مجھے ناز ہوتا تو میں کہکشاں کے مغز میں ٹھکانا بناتا۔

اس میں ہر وہ قافیہ ہوتا جو ذوقِ سماعت کو بھلا لگتا اور جس سے سحبانِ فصاحت انگڑائی لینے لگتا۔

اور اپنے لبید کو دیکھو گے کہ اس کا دل بلید اور گنگ ہو گیا ہے اور فرزدق ہزل گو بن گیا ہے۔

اور تم دیکھو گے کہ جریر، اپنے فخر و ناز کی چادر سمیٹے ہوئے چلا جا رہا ہے اور دیکھو گے کہ اس میں مہلہل کا اسلوب بھی نمایاں ہے۔

اور اگر ابن الحسین دعوائے نبوت کرتا ہے تو میں شعر گوئی میں مدعیِ رسالت ہو سکتا ہوں۔

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میرے لیے شعر کہنا کوئی مشکل کام ہے۔ یاد رکھو میرے سامنے اس فن نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔

سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ تم یا تو فخر کرتے ہوئے نکلتے ہو یا قوم کی مدح سرائی کرتے ہو یا عشق بازی سے دل بہلاتے ہو۔

لیکن میں تو ایسا آدمی ہوں کہ اپنی پونجی ان لوگوں سے محفوظ رکھتا ہوں جو اس کی قیمت کم لگانے میں چھچھورپن کا اظہار کرتے ہیں۔

میں دوشیزۂ شعر کو کسی کمینے کے سامنے ہدیۃً پیش کرنا یا اسے دکھانا جرمِ عظیم تصوّر کرتا ہوں۔

مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ کوئی بچھو، سانپ یا بچۂ بز، اونٹ کا مقابلہ کرے گا۔

میں پردیسی ہوں اور تم بھی پردیسی ہو اور ہمارے تمہارے درمیان ایسا رشتۂ رحم ہے جسے بہرحال جوڑے رکھنا چاہیے۔

عامر بن عبدالوہاب نے زبید میں مدارس کی تاسیس شروع کی تو اس پر شیخ محمد بن عمر بحرق حضرمی نے یہ شعر کہے:

ابی اللہ الا ان تحوز المفاخرا — فسماک من بین البریۃ عامرا

عمرت رسوم الدین بعد دروسہا — فاحییت آثار الالٰہ الدوائرا

فانت صلاح الدین لاشک ھذہ — شواھدہ تبدو علیک ظواھرا

اللہ تو چاہتا ہی تھا کہ تم قابلِ فخر باتوں کو سمیٹ لو، اس لیے اس نے اپنی مخلوق میں تمہارا نام عامر رکھ دیا۔

تم نے مراسم دین کو اس وقت قائم کیا، جب کہ وہ مٹ چکے تھے، گویا کہ تم نے اللہ کی مردہ نشانیوں کو زندہ کیا۔

تم بلاشبہ صلاح الدین (مصلح دین) ہو، اور اس کے شواہد و آثار تم پر ظاہر ہو کر رہیں گے۔

اس عظیم عالمِ دین اور فقیہِ عصر نے ۲۰ شعبان کی رات ۹۳۰ھ کو گجرات میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات زہر کی وجہ سے ہوئی۔ سلطان ان کی بے حد تکریم کرتا تھا، جس سے بعض وزرا کے دل میں ان سے حسد پیدا ہوا اور انھوں نے زہر دے کر ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا[۳]

---

[۳] ظفر الوالہ، ص ۱۱۸ تا ۱۲۰ — شذرات الذہب، ج ۸، ص ۱۷۶، ۱۷۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۳۰۶ تا ۳۰۹ — النور السافر، ص ۱۴۳ تا ۱۵۲ — کشف الظنون، ج ۲، ص ۱۵۳۶، ۱۵۳۸ — ایضاح المکنون میں ان کی تصنیفات کا ذکر متعدد مقامات میں موجود ہے — عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ، ص ۱۸۲، ۳۸۹ — ہدیۃ العارفین، ج ۲، ص ۲۳۰، ۲۳۱ — معجم المؤلفین، ج ۱۱، ص ۸۹، ۹۰۔

۱۹۸- شیخ محمد بن فخر الدین جون پوری رہتاسی

شیخ محمد بن فخر الدین جون پوری ثم رہتاسی، فاضل کبیر اور شیخ وقت تھے۔ ان کا شمار اس دور کے کبار علما میں ہوتا تھا۔ تمام عمر درس و افادہ میں مصروف رہے۔ شیخ عبد القدوس گنگوہی نے اپنے رسائل میں ان کی بہت تعریف کی ہے اور انھیں علامۂ عصر قرار دیا ہے۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی زبدۃ المقامات میں شیخ عبد الاحد سرہندی کے حالات کے ضمن میں رقم طراز ہیں کہ شیخ محمد بن فخر الدین رہتاسی طلبا کو درس دیتے تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ عبد الاحد نے ان سے رہتاس میں ملاقات کی اور ان کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ اس وقت وہ طلبا کو قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی شرح المصباح کا درس دے رہے تھے اور اپنے تلامذہ کے سامنے اس کتاب پر ایسے اعتراضات وارد کر رہے تھے جو مصنف کے کلام اور مفہوم کے بالکل خلاف تھے اور علمی اعتبار سے اس پر وارد نہیں ہو سکتے تھے۔ شیخ عبد الاحد نے پہلے تو ارادہ کیا کہ معقولیت اور دلائل کی روشنی میں قاضی شہاب الدین کا دفاع کریں اور شیخ محمد بن فخر الدین کو بتائیں کہ یہ اعتراضات و ایرادات واقعاتی اعتبار سے صحیح نہیں ہیں، لیکن بعد کو اس بنا پر خاموشی اختیار کر لی کہ وہ مسافر ہیں، سیاحت کے لیے گھر سے نکلے ہیں اور آگے جا رہے ہیں، اگر بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس نے طول پکڑ لیا تو سفر میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔ مگر وہ کہتے ہیں، یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب شیخ محمد بن فخر الدین درس سے فارغ ہوئے تو ان پر حقیقت حال منکشف ہو گئی اور انھوں نے طلبا کے سامنے صاف الفاظ میں اعتراف کیا کہ قاضی شہاب الدین کے پیشِ نظر کلام کے بارے میں جو کچھ وہ بیان کر رہے تھے، صحیح نہ تھا اور ان کے کلام کے بالکل خلاف تھا۔ اس کے ساتھ ہی قاضی ممدوح کے کلام کا صحیح محل بھی بیان کر دیا۔ قاضی عبد الاحد فرماتے ہیں، ان کے اس علمی انصاف اور صاف بیانی سے میں بہت متعجب اور خوش ہوا۔

شیخ محمد بن فخر الدین کئی کتابوں کے مصنف تھے ، جن میں ایک توضیح الحواشی شرح المصباح ہے ۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے کافیہ پر جو حواشی تحریر کیے ، ان کی شرح بھی انھوں نے سپردِ قلم کی ۔

شیخ محمد کی وفات کب ہوئی ، اس کا صحیح طور سے پتا نہیں چل سکا ۔ البتہ خواجہ محمد ہاشم کشمی نے بعض علما کے حوالے سے یہ روایت بیان کی ہے کہ مولانا محمد ایک روز علما کے جمِ غفیر کے ساتھ ایک باغ میں موجود تھے ، جو شہر سے باہر واقع تھا ۔ وہاں وہ ان کی آنکھوں سے ایسے اوجھل ہوئے کہ دوبارہ واپس نہ آئے اور نہ کہیں سے ان کے بارے میں کسی قسم کے معلومات فراہم ہو سکے ۔ ان کے متعلق کئی دن لوگ باتیں کرتے رہے ، لیکن ان کا وجود بہر حال لوگوں کے احاطۂ علم سے باہر ہی رہا ۔[۱۹]

۱۹۹ - شیخ محمد بن مبارک جون پوری

شیخ محمد بن مبارک جون پوری ، حنفی المسلک تھے اور دسویں صدی ہجری کے عالم و فقیہ ۔ ان کا شمار کلام و اصول اور علومِ عربیہ کے علمائے متبحرین میں ہوتا تھا ۔ شیخ رکن الدین محمد گنگوہی نے لطائف قدوسی میں ان کا ذکر کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں ، شیخ محمد بن مبارک نہایت متدین ، سلیم الفطرت اور نیک عالمِ دین تھے ۔ اثنائے بحث میں اگر ان پر حقیقت حال منکشف ہو جاتی تو بلا تکلف اپنے قول سے رجوع کر لیتے ۔ وہ لکھتے ہیں ، ایک مرتبہ شاہ آباد میں ان کے اور شیخ عبد القدوس گنگوہی کے درمیان علمِ کلام کے اس مسئلہ پر بحث ہوئی کہ کسی شخصِ معین کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ اہلِ جنت میں سے ہے یا اہلِ دوزخ میں سے ، جائز ہے یا نہیں ؟ شیخ محمد بن مبارک کا موقف یہ تھا کہ چوں کہ ہم کسی خاص شخص کے متعلق یہ نہیں جانتے کہ اللہ اور بندوں کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے ، لہذا

---

[۱۹] لطائف قدوسی ، ص ۲۴ ، ۲۵ — نزہۃ الخواطر ، ج ۴ ، ص ۳۰۹ تا ۳۱۰

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اہلِ جنت میں سے ہے یا اہلِ دوزخ میں سے ـ ان کا استدلال یہ تھا کہ دائرۂ کفر سے نکلنے کے لیے طہارتِ عقیدہ یعنی ایمان ضروری ہے اور وہی دخولِ جنت کی شرط ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ نمازی کی، صحتِ نماز کے لیے طہارت جسمانی شرط ہے۔ اگر کوئی شخص ایمان سے محروم ہے یا اس کے ایمان میں شک ہے تو کیا اسے دخولِ جنت کا مستحق قرار دیا جائے گا، جب کہ طہارت جسمانی کے مشکوک ہونے کی صورت میں، صحتِ نماز کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بات یہ ہے کہ طہارتِ جسمانی اور طہارتِ عقیدہ دو شرطیں ہیں، اور صحتِ نماز اور دخولِ جنت ان کے ساتھ مشروط ہے۔

شیخ عبد القدوس گنگوہی کہتے تھے کہ یہ کہنا کہ نماز اسی صورت میں جائز ہوگی، جب کہ طہارت میں کسی نوع کا شک نہ ہو یعنی جوازِ صلوٰۃ کی بنیاد، طہارت میں عدمِ شک ہے، اسی طرح یہ کہنا کہ دخول جنت کا جواز اسی وقت پیدا ہوگا، جب ایمان شک و شبہ سے بالا ہوگا۔ یعنی دخولِ جنت کا حکم، ایمان میں عدم شک پر مبنی ہے۔ تو بات یہ ہے کہ کسی اہلِ اسلام کے اسلام و ایمان کا معاملہ چوں کہ عند الناس بالکل ظاہر اور عیاں ہے، لہٰذا اس کے ایمان میں شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لیے حکمِ ظاہری کی بنا پر دخولِ جنت کا فیصلہ دیا جا سکتا ہے۔ لیکن عند اللہ معاملے کی نوعیت کیا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، کیوں کہ ہمیں اس کا علم نہیں، اور اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا تعلق ان امور سے ہے جو ہمارے احاطۂ علم سے باہر ہیں۔ صاحبِ شریعت کے علاوہ کوئی شخص اس ضمن میں قطعی بات نہیں کہہ سکتا۔

شیخ عبد القدوس گنگوہی نے مزید کہا کہ اس کی مثال ایسی ہی جیسے ایمان کے بارے میں استثنا یعنی ان شاء اللہ کہنا۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے: أَنَا مؤمن ان شاء اللّٰہ۔ (میں ان شاء اللہ مؤمن ہوں)۔ تو اس استثنا کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ ایمان کا معاملہ مغیبات میں سے ہے، اور یہ لفظ، اللہ کی کبریائی اور اس کی عظمت

سے خوف کی بنا پر کہا گیا ہے ۔ ورنہ یہ بات نہیں ہے کہ العیاذ باللہ ایمان میں شک یا ارتیاب کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے ۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ استثنا درست نہیں ہے ۔ ایک صاحب ایمان کو کہنا چاہیے : انا مؤمن حقّا (میں یقیناً مومن ہوں) ۔ اس لیے کہ وہ اپنے ایمان کا تحقق اس وقت کر رہا ہے اور یہ الفاظ کامل وثوق کے ساتھ اس آن زبان سے ادا کر رہا ہے جب کہ ایمان باللہ اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے اور یہ رَبِّ کریم اور غفور و رحیم کے ساتھ مآلِ انجام کے اعتبار سے حسنِ ظن کی بنا پر ہے ۔ ہاں انجام کا معاملہ چوں کہ مبہم ہے، لہذا اس کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کی جا سکتی ۔ لیکن نماز کی یہ شکل نہیں ۔ دونوں میں بڑا فرق ہے ۔ دونوں کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا، قیاس مع الفارق کی ذیل میں آتا ہے ۔

شیخ محمد بن مبارک نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا، یہ عقیدہ کہ ایمان، خوف اور رجا کے درمیان ہوتا ہے، صحتِ ایمان کے لیے شرط ہے اور کسی کے ایمان کے انجام کے بارے میں ایک قطعی حکم لگا دینے سے یہ شرط (کہ ایمان، خوف و رجا کی درمیانی کیفیت ہے) فوت ہو جاتی ہے اور شرط کے فوت ہونے سے مشروط بھی فوت ہو جاتا ہے، اور یہ بات ہی غلط ہو جاتی ہے، کیوں کہ بندوں کے یقین سے خوف زائل نہیں ہوتا، اس لیے کہ اسی یقین کے ذریعے نجات و فلاح کا علم ہوتا ہے اور یہ اس وقت ہوگا، جب عند اللہ بھی اس یقین کا علم ہو جائے اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی یقینی علم نہیں ۔ نیز اس لیے بھی کہ انسانی یقین صحتِ ایمان کے لیے لازمی ہے ۔ اس لیے کہ یہ عقیدہ کہ ایمان، خوف و رجا کے درمیان ہے، صحتِ ایمان کے لیے شرط ہے ۔ لہذا مطلقاً غیر یقینی سے کیفیت رجا فوت ہو جاتی ہے ۔ پس شرط کے فوت ہونے سے مشروط بھی فوت ہو جاتا ہے ۔ نیز مطلق نماز جو ظاہری طہارت کے ساتھ ہو بلا شک و شبہ صحیح ہو گی، بخلاف ایمان کے — یعنی ایمان کے دو پہلو ہیں، ظاہری اور باطنی ۔ ظاہری تو ایسی شرط کے ساتھ مشروط ہے، جس کا

تعلق حسِ ظاہری سے ہے۔ ظاہراً دخولِ جنت کے جواز کے لیے، اس کے سوا اور کوئی شرط نہیں۔ رہا باطنی پہلو تو وہ قلب سے تعلق رکھتا ہے اور اسی سے عند اللہ دخولِ جنت کا حکم متعلق ہے، لہٰذا ایمان اور نماز دو جداگانہ چیزیں ہیں۔

شیخ رکن الدین محمد کہتے ہیں کہ جب ان کے چچا عزیز اللہ بن اسماعیل ردولوی نے یہ بحث سنی تو لکھ بھیجا کہ جنت اسلام کا اور دوزخ کفر کا ثمرہ ہے۔ جب ہم کسی کے اسلام یا کفر کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اور حسی طور پر معلوم کر لیتے ہیں کہ اس کی موت اسلام کی حالت میں ہوئی یا کفر کی حالت میں۔ یعنی جب اس کی موت واقع ہوئی تو مرتے وقت اس کی زبان سے اسلام کا کلمہ نکلتا رہا یا کفر کا، تو ہم ایسا ہی حکم لگا دیتے ہیں اور عندالناس یہ گواہی دے دیتے ہیں کہ وہ جنتی ہے یا دوزخی۔ اور کتابوں میں جو یہ مرقوم ہے کہ انجام مبہم ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ جنتی ہے یا دوزخی تو اس کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ یہ اسی حد تک مبہم ہے جس حد تک کہ اللہ کے علم و حکمت نے ازل سے اس کے حق میں لکھ دیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ کے نزدیک بھی وہ یقینی اور قطعی طور پر جنتی ہے یا دوزخی — واللہ اعلم

دسویں صدی ہجری کے اس جلیل القدر ہندی عالم و فقیہ کی تاریخِ ولادت اور سنِ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔[۲۵]

۲۰۰۔ شیخ محمد بن محمد ایجی

شیخ محمد بن محمد ایجی گجراتی، ان کا لقب مجد الدین تھا۔ اپنے دور کے علامہ، محدث اور شیخ تھے۔ یوں تو تمام علوم مروّجہ کے عالم تھے لیکن حدیث اور رجال کے تو بہت ماہر تھے اور اس موضوع کے کبار و مشاہیر علما میں سے تھے۔ سلطان محمود شاہ کے عہد

---

[۲۵] لطائف قدسی، ص ۴۲ تا ۴۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۱۰ تا ۳۱۲۔

میں گجرات آئے۔ اس نے ان کی بے حد تعظیم کی، اپنی مجلسوں میں اہم مقام عطا کیا، قربتِ سلطانی سے نوازا، اپنے بیٹے منظفر کا اتالیق مقرر کیا اور ان کے علم و فضل کی وسعت و فراوانی سے متاثر ہو کر انھیں رشید الملک کا خطاب دیا۔

اس کے بعد جب منظفر شاہ حلیم سریر آرائے مملکت گجرات ہوا تو ۹۱۷ھ میں اس نے ان کو اپنے کبار امرا پر تقدم کا شرف بخشا، انھیں اپنا وزیر مقرر کیا اور خداوند خاں کا لقب مرحمت کیا۔ چودہ سال مسندِ وزارت پر فائز رہے۔ پھر جب عنانِ حکومت منظفر شاہ کے بیٹے بہادر شاہ کے ہاتھ میں آئی تو اس نے ان کو منصبِ نیابت عطا کیا۔ اس منصب پر پندرہ سال متمکن رہے۔ بعد ازاں جب سلطنتِ گجرات میں انقلاب کی لہریں چلیں اور بہادر شاہ، دیو کی طرف نکلا اور بلادِ گجرات میں مغل حکمران ہمایوں فتح کا جھنڈا لہراتا ہوا داخل ہوا تو اس نے شیخ محمد بن محمد ایجی خداوند خاں کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب انھیں ہمایوں سے ملایا گیا تو وہ ان کی گفتگو اور علم و فضل سے بہت متاثر ہوا، ان پر بڑی نوازشیں کیں اور اپنے ندما و جلسا میں شامل کیا۔ پھر وہ انھیں آگرہ لے گیا اور وہ ایک مدت تک ان کے پاس رہے۔ جب ہمایوں، شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران کی طرف بھاگ گیا اور ہندوستان کی زمامِ حکومت شیر شاہ سوری کے ہاتھ میں آئی تو اس نے ان کو گجرات جانے کی اجازت دے دی۔ اس زمانے میں گجرات کا حکمران محمود شاہ صغیر تھا۔ وہ احمد آباد گئے اور وہیں وفات پائی۔ ان کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔[۱۲]

۲۰۱- شیخ محمد بن محمد گجراتی

شیخ محمد کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ محمد بن محمد بن محمد بن شاہو بن تکو در بن جام نندہ قرشی سندھی۔ ۱۲ ربیع الاول ۸۶۱ھ کو گجرات (کاٹھیاواڑ) میں پیدا ہوئے اور اپنے عصر

---

[۱۲] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۱۲، ۳۱۳۔

کے مشاہیر اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ حصولِ علم کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ اپنے دَور کے علاّمہ، مفتی اور مستند عالمِ دین تھے اور علاّمہ حمید الملک شمس الدین بن رکن الدین بن تاج الدین گجراتی کے نام سے معروف تھے۔ ان کا شمار فقہ و اصول اور علومِ عربیہ کے ماہر علما میں ہوتا تھا۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔ ان کے بیٹے شیخ عبدالعزیز نے بھی ان ہی سے کسبِ علم کیا۔ یکم صفر ۹۳۲ھ کو گجرات میں فوت ہوئے۔ شیخ ابنِ حجر مکی نے ان کے حالات میں ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے [۲۲]

۲۰۲- شیخ محمد بن محمد مالکی مصری

شیخ محمد بن محمد بن عبدالرحمٰن بن حسن جلال الدین مصری، علامۂ عصر تھے اور فقہی مسلک کی رُو سے مالکی تھے۔ ان کی ماں اُمّ ولد تھیں۔ شیخ عبدالقادر حضرمی نے النور السافر میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ۱۷ شعبان ۸۵۶ھ کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد کی آغوشِ تربیت میں قرآنِ مجید حفظ کیا اور مشہور اصولی و فروعی ابن حاجب کا الفیہ زبانی یاد کیا جو علم نحو کی معروف کتاب ہے۔ کچھ اور کتابیں بھی ان سے پڑھیں۔ اپنے باپ کے پاس زیادہ عرصہ نہیں رہے۔ باپ کی طرف سے بہت سے مال و دولت کے وارث بنے تھے، لیکن یہ تمام دولت بہت ہی کم مدت میں ضائع کر دی۔ پھر تنگ دست ہوگئے اور صعید چلے گئے۔ بعد ازاں مکّہ معظمہ کا قصد کیا۔ وہاں حافظ شمس الدین سخاوی سے موطا، مسند امام شافعی، سنن ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ کتابوں کا درس لیا۔ نیز ان کو ان کی شرح الفیہ اور دیگر تصانیف باقاعدہ سنائیں اور عرصہ تک ان کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل کیا۔ خود حافظ سخاوی نے اپنی تاریخ الضوء اللامع میں اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں، شیخ محمد بن محمد مالکی بے حد ذکی اور ذہین تھے۔ حفظ و ذکاوت میں سب سے تیز تھے۔ بہت سی کتابیں انھیں مستحضر

---

[۲۲] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۱۳ بحوالہ ظفر الوالہ۔

تھیں اور قادر الکلام تھے لیکن ان کی سیرت کے بعض پہلو پسندیدہ نہ تھے۔ یمن بھی گئے اور زبیلع جاکر درس و تدریس اور احادیث پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر عازم کنبایت ہوئے اور اس کے والی سے ملے۔

شیخ جار اللہ بن فہد کہتے ہیں، وہ ہندوستان آئے تو ان بلاد میں ان کی بدرجہ غایت تعظیم و توقیر کی گئی اور علاقہ گجرات کے حکمران سلطان محمود شاہ کے دربار میں ان کو بڑا تقرب حاصل ہوا۔ ان کی معرفتِ حدیث اور فصاحت و بلاغت کی وجہ سے سلطان محمود نے ان کو ملک المحدثین کا خطاب عطا کیا اور یہ پہلا خطاب تھا جو ان بلاد میں کسی اہلِ علم کو دیا گیا۔ گجرات میں یہ وزرائے مملکت اور اکابر دولت کے مرکزِ توجہ قرار پائے اور انھیں بے پناہ عزت و تکریم حاصل ہوئی۔ سلطان محمود کی زندگی میں ان کی یہ حالت تھی کہ ان کے ذریعے وظائف و صلات کا سلسلہ حرمین شریفین تک جاری تھا۔ محمود کی وفات کے بعد تختِ گجرات کا وارث اس کا لڑکا سلطان مظفر حلیم بنا تو بعض وزرا نے ان کے خلاف اس کے کان بھرنا شروع کیے جس سے متاثر ہو کر وہ ذہنی طور سے ان سے دُور ہو گیا اور کچھ وظائف بھی بند کر دیے۔ پھر اسی اثنا میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ظفر الوالہ میں بتایا گیا ہے کہ حافظ سخاوری الضوء اللامع میں رقم طراز ہیں کہ انھوں نے مختلف شیوخ سے شیخ محمد بن محمد مالکی کے لیے چالیس احادیث جمع کیں اور اس کتاب کو الفتح المبین الھانی لعلو سند ملك المحدثین القاضی جلال الدین الکنانی کے نام سے موسوم کیا۔ اس کتاب کی، ان بہت سے مشائخ نے جنھوں نے ان سے کوئی فائدہ حاصل کیا، نظم اور نثر میں تعریف کی اور اس تعریف میں حافظ سخاوی کو بھی شامل کیا اور ان کو بھی۔ ! یہ سب چیزیں حافظ سخاوی نے ان کو بھیج دیں، جس سے وہ بہت خوش ہوئے اور اس کی وجہ سے ان کی بڑی توصیف کی اور لوگوں کو اس کے مندرجات سے آگاہ کیا۔

اس عالمِ دین نے ۹۲۹ھ کو احمد آباد میں وفات پائی اور وہیں مدفون

ہوئے [۵۲۳]

۲۰۳- شیخ محمد بن محمود ٹھٹھوی سندھی

شیخ محمد بن محمود بن ابو سعید ٹھٹھوی سندھی، عالم کبیر اور بلادِ سندھ کے شیخ تھے۔ ان کا شمار فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ ۹۷۰ھ میں فوت ہوئے [۵۲۴]

۲۰۴- سید محمد بن منتخب امروہوی

سید محمد بن منتخب بن کبیر بن چاند بن منتخب حسینی امروہوی، میر عدل کے نام سے معروف تھے۔ سید شرف الدین حسینی نقوی کی اولاد سے تھے۔ امروہہ میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور حصولِ علم کے لیے سنبھل کا عزم کیا۔ وہاں شیخ حاتم بن ابو حاتم سنبھلی کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ ان سے خاصی مدت منسلک رہے اور کتب درسیہ پڑھیں۔ حدیث اور دیگر علوم کی تحصیل سید جلال الدین بدایونی سے کی اور ان کی خدمت میں رہ کر علوم میں مہارت پیدا کی اور فتویٰ و تدریس کی مسند پر فائز ہونے کے لائق ٹھہرے۔

ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر مغل حکمران جلال الدین اکبر نے ان کو امارتِ عدل کے عہدہ پر فائز کر دیا تھا اور یہ میر عدل کے لقب سے معروف ہو گئے تھے۔ یہ خدمت انھوں نے طویل عرصہ تک انجام دی اور نہایت وقار و عظمت کے ساتھ اس کی نازک ذمہ داریوں کو نباہا۔ اپنی ذات میں یہ متقی اور پرہیز گار بزرگ تھے۔ اور حدود اللہ کو قائم کرنے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اپنی مثال آپ تھے۔ دین کے معاملے میں انتہائی متصلب، منکرات کے دشمن تھے۔ اہل ہویٰ اور غلط کردار

---

[۵۲۳] ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۱۱۷، ۱۱۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۱۳ تا ۳۱۵۔

[۵۲۴] مآثر رحیمی، ج ۲، ص ۳۲۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۱۷۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۷۔

لوگوں پر شدید نکیر کرتے تھے اور اس ضمن میں کسی کی قطعاً پرواہ نہ کرتے۔ ان کے عہد میں بے دین اور ملاحدہ کو کسی امر شرعی میں مداخلت کرنے اور کسی کو دھوکا دینے کی جرأت نہ تھی۔ حتیٰ کہ قاضی القضاۃ بھی قضاو عدل کے معاملے میں دخل دینے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔

ایک مرتبہ حاجی ابراہیم سرہندی نے ان کی موجودگی میں دربار میں بادشاہ کے سامنے زعفرانی اور سرخ لباس پہننے کا فتویٰ دیا تو سید موصوف نے ان کو سخت الفاظ میں ڈانٹا، ان کو تنبیہ کی اور ان کے خلاف فیصلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ خود بادشاہ ان سے مرعوب اور خوف زدہ تھا۔ اسی لیے انھیں ۹۸۴ھ کو بھکر منتقل کر دیا گیا تھا۔ بعد ازاں تھوڑی مدت اس خدمت پر مامور رہے اور ۹۸۶ھ میں وفات پا گئے۔[۲۵]

۲۰۵۔ شیخ محمد بن منکن مُلّانوی

شیخ محمد بن منکن بن داؤد بن شہاب الدین رومی بکری مُلّانوی، ۱۹ محرم ۸۱۰ھ کو پانی پت میں پیدا ہوئے اور ذرا ہوش سنبھالا تو مُلّا محمد سعید کے حلقۂ درس میں شمولیت کی۔ ان سے فارسی کے کچھ رسائل، صرف و نحو کی چند کتابیں اور عربی میں فقہ کی بعض مختصرات پڑھیں۔ پھر لاہور آئے، لاہور سے ملتان کا عزم کیا اور وہاں زاویۂ شیخ بہاء الدین زکریا میں سکونت اختیار کی۔ ملتان کے زمانۂ قیام میں تمام کتبِ درسیہ اور کتبِ احادیث کی تحصیل مولانا حسین ملتانی سے کی۔ پھر عازم حجاز ہوئے، سعادتِ حج بیت اللہ حاصل کی اور مشائخ مکّہ سے علم حدیث حاصل کیا۔ مکّہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ گئے۔ وہاں ایک سال سات مہینے مقیم رہے۔ پھر ہندوستان واپس آئے اور پانی پت میں شادی کی۔ اس کے بعد مشرقی ہند کے سفر پر روانہ

۲۵۔ منتخب التواریخ، ص ۴۰۳۔ طبقاتِ اکبری، ص ۴۸۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۱۸،۳۱۷۔

ہوئے ۔ اس سفر کے دَوران لکھنؤ میں شیخ محمد اعظم حسینی کرنالی اور ان کے مسترشد شیخ محمد مینا اور شیخ سعدالدین سے ملاقات کی۔ وہاں سے شہر اودھ گئے، جسے اب اجودھیا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ وہاں شیخ احمد صوفی راوتی سے ملے، ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے اور سات سال ان سے منسلک رہے ۔ اب تصوّف و طریقت کی طرف مائل ہو چکے تھے اور اپنے آپ کو اخذِ فیض کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں مختلف مقامات پر گئے اور متعدد مشائخ کی خدمت میں حاضری دی، خاصا عرصہ ان کی صحبت و ملازمت اختیار کیے رکھی اور ان سے اخذِ فیض کیا۔ سلاطین و امرا کے نزدیک بھی انھیں قدر و منزلت حاصل تھی چنانچہ ہندوستان کا فرماں رواں سکندر لودھی دہلی آکر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے حکم سے اس کے لڑکے سلطان ابراہیم لودھی نے دہلی میں ان کا استقبال کیا۔ یہ دونوں لودھی حکمران ان کے نہایت عقیدت مند تھے ۔

شیخ محمد بن منکن ملانوی، جہاں بہت بڑے عالم دین اور فقیہ تھے، وہاں مشہور صاحبِ طریقت بھی تھے ۔ انھوں نے ایک سو ستائیس (۱۲۷) سال عمر پاکر یکم رجب ۹۳۷ھ کو وفات پائی ۔

ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ تحصیلِ علم کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو تصوّف و طریقت کے حوالے کر دیا تھا ۔ درس و تدریس اور دیگر علمی مشاغل سے منقطع ہو گئے تھے ۔[۲۶]

۲۰۶ - سید محمد جون پوری

سید محمد بن یوسف جون پوری اپنے دَور کے بہت بڑے عالم تھے ۔ یہ دسویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کی وہ شخصیت تھے جنھوں نے مہدویت کا دعویٰ کیا اور اس

---

۲۶ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۱۸ تا ۳۲۰ بحوالہ مصباح العاشقین ۔

کے نتیجے میں نہ صرف ہندوستان کے اہلِ علم میں بلکہ بیرونی دنیا کے پڑھے لکھے لوگوں میں بحث و مذاکرہ کا ایک نیا باب وا ہو گیا تھا اور فکر و نظر کے حلقوں میں حرکت و جنبش کی عجیب و غریب لہریں اٹھنے لگی تھیں۔

سید محمد جون پوری ۸۴۷ھ کو جون پور میں پیدا ہوئے۔ شیخ دانیال بن حسن عمری بلخی سے قرآن مجید حفظ کیا اور دیگر علوم کے لیے بھی پہلے پہل ان ہی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ابتدائے عمر ہی میں فضائلِ علم سے بہرہ ور ہو گئے تھے۔ ابھی پندرہ سال کی عمر کو پہنچے تھے کہ مباحثہ و مناظرہ کے میدان میں اُتر آئے اور بڑے بڑے اہلِ علم سے نہایت جرأت اور اعتماد کے ساتھ دقیق سے دقیق علمی مسائل پر گفتگو کرنے لگے۔ اسی لیے اس نواح کے علما اور علم دوست حضرات نے ان کو "اسد العلما" کا خطاب دیا تھا۔ بے حد ذکی، ذہین، معاملہ فہم، حاضر جواب اور صاحبِ مطالعہ تھے۔ عرصہ تک درس و تدریس اور افادۂ طلبا میں مصروف رہے۔ مختلف علوم و فنون پر گہری نظر رکھتے تھے اور وعظ و تذکیر اور بیان و تقریر میں اس دور کی عدیم المثال شخصیت تھے۔ تصوّف و طریقت سے بھی لگاؤ پیدا ہوا اور شیخ دانیال سے کسبِ فیض کیا۔ مدّت تک ریاضت و مشاہدہ میں مشغول رہے۔ بعد ازاں وطن و علاقہ کو خیر باد کہا اور اہل و عیال اور تلامذہ و رفقا کے ساتھ پہاڑوں کی چوٹیوں اور غاروں کو اپنا مسکن قرار دے لیا اور مدتِ مدید تک انزوا و علیحدگی کی زندگی اختیار کیے رکھی۔

اب ان کی زندگی نے نیا موڑ کاٹا اور اثنائے سفر میں مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ پھر چندیری آئے جو بلادِ مالوہ کا بہت بڑا شہر تھا۔ وہاں وعظ و خطابت کے سلسلے کا آغاز کیا اور بہت سے لوگ ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہو گئے۔ اس دعوے کے نتیجے میں طبقۂ علما و مشائخ میں وہ اختلاف و نزاع کا ہدف بن گئے اور ولایتِ شہر کو ان کے اخراج پر مجبور کیا گیا۔ چنانچہ وہ چندیری کی سکونت ترک کر کے مالوہ کے دار الخلافہ مانڈو چلے گئے۔ وہاں مالوہ کا حکمران غیاث الدین خلجی ان کا

معتقد ہوگیا اور شیخ اللہ داد نے ان کی بیعت کی۔ مانڈو میں ان کی بڑی تعظیم کی گئی اور ان کے مرتبہ و منزلت میں بے حد اضافہ ہوا۔ وہاں سے علاقہ گجرات کے ایک شہر جانپانیر میں منتقل ہو گئے۔ جانپانیر میں انھوں نے امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور رشد و ہدایت کا سلسلہ نہایت شد و مد سے شروع کیا۔ وہ عوام کو زہد و عبادت کی ترغیب دیتے، ترک دنیا کی تلقین کرتے اور شریعت غرا کے احکام و اوامر پر عمل کرنے کا حکم دیتے تھے۔ ان کی شہرت اور نیکی سے اثر پذیر ہو کر مملکتِ گجرات کے حکمران سلطان محمود بیگرہ نے بھی ان کی مجلس میں حاضر ہونے کا قصد کیا، مگر علمائے گجرات نے اس کو ان کے پاس جانے سے روکا اور ان کی نکیر کی۔ اس کے بعد وہ برہان پور اور دولت آباد سے ہوتے ہوئے احمد نگر پہنچے۔ اس سفر میں بعض مشہور شیوخ و علما بھی ان سے بیعت ہوئے۔ پھر وہ گلبرگہ (دکن) گئے۔ اور وہاں سے حرمین شریفین کا عزم کیا۔ مکہ مکرمہ پہنچے اور وہاں جاکر دوسری مرتبہ اپنی مہدویت کا اعلان کیا اور کہا: من تبعنی فهو مؤمن (جو میری اتباع کرے گا وہ مومن ہے)۔ یہ ۹۰۱ھ کا واقعہ ہے۔ اس موقع پر سب سے پہلے شیخ نظام اور قاضی علاء الدین نے ان کی تصدیق کی اور ان کے دعویٰ مہدویت کو تسلیم کیا۔

مکہ مکرمہ سے مراجعتِ ہند کی اور گجرات کے شہر احمد آباد میں اقامت گزین ہوئے۔ وہاں بھی اپنے معمول کے مطابق تذکیر و موعظت میں مصروف ہو گئے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے بیعت کی۔ احمد آباد میں ۹۰۳ھ کو تیسری مرتبہ علی رؤس الاشہاد اعلان مہدویت کیا۔ اس موقع پر علمائے احمد آباد نے متفقہ طور پر ان کو شہر سے نکال دینے کا فتویٰ دیا۔ چنانچہ والیٔ گجرات سلطان محمود نے ان کو شہر بدر کر دیا اور وہ ایک موضع سولہ سانبج چلے گئے۔ پھر پٹن اور وہاں سے برلی کا قصد کیا جو پٹن سے تین میل کی مسافت پر واقع تھا۔ یہاں انھوں نے چوتھی مرتبہ اپنے دعویٰ مہدویت کا اعلان کیا، اس کے منکر کو کافر ٹھہرایا۔ علما نے اس باب میں ان کی تعقیب کی اور ان سے باقاعدہ مباحثہ کیا۔ بالآخر یہاں سے بھی ان

کو نکال دیا گیا۔

اب وہ گجرات سے نکلے اور سندھ کی راہ لی۔ سندھ کے لوگ ان سے بے حد متاثر ہوئے اور ایک جمِ غفیر نے ان کے مذہب میں شمولیت اختیار کی۔ ان کی سرگرمیوں اور کثرتِ متبعین کو دیکھ کر والیٔ سندھ سخت پریشان ہوا اور ان کے قتل کا فیصلہ کیا مگر اس کے وزرا وندما نے اس کو اس اقدام سے روک دیا اور صرف علاقۂ سندھ سے اخراج کے حکم کو کافی سمجھا۔ سندھ سے وہ اپنے آٹھ سو رفقا کے ساتھ خراسان اور پھر قندھار گئے۔ قندھار کے والی مرزا شاہی بیگ نے شہر کی جامع مسجد میں علما کا محضر طلب کر کے ان کو اس محضر میں پیش کیا۔ شیخ نے علما کے محضر میں ایک تقریر کی، جس میں وہ خود بھی روئے اور لوگوں کو بھی رُلایا۔ شاہی بیگ اس تقریر سے بہت متاثر ہوا اور حکم دیا کہ یہ جہاں جی چاہے جائیں، ان کو کسی قسم کی مزاحمت نہ کی جائے۔ قندھار سے وہ ایک شہر گئے جس کا نام فراہ تھا۔ اس شہر کا امیر ذوالنون ان کے پاس آیا اور انھیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس نے شاہِ خراسان سلطان حسین مرزا کے پاس آدمی بھیجا اور دریافت کیا کہ سید محمد جون پوری کے بارے میں کیا قدم اٹھایا جائے۔ اس کے جواب کے انتظار میں ان کو پورے نو مہینے وہاں ٹھہرنا پڑا لیکن سلطان مذکور کی طرف سے کوئی جواب آنے سے قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ جمعرات کے روز اور ۹۱۰ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد ان کے پیروکار مختلف علاقوں میں پھیل گئے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے لگے۔

شیخ محمد جون پوری، بہت بڑے عالم بھی تھے اور بہت بڑے مجاہد اور جنگ جو بھی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ سلطان حسین شرقی جو جون پور کا آخری بادشاہ تھا اور سلطان بہلول لودھی کے ہاتھوں اپنا تخت و تاج کھو بیٹھا تھا، جب جون پور کے تختِ حکومت پر قابض تھا تو آخری دور میں مہدویوں کی روایت کے مطابق وہ والیٔ گوڑ راجہ دلیپ رائے کا خراج گزار

تھا۔ سید محمد نے وعظ و نصیحت کے ذریعے اس سے کہا کہ وہ اس غیر مسلم کو خراج دینے سے انکار کر دے اور اس سے لڑائی کرے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سید محمد نے پندرہ سَو بیراگی جوان ملازم رکھے تھے۔ جب لڑائی کا بازار گرم ہوا تو مسلمان فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے، لیکن سید محمد جون پوری اپنے پندرہ سو بیراگی جوانوں کے سمیت میدان میں ڈٹے رہے۔ بلکہ سید نے خود آگے بڑھ کر دلیپ رائے کو تہ تیغ کیا اور شکست کو فتح میں بدل دیا۔

مہدویوں کی روایت ہے کہ جب سید موصوف نے راجہ دلیپ رائے پر زور سے وار کیا اور ان کی تلوار راجہ کا سر کاٹتی ہوئی سینے تک پہنچی تو دلیپ رائے کا دل باہر نکل آیا۔ انھوں نے دیکھا کہ مقتول راجہ جس بُت کی پوجا کرتا تھا، اس کی شکل اس کے دل پر کندہ ہے۔ یہ دیکھ کر ان پر جذب کی کیفیت طاری ہوگئی اور سطح ذہن پر یہ بات اُبھر آئی کہ اگر جھوٹے معبودوں کا اتنا اثر ہو سکتا ہے تو حقیقی معبود کا کس درجہ ہوگا۔ یہ کیفیت ان پر بارہ برس تک طاری رہی۔ جب اس سے افاقہ ہوا تو چالیس برس کی عمر میں وطن سے ہجرت کر کے جنگل کی راہ لی اور عرصہ تک مختلف علاقوں اور شہروں میں گھومتے پھرے۔

سید محمد جون پوری کے بارے میں مختلف حضرات نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بعض انھیں صاحبِ مقاماتِ عالیہ اور کشوف و کرامات کا حامل قرار دیتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ ان کا دعویٰ مہدویت کشف پر مبنی تھا اور اس دعویٰ میں وہ غلطی پر تھے۔ بعض کے نزدیک وہ مبتدع اور ایک جدید مذہب کے بانی تھے۔ بعض کا خیال ہے وہ عارف باللہ تھے لیکن دعویٰ مہدویت میں سچے نہ تھے۔ بعض کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ درحقیقت صادق تھے، ان کی نیت نیک تھی، لیکن اس معاملے میں برسرِ حق نہ تھے، وہ غلط فہمی کی بنا پر اپنے آپ کو مہدی قرار دیتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں ان کا اور ان کے متبعین کا ذکر کیا ہے اور

ان کے علم و فضل کی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"میرا خیال یہ ہے کہ سیّد محمد اپنے اس دعویٰ میں سچّے تھے کہ وہ مہدی ہیں اور ملک کی جو حالت اس وقت ہو رہی تھی، وہ یقیناً ایک مہدی کے ظہور کی مقتضی و منتظر تھی، نہ کہ ایک مضل و دجّال کی! البتہ غلطی یہ ہوئی کہ لفظ مہدی کو انھوں نے مہدی آخر الزمان سمجھ لیا۔ چوں کہ شہرت و انتظار عام طور پر اسی مہدی کی نسبت ہے، اور جب لفظ مہدی بولا جاتا ہے تو سب سے پہلے ذہن اسی طرف منتقل ہوتا ہے، اور یہ رائے بھی اسی صورت میں ہے جب کہ خود ان کی نسبت مہدی آخر الزمان کا مدعی ہونا قطعی طور پر ثابت ہو جائے، ورنہ بہت ممکن ہے کہ ان کے قلب پر جو وارده گزرا ہو، وہ صرف یہ ہو کہ انت المھدی۔ اسی کا انھوں نے اظہار کیا ہو، اور معتقدین نے شہرتِ عام کی بنا پر مہدی آخر الزمان سمجھ کر تمام علائم و آثارِ مرویہ کو ان پر چسپاں کرنا شروع کر دیا ہو[۲۷]"۔

مولانا ابوالکلام نے سیّد محمد جون پوری اور فرقہ مہدویہ کے بارے میں خاصی تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"یہ فرقہ، سیّد محمد جون پوری کی طرف منسوب ہے، جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ مہدی ہونے کے مدعی تھے۔ اگرچہ آگے چل کر اس فرقہ کے عقائد میں بہت سی نئی نئی باتیں اور حدِّ غلو سے بھی گزرے ہوئے اعتقادات شامل ہو گئے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی بنیاد صداقت و حق پرستی پر پڑی تھی، یعنی دعوت و تبلیغ حق و احیائے شریعت و قیام فرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اس کا مقصد اصلی تھا۔ اور خود سیّد محمد اور ان کے پیروؤں کی پہلی جماعت کے اکثر بزرگ بڑے ہی پاک باز اور خدا پرست لوگ تھے۔ اس قسم کے معاملات ہمیشہ ابتدا میں کچھ اور ہوتے ہیں اور آگے چل کر کچھ اور بن جاتے ہیں۔ اور فتنہ غلو و تاویل پھیل

---

[۲۷] تذکرہ، حاشیہ ص ۷

امتوں کی طرح اس امت کی ہر جماعت کے لیے بھی ایک بڑا فتنہ رہا ہے یہی حالت اس جماعت کو بھی پیش آئی اور رفتہ رفتہ اس کی بنیادی صداقت، اخلاف کے غلو و محدثات میں گم ہو گئی۔[۲۸]

آگے چل کر اس زمانے کے ہندوستان کی طوائف الملوکی، بدعات و منکرات کی کثرت، لوگوں کی احکام شرع سے روگردانی اور امورِ دینی سے انحراف کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

"نویں صدی ہجری کا وہ زمانہ جو اکبر سے پہلے گزرا، ہندوستان میں سخت بدامنی اور طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ روز بادشاہتیں بنتی اور بگڑتی تھیں، اور کوئی مرکزی حکومت باقی نہیں رہی تھی جو احکامِ شرع کے اجرا و قیام کی ذمہ دار ہوتی علمائے حقانی بہت کم تھے اور علمائے دنیا ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ دنیا طلبی اور مکر و زُور کی گرم بازاری تھی، اور سب سے زیادہ یہ کہ جاہل صوفیوں کی بدعات و منکرات نے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا۔ یہ حال دیکھ کر سیّد موصوف نے احیائے شریعت اور قیام امر بالمعروف کا غلغلہ بلند کیا اور لوگوں سے کہا کہ اب نہ کسی مجاہدہ کی ضرورت ہے اور نہ ذکر و شغل کی۔ سب سے بڑا مجاہدہ یہی ہے کہ خلق اللہ کو سیدھی راہ پر لگاؤ اور احکامِ شرعیہ کے قیام کی راہ میں اپنی جانیں تک لڑا دو۔ عشق کی صداقت اور قلب کی پاکی نے ان کی دعوت و تذکیر میں ایسی تاثیر بخشی تھی کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہزاروں آدمی حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے اور متعدد سلاطینِ وقت نے ان کی بیعت کی۔ ان لوگوں کے طور طریق کچھ عجیب عاشقانہ و والہانہ تھے، اور ایسے تھے کہ صحابۂ کرام کے خصائص ایمانی کی یاد تازہ کرتے تھے۔ عشق الٰہی کی ایک جلی جماعت تھی، جس نے اپنے خون کے رشتوں اور وطن و زمین کی فانی الفتوں کو ایمان و محبت کے رشتے پر قربان کر دیا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہ حق میں ایک

---

[۲۸] تذکرہ، ص ۵۲

دوسرے کے رفیق و غم گسار بن گئے تھے۔ امیر و فقیر، اعلیٰ و ادنیٰ، سب ایک حال اور ایک رنگ میں رہتے اور بجز خلق اللہ کی ہدایت و خدمت اور احکامِ شرع کے اجرا و قیام کے اور کسی کام سے واسطہ نہ رکھتے۔[۲۹]

سید محمد جون پوری نے اپنے متبعین و معتقدین کے لیے آٹھ اصول مقرر کیے تھے۔ (جن کا ذکر آگے آرہا ہے) کہ وہ ان پر عمل کریں اور اپنی زندگیوں کو ان اصولوں کے قالب میں ڈھالیں، مگر انھوں نے ان کو قوانینِ شرع کی حیثیت دے دی اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو کافر ٹھہرایا۔ مثلاً ان اصولوں میں سے ایک یہ تھا کہ مال و دولت سے تعلق محبت منقطع کرلیں اور اس حد تک ایثار کا ثبوت دیں کہ اسے ضرورت مندوں اور مستحقین میں تقسیم کردیں، لیکن ان کے معتقدین نے اس کو یہاں تک بڑھایا کہ جب مال سب کا مشترکہ ہے اور کسی ایک کی مِلک نہیں تو پھر ورثے اور ترکے کا کیا مطلب ؟ کسی کے اعزہ و اقارب کو اس میں سے کچھ بھی نہیں ملنا چاہیے۔ یعنی انھوں نے اس کو قانونِ توریث کے مقابلے میں ایک قانونِ شرعی سے تعبیر کیا۔ اس طرح اور بھی بہت سے امور فرقہ مہدویہ نے اپنے مذہب میں داخل کرلیے تھے اور اس میں بہت آگے بڑھ گئے تھے۔

سیّد محمد جون پوری کی بعض حضرات نے مخالفت کی اور بعض نے موافقت۔ ان کے مخالفین میں بڑے بلند مرتبہ لوگوں کے نام تذکروں میں مرقوم ہیں جن میں شیخ علی متقی، شیخ ابنِ حجر مکّی، شیخ عبدالحق محدّث دہلوی اور شیخ اسد مکی لائق تذکرہ ہیں، مگر ان میں سے کسی نے ان کی تکفیر نہیں کی۔ شیخ وجیہہ الدین گجراتی کے سامنے، جو اس دَور کے بہت بڑے عالم تھے، جب سیّد محمد اور ان کے بعض متبعین کی تکفیر کا فتویٰ پیش کیا گیا تو انھوں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ شیخ علی متقی نے مہدویہ کے غلو اور محدثات کے رَد میں رسالہ لکھا، لیکن وہ خود

---

[۲۹] تذکرہ، ص ۵۳، ۵۴

سید موصوف کی نسبت لکھتے ہیں کہ کفِ لسان اولیٰ ہے۔ سید رفیع الدین محدث جو بہ یک واسطہ حافظ ابن حجر عسقلانی کے شاگرد تھے اور شیخ بڈھا دانا پوری جو اس عہد کے استاذ الاستاتذہ تھے، ملّا عبدالقادر بدایونی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "با مہدویہ حسنِ ظن داشتند"۔

مولانا ابو الکلام آزاد لکھتے ہیں:

"حضرت شاہ ولی اللہ کا قول شاہ عبدالعزیز صاحب نے ایک مکتوب میں نقل کیا ہے کہ سید محمد، عالم حق اور واصل باللہ تھے۔ بعض خواطر و واردات ان پر ایسے گزرے کہ ان کے درک و فہم میں درماندہ و عاجز رہ گئے اور خود اپنے مقام کی نسبت دھوکے میں پڑ گئے۔ یہ بات نہ تھی کہ انھوں نے دانستہ غلط دعویٰ کیا ہو۔ حضرت مجدد صاحب اور مرزا مظہر جان جاناں سے بھی ایسا ہی منقول ہے[۱۳۵]"

بہر حال اکثر مشائخ وقت اور علمائے حق یا تو ان سے حسنِ ظن رکھتے تھے یا اقلاً ان کے بارے میں توقف اور سکوت سے کام لیتے تھے۔

فرقہ مہدویہ نظم و نسق کی مضبوط لڑی میں منسلک تھا، یہی وجہ ہے کہ سید محمد جون پوری کی وفات کے بعد بھی ان کی دعوت کا سلسلہ جاری رہا اور بے شمار علما و صلحا اور اپنے دور کے متقی و با اثر لوگ اس جماعت یا تحریک میں شامل ہوئے۔ کچھ اہل علم نے ان کی شدید مخالفت کی، جن میں علمی اعتبار سے شیخ علی متقی کا نام قابل ذکر ہے، انھوں نے ان کے رد میں باقاعدہ کتاب لکھی مگر انھیں کافر کہنے سے سکوت اختیار کیا۔ اسی طرح سیاسی اعتبار سے مخدوم الملک عبداللہ انصاری نے ان کو ہدفِ تنقید ٹھہرایا اور مہدویوں کے اثر و رسوخ کی راہ میں رکاوٹ بنے۔

مہدویہ جماعت کا ایک خاص نقطہ فکر تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ فرائض و واجباتِ قرآنی دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ احکام شامل ہیں، جن کا تعلق نبوت

---

[۱۳۵] تذکرہ، ص ۶۹، ۷۰

اور شریعت سے ہے۔ ان احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلسانِ شریعت مفصل بیان فرما دیا ہے۔ دوسری قسم ان احکام کو محیط ہے جو ولایتِ محمدیہ سے متعلق ہیں۔ اب مشیتِ الٰہی کو منظور ہوا کہ ان احکام کی تبلیغ بھی ہو جائے۔ لہٰذا حضرت سید محمد مہدی مبعوث ہوئے، جو دافع ہلاکتِ امتِ محمدیہ، ناصر شریعتِ محمدی اور مبلغِ ولایتِ محمدی ہیں۔ مقامِ ولایت میں جو امور فرض ہیں اور ارکانِ دین کا درجہ رکھتے ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ ترکِ دنیا
۲۔ صحبتِ صادقین
۳۔ عزلت از خلق
۴۔ توکل علی اللہ
۵۔ طلبِ دیدارِ الٰہی
۶۔ عُشر
۷۔ ذکرِ کثیر
۸۔ ہجرت

ان اصولوں کی پیروی مہدویوں کے نزدیک ایک خاص انداز اختیار کر گئی تھی، جس کی وجہ سے کئی مرتبہ حکومتِ وقت سے ان کا تصادم بھی ہوا، اور ان میں تشدّد و تصلّب کا رنگ غالب آیا۔ اس ضمن میں انھوں نے بارہا علمائے حق کی مخالفت بھی کی اور اس میں حد سے تجاوز کر گئے [۱۳۱]

---

[۱۳۱] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ منتخب التواریخ، حاشیہ ص ۲۷۱، ۲۷۲۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۹۷ تا ۲۰۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۲۲ تا ۳۲۶ — ردِ کوثر، ص ۲۴ تا ۳۲۔ تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد — تاریخ معصومی، ص ۲۷۷ — ائمہ تلبیس، حصہ دوم، ص ۲۹۴ تا ۳۱۸ — تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۶۸۳ تا ۶۸۷۔

۲۰۷- شیخ محمد بن یوسف برہان پوری

شیخ محمد بن یوسف بن کمال الدین قرشی ماوندی، ان کا لقب شیخ قطب الدین بن تاج الدین بن کمال الدین تھا اور شیخ بھکاری کے نام سے معروف تھے۔ اپنے دور کے عالم و فقیہ تھے۔ تصوّف سے بھی لگاؤ تھا اور ان کا شمار کبار مشائخ میں ہوتا تھا۔ ان کے جدِّ امجد شیخ کمال الدین ہندوستان آئے اور رنتھنبور میں سکونت گزین ہوئے۔ وہیں شادی کی اور اللہ نے اولاد عطا کی جن میں ایک لڑکے کا نام شیخ یوسف تھا، جو بعد کو شیخ تاج الدین کے عرف سے معروف ہوئے۔ شیخ یوسف کی ولادت ۸۸۵ھ میں ہوئی۔ جوانی کو پہنچے تو مانڈو میں ان کی شادی کی گئی۔ شیخ قطب الدین محمد ۹۰۲ھ کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے علم ظاہری و باطنی کی تعلیم شیخ ابراہیم بن معین الدین حسینی ایرجی سے حاصل کی اور خود ان سے قاضی ضیاء الدین عثمانی نیوتنی اور بہت سے علماء و مشائخ نے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا۔

شیخ قطب الدین محمد بن یوسف عرف بھکاری اپنے دور کے فقیہ بھی تھے اور صاحبِ طریقت بزرگ بھی۔ انھوں نے ۱۲ ربیع الاول ۹۷۲ھ کو برہان پور میں وفات پائی۔ تصوف کے موضوع پر ان کی تصنیفات بھی ہیں، جن میں ایک کتاب کا نام جواہر الاسرار ہے [۳۲]۔

۲۰۸- شیخ محمد اوچی

شیخ محمد بن محمد اوچی، اپنے عصر کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ فقہ اور دیگر علوم کے ماہر تھے۔ مدعی مہدویت شیخ محمد بن یوسف جون پوری، والیِ سندھ جام نظام الدین کے عہد میں سندھ گئے تو وہ ان کے قتل کے درپے تھا، مگر شیخ محمد بن محمد

---

[۳۲] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۲۶ بحوالہ مجمع الابرار۔

اوچی نے اس کو ان کے قتل سے باز رکھا۔ جب علاقۂ ملتان میں فسادات پھیلے تو شیخ محمد بن محمد اوچ سے بھکر چلے گئے تھے اور وہاں سے ٹھٹھہ منتقل ہو گئے تھے۔ مرزا شاہ حسین والیِ سندھ نے ان کو قاضی شکر اللہ سندھی کی جگہ قاضی مقرر کر دیا تھا۔ انھوں نے مرزا عیسٰی کے ایامِ حکومت میں وفات پائی اور مرزا عیسٰی ۹۶۲ھ کو تختِ سندھ پر متمکن ہوا تھا۔[۳۳]

۲۰۹۔ مولانا مفتی محمد لاہوری

مولانا مفتی محمد لاہوری، شیخ وقت، عالم کبیر، محدثِ عصر اور باتفاقِ علما صاحبِ فضل و کمال تھے۔ لاہور کے منصبِ افتا پر فائز تھے۔ کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالمِ دین تھے۔ اپنے حلقۂ درس میں صحیح بخاری اور مشکوٰۃ المصابیح کے اختتام کے موقع پر وسیع پیمانے پر دعوتِ طعام کا اہتمام کرتے، جس میں تمام علما و مشائخ کو بلاتے اور لذیذ و عمدہ کھانوں سے ان کی تواضع فرماتے۔ عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ نوّے سال کی عمر کو پہنچ کر کبر سنی کی بنا پر سلسلۂ درس ترک کرنا پڑا۔[۳۴]

۲۱۰۔ شیخ محمد نائطی فقیہ

شیخ محمد بن ابو محمد نائطی، شافعی المسلک تھے اور اپنے دَور کے عالم و فقیہ تھے۔ علم فقہ پر ان کے عبور کا یہ عالم تھا کہ لفظ فقیہ ان کے نام کا جز ہو گیا تھا اور یہ فقیہ محمد نائطی کے نام سے معروف تھے۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو حجاز تشریف لے گئے۔ شیخ علی متقی سے اخذِ علم کیا۔ سال میں چھ مہینے مکہ مکرمہ سکونت

---

[۳۳] تحفۃ الکرام، ص ۵۹۳، ۶۵۵، ۶۵۶ — تاریخ معصومی، ص ۲۸۰ — مآثر رحیمی ج ۲، ص ۳۲۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۲۶۔

[۳۴] منتخب التواریخ، ص ۳۳۱ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۲۷۔

رکھتے اور چھ مہینے مدینہ طیبہ رہتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان سے ملاقات کی تھی۔ انھوں نے اپنی کتاب زاد المتقین میں ان کا ذکر کیا ہے۔ شیخ محمد فقیہ نائطی نے مدینہ منورہ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے[۳۵]

۲۱۱- قاضی محمد تھانیسری

قاضی محمد بن ابو محمد حنفی تھانیسری، کبار علما میں سے تھے۔ اپنے دَور کے عالمِ دین اور فقیہ تھے۔ شیخ رکن الدین محمد بن عبد القدوس گنگوہی نے لطائفِ قدوسی میں ان کا ذکر کیا ہے[۳۶]

۲۱۲- مولانا محمد حسین یزدی

شیخ محمد حسین یزدی اپنے دَور کے مشاہیر و کبار علما میں سے تھے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور قرأت میں ممتاز درجے پر پہنچے۔ تفسیر اور حدیث کے ماہر تھے۔ تحصیلِ علم کے بعد واردِ ہند ہوئے تو دہلی میں سکونت اختیار کی۔ صاحبِ تصنیفات تھے۔ شمائل ترمذی پر ایک بسیط و مفصل شرح سپردِ قلم کی۔ شمائل پر ایک منظوم رسالہ بھی تحریر کیا۔ ۹۸۱ھ کو دہلی میں وفات پائی[۳۷]

۲۱۳- مولانا محمد درویش جون پوری

مولانا محمد درویش حسینی واسطی جون پوری، نواح غازی پور کے ایک قریہ نونہرہ

---

[۳۵] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۲۸ بحوالہ زاد المتقین۔

[۳۶] لطائف قدوسی، ص ۴۴، ۴۵ ـــ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۳۰

[۳۷] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۳۱ بحوالہ تحفۃ الکرام۔

میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصولِ علم کے لیے جون پور کا قصد کیا۔ وہاں شیخ مبارک بن خیر الدین جون پوری کے زاویہ میں رہنے لگے اور علوم میں تبحّر و پختگی کے مرتبے کو پہنچے۔ وہ شیخ وقت اور فاضل بزرگ تھے۔ ان کا شمار صلحا اور متقی علمائے دین میں ہوتا تھا۔ سلسلۂ نسب سولہ واسطوں سے حضرت زید بن علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہم تک منتہی ہوتا ہے۔ بحث و اشتغال کے ماہر تھے اور افتا و تدریس کی مسند پر فائز تھے۔ شیخ مبارک جون پوری نے اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی تھی۔ جون پور میں سکونت اختیار کر لی تھی، تمام عمر وہاں درس و تدریس میں مصروف رہے۔ ۱۷ ذی الحجہ ۹۹۸ھ کو اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔ ۵۳۸

۲۱۴۔ مولانا محمد سعید خراسانی المعروف میر کلاں

مولانا محمد سعید بن مولانا خواجہ حنفی خراسانی، میر کلاں کے نام سے معروف تھے۔ حنفی المسلک تھے اور اپنے دور کے شیخ، عالم دین اور محدث تھے۔ وسعتِ معلومات کی بنا پر کبارِ علما میں سے گردانے جاتے تھے۔ علامہ عصام الدین ابراہیم بن عرب شاہ اسفرائنی اور دیگر علمائے عصر سے اخذِ علم کیا۔ پھر سید نسیم الدین میرک شاہ بن جمال اللہ حسینی ہروی سے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور ایک عرصہ ان کی صحبت میں رہے۔ بعد ازاں حرمین شریفین کے سفر پر روانہ ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ مکہ مکرمہ میں خاصی مدت اقامت اختیار کیے رکھی۔

عالم کبیر، محدث اور محقق تھے۔ یوں تو سب علوم مروجہ کے ماہر تھے۔ لیکن حدیث میں بالخصوص یدِ طولیٰ حاصل تھا اور اس کے تمام پہلوؤں پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں طریقت و تصوف اور رشد و صلاح کی راہوں پر بھی گام زن تھے۔

---

۵۳۸ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۲۶، ۲۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۳۱۔

ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا، جن میں مشکوٰۃ کے شارح شیخ ملّا علی قاری ہروی صاحب مرقاۃ، سید غضنفر بن جعفر حسینی نہر والی اور بے شمار علما شامل ہیں۔ نہایت کثیر الفوائد بزرگ تھے۔

یہ وہ ہندی عالم دین ہیں جن کے سامنے محدثِ دَوراں اور صاحب تصانیف کثیرہ ملّا علی قاری نے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان کی فراوانیٔ علم و فضل کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بادشاہ ہند جلال الدین اکبر نے ان کو شہزادہ نور الدین محمد جہاں گیر کا اتالیق مقرر کیا تھا اور وہ ان سے بدرجہ غایت تعظیم و توقیر سے پیش آتا تھا۔

مولانا میر کلاں فرشتہ خصلت انسان تھے۔ ان کی شخصیت اسمائے حسنیٰ کی مظہر تھی۔ والدہ کے اس درجہ فرماں بردار تھے کہ اس خیال سے شادی نہیں کی کہ کہیں بیوی ان کی نافرمان نہ نکلے۔ وہ سیدہ اپنے بیٹے کے انتقال کے وقت زندہ تھیں اور ان کی نیکی کا یہ عالم تھا کہ جب بیٹے کا انتقال ہوا، قرآنِ مجید کی تلاوت کر رہی تھیں۔ عزیزوں نے سعادت مند بیٹے کی وفات کی اطلاع دی اور تجہیز و تکفین کی اجازت طلب کی تو اس نیک بخت خاتون نے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا، اجازت دی اور تلاوتِ قرآن میں مشغول ہو گئیں۔ لختِ جگر کی موت پر زبان سے کسی قسم کی بے قراری اور حزن و ملال کا اظہار نہیں کیا۔

دسویں صدی ہجری کے اسلامی ہند کے اس عظیم المرتبت عالم نے اسّی سال عمر پا کر ۹۸۱ھ کو آگرہ میں وفات پائی [۳۹]۔

۲۱۵- قاضی محمد معین لاہوری

قاضی محمد معین لاہوری، حنفی المسلک تھے۔ مشہور و پرتاثیر واعظ، شیخ وقت اور زاہد

---

[۳۹] منتخب التواریخ، ص ۱۱۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۳۱، ۳۳۲ — تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳۰، ۲۳۱ — حدائق الحنفیہ، ص ۳۸۵۔

علم سے آراستہ تھے۔ اپنے عصر کے مشہور فقہا میں سے تھے۔ معارج النبوۃ کے مصنف ان کے پوتے تھے۔ لاہور کے منصبِ قضا پر فائز تھے۔ طویل مدت تک اس مسند پر متمکن رہے اور کبر سنی کی وجہ سے اس سے الگ ہوئے۔ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے میں بہت مشہور تھے۔ ان کا اصل مشغلہ یہ تھا کہ مختلف کتابیں معرضِ کتابت میں لاتے، ان کی تصحیح کرتے اور پھر پڑھنے کے لیے طلبا کو دیتے۔ وہ اس پر اپنی گرہ سے رقم خرچ کرتے تھے۔ فیصلوں میں احتیاط کا یہ حال تھا کہ کہتے ہیں اپنے زمانۂ قضائت میں ایک مقدمہ بھی فیصل نہیں کیا۔ اگر مدعی فیصلے پر اصرار کرتا تو اسے انتہائی عاجزی سے کہتے، خدارا تم دونوں آپس میں صلح کر لو تاکہ میں تمھارے جھگڑے میں اللہ کے نزدیک پکڑا نہ جاؤں اور مجھے اس کے دربار میں شرمسار نہ ہونا پڑے۔ فریقین سے کہتے، تم دونوں دانا ہو، مجھ ایک نادان کو، دو داناؤں سے سابقہ آپڑا ہے، خدارا تم دونوں مجھے اللہ کی بارگاہ میں شرمندہ نہ کرو۔

اگر کوئی عورت، شوہر کے غائب ہونے کی بنا پر تفریق کا مطالبہ کرتی تو وہ تا حدِّ امکان اپنے پاس سے اس کو خرچ دیتے اور کہتے، یہ رقم لو اور شوہر کا انتظار کرو۔ اس سے علیحدگی اختیار نہ کرو۔

اپنی آمدنی، جو اس زمانے میں بہت معقول تھی، تمام تر کاتبوں پر خرچ کر دیتے۔ مختلف کاتبوں سے قیمتی اور عمدہ کتابیں لکھواتے، ان کا مقابلہ و تصحیح کراتے اور پھر جلد بندھوا کر طالب علموں کو مفت تقسیم کر دیتے۔ زندگی بھر ان کا یہی مشغلہ رہا اور لوگوں کو ہزاروں کتابیں بخش دیں۔

انتقال کے بعد ان کے دو لڑکے تھے، ایک پہلوانی میں اور دوسرا کبوتر بازی میں مشہور تھا۔ بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر کی مجلس میں بھی ان کے ان مشاغل کا ذکر آیا۔ اس نے دونوں کو بلایا اور ان کے کھیل تماشے دیکھے۔ اس عالمِ دین اور نامور فقیہ نے ۹۹۵ھ کو لاہور میں انتقال کیا۔[۱۰۴]

---

[۱۰۴] منتخب التواریخ، ص ۴۱۱ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۳۲، ۳۳۳۔

۱

۲۱۶- میرک محمود بن ابو سعید سندھی

شیخ محمود بن ابو سعید ٹھٹھوی سندھی، میرک محمود کے نام سے مشہور تھے۔ حنفی مسلک کے حامل تھے۔ اپنے وقت کے شیخ اور عظیم عالم تھے۔ ان کا شمار فقہائے حنفیہ اور ان کے مشاہیر علما میں ہوتا تھا۔ نقلِ احکام میں ممتاز اور علم فتویٰ میں اپنے دَور کے منفرد عالم تھے۔ بیک وقت متعدد اوصاف کے حامل تھے۔ نہایت خوش خط تھے اور خطِ نستعلیق میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ حسنِ اخلاق میں یکتا، میل جول میں بے نظیر، بے حد نرم مزاج اور منکسر و متواضع بزرگ تھے۔ زہد و عبادت اور جودت و سخا میں اپنی مثال آپ تھے۔ والیِ سندھ مرزا شاہ حسین نے ان کے اوصافِ گوناگوں اور علمی و طبعی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ان کو سرزمینِ سندھ کا شیخ الاسلام مقرر کر دیا تھا۔ تمام عمر اس منصب پر فائز رہے۔

اس بلند مرتبت عالم و فقیہ نے ۹۶۲ھ کو وفات پائی۔ بعض علما نے ان کی تاریخ وفات "رفت میرک آہ آہ" سے نکالی ہے۔[۱]

۲۱۷- قاضی محمود بن احمد نائطی

قاضی محمود بن احمد بن ابو محمد نائطی بیجاپوری، شیخ عصر اور فقیہ تھے۔ علم ظاہری اور سلوک و طریقت سے بہرہ مند تھے۔ مدت تک منصبِ قضا پر فائز رہے۔ پھر سفرِ حج پر روانہ ہوئے، وہاں علم کی دولت حاصل کی۔ بعد ازاں واپس بیجاپور آئے اور وہیں عالمِ آخرت کو سدھارے۔ ان کی وفات کے بعد ۹۹۴ھ کو ان کے بیٹے رضی الدین مرتضیٰ مسندِ قضا پر متعین ہوئے۔ غالباً قاضی محمود بن احمد نائطی

---

[۱] تاریخ معصومی، ص ۲۷۳ — تحفۃ الکرام، ص ۴۳۶ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۳۳ — مآثر رحیمی، ج ۲، ص ۳۱۹، ۳۲۰۔

کی وفات ۹۹۴ھ کو ہوئی[۴۲]

۲۱۸- شیخ محمود بن بابو گجراتی

شیخ محمود کا نسب نامہ یہ ہے۔ محمود بن بابو بن صدر الدین بن جلال الدین بن الیاس عمری۔ یہ شیخ قطب الدین محمود گجراتی کے نام سے مشہور تھے۔ ۸۵۶ھ کو گجرات میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ سید محمد بن عبد اللہ بن محمود حسینی بخاری گجراتی سے علم حاصل کیا۔ بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے اور صالح علما میں سے گردانے جاتے تھے۔ اپنے علاقے کی مسندِ مشیخت پر فائز تھے۔ ان سے خلقِ کثیر نے استفادہ و استفاضہ کیا۔ ۱۰ ر جمادی الاخریٰ ۹۴۳ھ کو فوت ہوئے اور جاں پور میں دفن کیے گئے[۴۳]

۲۱۹- ملک محمود بن پیارو گجراتی

ملک محمود گجراتی کے والد ملک پیارو، برہان پور کے وزیر تھے۔ ۹۴۴ھ میں انھیں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس حادثہ کے بعد ان کے بیٹے محمود گجرات گئے اور وہاں سید عرب شاہ حسینی بخاری گجراتی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ان سے اخذِ طریقت کیا اور حرمین شریفین چلے گئے۔ حج و زیارت کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے اور واپس ہندوستان آ گئے۔ حنفی مسلک کے حامل تھے۔ بہت بڑے عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ گجرات کے مشاہیر فضلا میں سے تھے۔ چوں کہ حکمران طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ملک محمود کے نام سے معروف تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور علومِ عربیہ کے جلیل القدر عالم تھے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد جلال الدین اکبر

---

[۴۲] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۳۳، بحوالہ تاریخ النوائط۔

[۴۳] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۳۴۔

کے پاس آگرہ میں سکونت اختیار کرلی تھی ۔ نہایت فصیح اللسان، مدبر اور دانش ور تھے۔ اسی بنا پر بادشاہی محفلوں میں اکبر کی میزبانی کا انھیں شرف حاصل تھا ۔ اولیاء اللہ کے بڑے معتقد تھے، یہی وجہ ہے کہ اکبر نے ان کو شیخ معین الدین چشتی کے مرقد کا متولی مقرر کر دیا تھا۔ بعد ازاں اس منصب سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ۹۸۵ھ میں اکبر سے گجرات جانے کی درخواست کی۔ اکبر ان کے اخلاص، حسن نیت، علم و فضل اور عذوبت کلام سے بہت متاثر تھا، لہٰذا اجازت دینے پر آمادہ نہ تھا۔ بالآخر بڑے پس و پیش کے بعد اجازت دینا پڑی اور وہ احمد آباد چلے گئے۔ وہاں توکل و قناعت اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرلی۔

فارسی پر عبور رکھتے تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ یہ شعر ان ہی کا ہے:

دارم دلی گرداں کہ من قبلہ نما می خوانمش   رو سوئے ابرویش کند ہر چند می گردانمش

ارض ہند کے اس عالم و فقیہ اور مرد جلیل نے ... ھ کو احمد آباد میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔[۴۴]

۲۲۰۔ قاضی محمود بن حامد گجراتی

قاضی محمود بن حامد بن محمد علوی پیرپوری گجراتی، شیخ وقت، فقیہ اور عابد و زاہد تھے۔ پہلے احمد آباد میں سکونت پذیر تھے۔ بعد کو ۹۲۰ھ میں احمد آباد کے قریب ایک گاؤں میں منتقل ہو گئے تھے، جس کا نام پیر پور تھا۔ وہاں گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرلی تھی۔ عالم دین ہونے کے ساتھ صاحب طریقت بھی تھے۔ ۶۷ سال کی عمر پا کر ۱۳ ربیع الثانی ۹۴۱ھ کو پیرپور میں فوت ہوئے۔ ان کے والد قاضی حامد گجراتی "قاضی چاندہ" کے نام سے معروف تھے۔[۴۵]

---

۴۴ منتخب التواریخ، ص ۳۲۶ — اذکار ابرار، ص ۳۹۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۳۴، ۳۳۵۔

۴۵ اذکار ابرار، ص ۲۳۶، ۲۳۷ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۳۵، ۳۳۶۔

۲۲۱۔ مفتی محمود بن عطاء اللہ امروہوی

مفتی محمود کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ محمود بن عطاء اللہ بن میران بن خطیر بن محمود بن عثمان بن مودود بن خطیر حسینی مودودی امروہوی، شیخ عصر، عالم باعمل اور فقیہ تھے۔ سلطان بہلول لودھی ان کی بے حد تکریم کرتا تھا۔ اس نے ان کو شہر امروہہ کی مسند قضا پر فائز کیا اور ان کے علم و فضل کی وسعت سے متاثر ہو کر ۸۷۰ھ میں اعلم العلما اور ملک العلما کے دو خطاب عطا کیے۔ تمام عمر امروہہ کے منصبِ افتا پر متمکن رہے۔ ہند کے اس عالمِ دین نے ۹۱۷ھ میں انتقال کیا۔[۴۶]

۲۲۲۔ قاضی محمود گجراتی

قاضی محمود بن ابو محمود موربی گجراتی، ایک قریہ مورپ میں پیدا ہوئے، جو اعمالِ گجرات میں واقع تھا۔ وہیں پلے بڑھے اور علم حاصل کیا۔ یہاں تک کہ علومِ مروجہ میں راسخ ہو گئے اور خطۂ ہند کے بہت بڑے عالم، فقیہ اور شیخ شمار کیے گئے۔ طریقت سے بھی تعلق تھا۔ یہ علم شیخ لشکر محمد عارف سے اخذ کیا۔ شیخ لشکر نے ان سے فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کا درس لیا اور انھوں نے شیخ لشکر سے نقد النصوص اور مرآۃ العارفین وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ شیخ محمود کافی عرصہ درس و تدریس میں بھی مصروف رہے۔ زمانۂ تدریس میں ان سے مولانا موسیٰ سندھی اور حکیم عثمان سندھی نے علومِ عربیہ اور علمِ نحو کی تحصیل کی۔

دسویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم کے سنِ ولادت اور سنِ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔[۴۷]

---

[۴۶] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۳۷۔

[۴۷] اذکارِ ابرار، ص ۳۶۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۴۸، ۳۴۹

۲۲۳-میر مرتضیٰ شریفی شیرازی

میر سید مرتضیٰ شریفی شیرازی، شیعہ تھے اور اپنے دور کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ سید شریف زین الدین علی جرجانی کی اولاد سے تھے۔ منطق و حکمت، ریاضی انشا و شعر اور دیگر علوم کے ماہر تھے اور ان پر مجتہدانہ عبور رکھتے تھے۔ نہایت اعتماد کے ساتھ ان علوم کی تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ آگرہ میں ان کا سلسلۂ درس جاری تھا، جس میں بے شمار علما نے استفادہ کیا۔

میر مرتضیٰ نے منطق و حکمت کی تحصیل شیخ عبدالصمد بنداری سے کی اور حدیث کے لیے سید میرک شاہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسماعیل صفوی کے دورِ حکومت میں خراسان کی مسندِ صدارت پر متمکن ہوئے اور کافی عرصہ یہ خدمت انجام دی۔ بعد ازاں حج و زیارت کا قصد کیا اور مکہ مکرمہ میں شیخ شہاب الدین احمد بن حجر مکی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ پھر عازم ہند ہوئے اور دکن میں سکونت اختیار کی۔ دکن سے عازم آگرہ ہوئے۔ وہاں نہایت سکون کی زندگی بسر کی۔ علم نحو میں منظومۃ الکافیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ فارسی کے شاعر تھے اور شریفی تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک دیوان بھی ہے۔ ۹۷۴ھ کو دہلی میں وفات پائی۔[۴۶۹]

میر مرتضیٰ شریفی کو دہلی میں امیر خسرو کی قبر کے قریب دفن کیا گیا تھا۔ جب لوگوں نے صدرالصدور، قاضی شہر اور شیخ الاسلام سے کہا کہ امیر خسرو ہندی اور سنی ہیں، اور میر مرتضیٰ عراقی اور شیعہ ہیں، اس لیے دونوں کی روح ایک دوسرے سے اذیت محسوس کرے گی: ع

روح را صحبتِ ناجنس عذابیست الیم

---

۴۶۹ منتخب التواریخ، ص ۳۳۷۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۳، ۲۲۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۵۰۔

تو شاہی حکم کے مطابق ان کی نعش وہاں سے نکال کر مشہد لے جائی گئی۔ اس ضمن میں تذکرہ علمائے ہند کے فارسی الفاظ یہ ہیں:

چوں صدور و قاضی و شیخ الاسلام بعرض رسانیدند کہ امیر خسرو ہندی است وسنی، و میر مرتضیٰ عراقی است وشیعہ، درینکہ روح ہر دو از صحبتِ یک دیگر متاذی باشند شکی نیست:

روح را صحبتِ ناجنس عذابیست الیم

پس بموجب حکم عالی نعش او، ازاں جا کشیدہ بہ مشہد بردند۔

میر محسن رضوی نے یہ تاریخ وفات نکالی:

رفت تا میر مرتضیٰ از دہر — علم گویا ز نسلِ آدم رفت
بہر تاریخ رحلتش محسن — گفت علامہ ز عالم رفت

میر مرتضیٰ فارسی کے شاعر تھے۔ یہ شعر ان ہی کا ہے:

خاطرِ جمعے از اسباب میسر نہ شد — تخم جمعیت دل تفرقۂ اسباب است

انھوں نے ۹۷۴ھ کو وفات پائی[۴۹]

۲۲۴۔ مولانا مرشد الدین صفوی

مولانا مرشد الدین بن رفیع الدین محدث حسینی صفوی شیرازی ثم اکبر آبادی، شیخ وقت اور صالح عالمِ دین تھے۔ علم و طریقت کی آغوش میں تربیت پائی اور اونچے مرتبے کو پہنچے۔ اپنے والد گرامی شیخ رفیع الدین محدث شیرازی سے اخذِ علم کیا اور ان کی وفات کے بعد مسندِ تدریس کو زینت بخشی۔ نہایت سخی، بے حد فیاض اور پیکرِ جود و کرم تھے۔ اکبر آباد (آگرہ) میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔

---

۴۹ منتخب التواریخ، ص ۳۷۳۔ طبقاتِ اکبری، ص ۳۸۹، ۳۹۰ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۳، ۲۲۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۵۰

دسویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم دین کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔[۵۰]

۲۲۵- شیخ مصطفیٰ بن عبدالستار سہارن پوری

شیخ مصطفیٰ بن عبدالستار بن عبدالکریم انصاری سہارن پوری، اپنے دور کے فقیہ اور شیخ و زاہد تھے۔ ان کا شمار کبار علمائے ہند میں ہوتا تھا۔ مدّتِ مدید تک درس و افادہ میں مصروف رہے۔ بحر تصوّف و طریقت کے شناور تھے اور اس سلسلے میں شیخ رکن الدین گنگوہی کے فیض یافتہ تھے۔ ۴ر شعبان ۱۰۰۰ھ کو فوت ہوئے۔[۵۱]

۲۲۶- شیخ مصلح الدین لاری

شیخ مصلح الدین لاری، حنفی المسلک تھے۔ فاضلِ عصر اور علّامۂ دوراں تھے۔ علوم عربیہ اور معارفِ حکمیہ میں اپنے تمام اقران و معاصرین میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ طویل مدّت تک درس و افادہ میں مصروف رہے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا، جن میں والیِ سندھ مرزا شاہ حسین بھی شامل تھا۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے اخذِ علم کیا۔ ۹۶۰ھ میں مکہ مکرمہ گئے اور پھر واپس ہندوستان نہیں آئے۔ اونچے درجے کے مصنف بھی تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصنیفات ہیں۔

۱- شمائلِ ترمذی کی بسیط و مفصل شرح۔
۲- تفسیر بیضاوی پر تعلیقات
۳- شرح المنطق ــ یہ کتاب فارسی میں ہے۔

---

[۵۰] اذکارِ ابرار، ص ۳۱۶ ــ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۵۰
[۵۱] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۵۴، بحوالہ مرآت عالم۔

۴- الرسالۃ فی بحث تمام المشترک۔

۵- الرسالۃ فی بحث القدرۃ والارادۃ۔

۶- الرسالۃ فی بحث الحرکۃ۔

۷- الرسالۃ فی تحقیق المعاد والمبدء۔

۸- شرح تہذیب المنطق

۹- شرح ہدایۃ الحکمۃ

معاصر رحیمی میں ان کے حالات میں درج ذیل الفاظ مرقوم ہیں۔

مولانا مصلح الدین لاری علوم عربیہ را خواب می دانستہ۔ بافادۂ درس مرزا شاہ حسین مشغول بودہ، و در نہصد و شصت بمکہ رفت۔ شرح شمائل نبوی و حاشیہ تفسیر بیضاوی و شرح منطق و دیگر رسائل مشہور دارد۔

یعنی مولانا مصلح الدین لاری علوم عربیہ پر بہت عبور رکھتے تھے۔ مرزا شاہ حسین والیِ سندھ کے استاذ تھے۔ ۹۶۰ھ میں مکہ مکرمہ کا سفر کیا۔ شرح شمائلِ نبوی، حاشیہ تفسیر بیضاوی، شرح منطق اور دیگر رسائل ان کی تصنیفات ہیں۔

تاریخ معصومی میں ان کے حالات میں جو الفاظ لکھے گئے ہیں، ان کا ترجمہ یہ ہے:

مولانا مصلح الدین لاری انتہائی دانش منداور متبحر عالم تھے اور علوم عربیہ میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ مرزا شاہ حسین کو بھی درس دیتے رہے۔ ۹۶۱ھ میں اجازت لے کر حج کے ارادہ سے مکہ معظمہ گئے۔ شرح شمائلِ نبوی، حواشی تفسیر بیضاوی، شرح منطق اور دیگر رسالے ان کی تصانیف میں سے ہیں۔

اپنے دور کے اس جلیل القدر عالم دین نے ۹۷۹ھ کو وفات پائی۔[۵۲]

---

۵۲ مآثر رحیمی، ج ۲، ص ۳۲۰ — تاریخ معصومی، ص ۲۸۰، ۲۸۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۳۵۴، ۳۵۵ — عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ، ص ۳۵۵۔

۲۲۷۔ سلطان مظفر حلیم والیِ گجرات

والیِ گجرات سلطان مظفر بن محمود، اپنے دَور کا وہ بادشاہ تھا جو بیک وقت متعدد اوصاف کا حامل تھا۔ عالم و فاضل بھی تھا اور عادل و مصنف بھی، محدث و فقیہہ بھی تھا اور منکسر و متواضع بھی، جنگ جو بھی تھا اور حلیم الطبع بھی، ماہر حرب و ضرب بھی تھا اور صلح کل بھی، فاتح و کشور کشا بھی تھا اور رحم دل بھی، بہادر و جری بھی تھا اور انتہائی نیک و متقی بھی، مجاہد بھی تھا اور کریم النفس بھی۔ علما کا بدرجہ غایت قدر دان اور علم پرور بادشاہ تھا۔ جمعرات کے روز ۲۰ر شوال ۸۷۵ھ کو ارضِ گجرات میں پیدا ہوا۔ سلطنت و حکومت کے ماحول اور علم و فضل کی آغوش میں تربیت پائی۔ سلطان محمود نے اپنے اس بیٹے کی تعلیم کے لیے بہترین اساتذہ کا انتخاب کیا۔ ابتدائی تعلیم علامہ مجد الدین محمد بن محمد ایجی اور دیگر علمائے عصر سے حاصل کی۔ کتبِ احادیث ان سے بھی پڑھیں اور وقت کے مشہور شیخ و محدّث جمال الدین محمد بن عمر بن مبارک حمیری حضرمی المعروف بہ بحرق کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ سلطان مظفر حلیم تمام اصنافِ علم کا ماہر اور اخلاقِ حمیدہ کا پیکر تھا۔ انتہائی نرم خو اور متحمل مزاج تھا۔ اپنے حلم کی بنا پر وہ مظفر حلیم کے نام سے معروف ہو گیا تھا یعنی لفظِ "حلیم" اس کے نام کا مستقل جز بن گیا تھا۔ علم و ادب اگرچہ اول دَور ہی سے اس کے خاندان میں موجود تھا، مگر اس نے باقاعدہ اساتذۂ وقت سے تعلیم حاصل کی اور اس سلسلے میں اپنے اسلاف سے سبقت لے گیا۔

مظفر حلیم بیالیس سال کی عمر میں منگل کے روز ۳ر رمضان المبارک ۹۱۷ھ کو اپنے باپ کی وفات کے بعد گجرات کے تختِ حکومت پر متمکن ہوا اور نہایت عدل و انصاف کے ساتھ اپنی حکومت کا آغاز کیا۔ تقویٰ و طہارت، عزیمت و شجاعت اور عفو و درگزر میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ لوگوں کی غلطیاں دیکھتا اور نظر انداز کر دیتا۔ اس معاملے میں ہمیشہ تسامح سے کام لیتا۔ اونچے درجے کا خوش نویس تھا۔ ہر قسم کے مروجہ رسم الخط

کا ماہر تھا۔ خط نسخ، خط ثلث اور خط رقاع میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ قرآن مجید کی کتابت اپنے ہاتھ سے کرتا اور حرمین شریفین بھیجتا۔ قرآن سے اس کو بہت ہی لگاؤ تھا۔ اپنے باپ کی زندگی میں عالم شباب میں حافظِ قرآن ہوا

اتباعِ سنت کا یہ حال تھا کہ ہر قول و فعل میں آثارِ سنتِ نبویہ کو ملحوظ رکھتا اور نصوصِ حدیث پر عمل کی بنیادیں استوار کرتا۔ موت کو کثرت سے یاد کرتا اور اس کے ڈر سے آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ علما و مشائخ کی تعظیم و تکریم میں مبالغے کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔

ہر وقت با وضو رہتا، نماز باجماعت کی پابندی کرتا، رمضان کے روزے رکھتا، مکروہات و محرمات سے دامن کشاں رہتا، اپنے آپ کو اسراف و تبذیر سے محفوظ رکھتا اور فضول خرچی کا تصور بھی دل میں نہ لاتا۔ گزشتہ دَور کے ملوک و سلاطین کے حالات کا مطالعہ کرتا، عام طور پر دن اور رات کو بھیس بدل کر شہر میں گھومتا اور رعیت کے حالات سے بذاتِ خود مطلع ہونے کے لیے کوشاں ہوتا۔

اس کی زندگی کے بہت سے عجیب و غریب واقعات کتبِ تاریخ میں مرقوم ہیں۔ معدلت گستری اور عدل پروری میں اس کا کوئی حریف نہ تھا۔ ملک کی حفاظت اور اس کی سرحدوں کے تحفظ و دفاع میں انتہائی تیز تھا۔ گجرات کے اس عالم و فاضل اور محدث و فقیہ سلطان نے کم و بیش پندرہ سال اورنگِ سلطنت پر متمکن رہنے کے بعد ۲ر جمادی الاولیٰ ۹۳۲ھ کو وفات پائی[۵۳]

۲۲۸۔ قاضی منجھلہ جون پوری

قاضی منجھلہ جون پوری، شیخ اور فقیہ تھے۔ چوں کہ وہ فقہ اور علومِ عربیہ میں کامل

---

[۵۳] تفصیلات کے لیے دیکھیے: مرآتِ احمدی، ج ۱، ص ۶۱ تا ۶۶ ــ تاریخ فرشتہ، ج ۲، ص ۳۱۳ تا ۳۲۴ ــ مرآت سکندری، ص ۱۳۵ تا ۱۹۴ ــ مآثر رحیمی، ج ۲، ص ۱۵۱ تا ۱۶۴۔

دسترس رکھتے تھے، لہٰذا انھیں جون پور کا قاضی مقرر کر دیا گیا تھا۔ اس منصب پر وہ طویل عرصہ تک فائز رہے۔ بعد ازاں طبیعت تصوف کی طرف مائل ہوئی تو شیخ علی بن قوام الدین حسینی جون پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اخذِ طریقت کیا۔[۵۵۴]

۲۲۹- شیخ منجھن کمال پوری

شیخ منجھن شطاری کمال پوری، عالم اور صالح بزرگ تھے، نہایت متورع اور متقی فقیہ تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں انتہائی شدت سے کام لیتے اور سختی سے لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے اور برائی سے روکتے تھے۔[۵۵۵]

۲۳۰- شیخ منصور لاہوری

شیخ منصور بن ابو منصور حنفی لاہوری، اپنے دور کے فاضل آدمی تھے علومِ عربیہ، علمِ نحو اور اکثر مروّجہ علوم و فنون میں شہرت و مہارت رکھتے تھے۔ شیخ سعد اللہ لاہوری کے داماد تھے اور ان علوم کی تکمیل ان ہی سے کی تھی۔ اس زمانے کے ایک اور عالمِ دین شیخ اسحاق بن کاکو کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور طویل عرصہ تک ان سے منسلک رہ کر استفادہ کرتے رہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسندِ تدریس پر متمکن ہوئے اور علما و طلبا کو مستفید فرمایا۔

نہایت خوش مزاج، سلیم الطبع اور فہیم تھے۔ بحث و مناظرہ میں علم و دلائل کے زور سے حریف پر چھا جاتے۔ ان کی گرفتِ استدلال بڑی مضبوط تھی۔

کچھ عرصہ مالوہ کے قاضی القضاۃ بھی رہے۔ امرائے سلطنت اور ارکانِ حکومت کے نزدیک بڑے معزز و محترم تھے۔ جس زمانے میں جلال الدین اکبر لاہور میں مقیم تھا،

---

[۵۵۴] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۶۶ بحوالہ عاشقیہ [۵۵۵] ایضاً، ص ۳۶۷

یہ مالوہ سے آکر اس سے ملے، اس نے ان کو بجواڑہ اور کوہستانی سرحدوں کے نظم و نسق پر مامور کر دیا تھا۔ بادشاہ ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔

شیخ منصور کے ایک بیٹے کا نام علاء الدین تھا۔ یہ بھی عالمِ دین تھے۔ تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ شیخ علاء الدین عرصہ تک خاں خاناں کے پاس رہے۔ بادشاہ کے دربار میں جاتے تو وہ نہایت عزت سے پیش آتا۔ بادشاہ نے ان کو فوجی ملازمت اختیار کرنے کی بارہا پیش کش کی لیکن انھوں نے اسے قبول نہ کیا اور درس و تدریس کو ترجیح دی —— شیخ علاء الدین لاہوری بہت فیاض سخی اور ایثار پیشہ تھے، جو کچھ ان کو اپنی جاگیر سے حاصل ہوتا، طلبا پر صرف کر دیتے۔ مصنف بھی تھے، علامہ سعد الدین تفتازانی کی شرح عقائد پر حاشیہ لکھا جو بہت مشہور رہے۔ حج کے لیے گئے اور وہیں وفات پائی [۵۶]

۲۳۱۔ قاضی منّ اللہ کاکوروی

قاضی منّ اللہ بن نعیم اللہ بن تاج الدین بن شہاب الدین صدیقی کاکوروی، عالمِ دین اور فقیہ تھے۔ ان کا شمار دسویں صدی ہجری کے مشہور علما میں ہوتا تھا۔ تصوّف و سلوک سے بھی تعلق خاطر تھا اور یہ علم انھوں نے علامہ سعد الدین بن بڈھن بن محمد خیر آبادی سے حاصل کیا تھا جو مجمع السلوک کے مصنف تھے [۵۷]

۲۳۲۔ شیخ میران سندھی

شیخ میران بن مولانا یعقوب سندھی، کبار علمائے سندھ میں سے تھے۔ صفاتِ

۵۶؎ منتخب التواریخ، ص ۳۳۱ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۱، ۲۷۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۴، ص ۲۳۱، ۳۶۷۔

۵۷؎ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۶۸۔

حمیدہ اور اخلاقِ پسندیدہ میں مشہور اور علومِ معقول و منقول کے جامع تھے۔ طویل عرصہ تک درس و تدریس میں مصروف رہے اور کثیر طلبا نے ان سے علم حاصل کیا۔ علوم مروّجہ میں ماہر تھے۔ مرزا شاہ حسین والیِ سندھ نے کچھ عرصہ ان کی خدمت میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ اس عالمِ دین نے ۹۴۹ھ کو ٹھٹھہ میں عالمِ آخرت کو رحلت کی۔ تاریخ وفات وارث الانبیا سے نکلتی ہے۔[۵۸]

۲۲۳۔ قاضی مینا بن یوسف مندوی

قاضی مینا بن یوسف بن حامد بن ابوالمفاخر بن لیٰسین مندوی، مانڈو میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ بچپن ہی میں چندیری کے سفر پر روانہ ہوئے اور مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ شیخ عصر اور عالم و فقیہ تھے۔ ان کا شمار اس دَور کے فحول علما میں ہوتا تھا، علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔ جب رانا سانگا نے چندیری پر حملہ کیا تو یہ دوسرے لوگوں کے ساتھ وہاں سے نکل کر چھترہ چلے گئے تھے۔ وہاں کافی عرصہ مقیم رہے، پھر قادر شاہ مالوی کے عہد میں واپس مانڈو گئے۔ ان کے پردادا لیٰسین، محمود شاہ خلجی کے زمانے میں مانڈو کے منصبِ قضا پر متعین رہے تھے۔ قاضی مینا نے قادر شاہ سے ملاقات کی تو اس نے مانڈو کا قاضی مقرر کر دیا اور اپنے مشیروں اور ندیموں میں شامل کیا۔ ان کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔[۵۹]

۲۲۴۔ شیخ میاں جیبو گجراتی

شیخ میاں جیبو بن داؤد پٹنی گجراتی۔ علاقہ گجرات کے شہر پٹن میں پیدا ہوئے۔

---

[۵۸] تاریخ معصومی، ص ۲۰۸ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۷۰۔

[۵۹] اذکارِ ابرار، ص ۲۶۷، ۲۶۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۷۲۔

یہ بارہ سال کی عمر کے تھے کہ ان کے والد داؤد، سلطان ناصر الدین خلجی کے زمانے میں پٹن سے مانڈو آ بسے تھے۔ میاں جیو نے مانڈو ہی میں پرورش پائی۔ پھر حصولِ علم کی غرض سے برہان پور اور وہاں سے گجرات گئے اور مشہور اساتذۂ عصر سے مروّجہ کتب درسیہ پڑھیں، یہاں تک کہ علم و فضل کے اونچے مقام پر پہنچے اور اپنے وقت کے شیخ، فقیہ اور بہت بڑے عالم گردانے گئے۔ بعد ازاں شیخ احمد بن جعفر شیرازی اور شیخ صدر الدین ذاکر برودوی سے اخذِ طریقت کیا اور عرصہ تک ان سے انسلاک و ملازمت اختیار کیے رکھی اور کبار شیوخ کے ہم سر ہوئے۔

شیخ میاں جیو کی آمدنی کا ذریعہ تجارت تھا، جو کچھ کماتے قرب و جوار کے لوگوں اور مستحقین میں تقسیم کر دیتے۔ اس عالمِ دین اور مردِ درویش نے اسّی سال عمر پاکر ۹۸۵ھ کو شہر مانڈو میں انتقال کیا[۱۰۶]۔

ن

۲۳۵- قاضی نجم الدین گجراتی

قاضی نجم الدین گجراتی، شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ والیِ گجرات سلطان محمود بیگڑہ کے عہد میں گجرات کے قاضی القضاۃ تھے۔ عدل و انصاف اور امورِ خیر کی تنفیذ میں نہایت سخت تھے اور لوگوں پر شدید محاسبہ کرتے تھے۔ ان کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک روز ایک شخص کے ہاتھ میں رباب دیکھا جو اُس نے سلطان محمود کے لیے بنایا تھا قاضی نے رباب اس کے ہاتھ سے پکڑا اور توڑ ڈالا۔ سلطان کو اس کا علم ہوا تو اس نے مزاح کے انداز میں کہا، قاضی نجم الدین کمزوروں پر تو اس درجہ جری ہیں، صاحب رسول آباد پر ان کے احتساب کا وار کیوں نہیں چلتا، جو ریشم کا لباس پہنتے اور غنا سنتے ہیں۔ اس کا اشارہ شیخ محمد بن عبداللہ حسینی بخاری کی طرف تھا، جو علی الاعلان

---

[۱۰۶] اذکارِ ابرار، ص ۳۴۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۷۲، ۳۷۳

لباسِ حریر زیب تن کرتے اور سب کے سامنے سماعتِ غنا کرتے تھے۔ سلطان کی یہ بات قاضی نجم الدین کے کانوں میں پہنچی تو وہ رسول آباد گئے، مگر شیخ کو دیکھتے ہی اس درجہ مرعوب ہوئے کہ بولنے کی جرأت نہ کر سکے اور ان کے حلقہ طریقت میں شامل ہو گئے۔ قاضی نجم الدین ۹۱۱ھ کو اس دنیائے دوں سے سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ [۱]

۲۳۶۔ قاضی نصر اللہ بھکری سندھی

قاضی نصر اللہ بن ابو سعید بن زین الدین حنفی بھکری سندھی، دسویں صدی ہجری کے شیخ سندھ اور اس نواح کے عالم و فقیہ تھے۔ ان کا شمار اس عصر کے مشاہیر فقہا میں ہوتا تھا۔ اپنے برادرِ کبیر قاضی دافن کے بعد شہر بھکر کی مسندِ قضا پر متمکن ہوئے۔ [۲]

۲۳۷۔ شیخ نصیر الدین گجراتی

شیخ نصیر الدین بن مجد الدین بن سراج الدین بن کمال الدین عمری گجراتی احمد آباد میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور اپنے شہر کے اساتذہ سے تحصیل علم کی یہاں تک کہ خطۂ گجرات کے شیخ صالح اور فقیہ نام دار مانے گئے۔ ان کے والد شیخ مجد الدین اپنے دور کے صاحبِ طریقت اور عالمِ دین تھے۔ ان کی صحبت میں تصوف و سلوک کی منزلیں طے کیں اور ان کے بعد مسندِ مشیخت کو زینت بخشی۔ ترک و تجرید اور عبادت و زہد میں اپنے اسلاف کا صحیح نمونہ تھے۔ ۲۷ رجب

---

[۱] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۷۳۔

[۲] تاریخ معصومی، ص ۲۷۷۔ تحفۃ الکرام، ص ۴۳۳، ۴۳۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۷۴۔

۹۱۰ھ کو احمد آباد میں فوت ہوئے۔[۳]

۲۳۸۔ شیخ نظام الدین کاکوروی

شیخ نظام الدین بن سیف الدین بن نظام الدین علوی کاکوروی، شیخ بھیکہ یا بھیکن کے نام سے مشہور تھے۔ ۸۹۰ھ کو کاکوری میں پیدا ہوئے جو اعمالِ لکھنؤ میں واقع تھا۔ اپنے والد شیخ سیف الدین اور شیخ عبد اللطیف ہردی سے تحصیل کی۔ صحیح بخاری اور جامع الاصول کے لیے مولانا ضیاء الدین محدث کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ یہ کتابیں انھوں نے نہایت غور و فکر اور محنت کے ساتھ پڑھیں۔ سرزمین ہند کے اس عالم کبیر نے شیخ ابراہیم بن معین الدین حسینی ایرجی سے اخذِ طریقت کیا اور عرصہ تک ان سے وابستگی اختیار کیے رکھی۔ پھر کاکوری واپس آئے اور درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔ سالہا سال تک علما و طلبا کو علوم مروّجہ سے مستفید فرماتے رہے۔ بعد ازاں عازمِ کالپی ہوئے اور وہاں شیخ ابراہیم بن احمد بن حسن شریف حسینی گیلانی سے کسبِ فیض کیا۔ کچھ عرصہ بعد کاکوری کی راہ لی اور واپس آکر تدریس و تلقین کا سلسلہ شروع کیا۔ نہایت نیک اور متقی بزرگ تھے۔

وہ بے شک بہت بڑے صاحبِ طریقت بزرگ تھے، لیکن حقائقِ طریقت عوام کے سامنے بیان نہ کرتے تھے۔ خود سماع کرتے مگر دوسروں کو سماع سے روکتے تھے۔ حافظِ قرآن اور قرأتِ سبعہ کے ماہر تھے۔

شیخ نظام الدین کاکوروی مصنف بھی تھے۔ اصولِ حدیث سے متعلق المنہج اور تصوف و طریقت کے بارے میں المعارف اور شرح الملہمات القادریہ ان کی تصنیفات میں سے ہیں۔ انھوں نے ۹۸۱ھ میں اس دنیائے فانی سے رحلت کی۔[۴]

---

[۳] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۷۴

[۴] منتخب التواریخ، ص ۲۸۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۷۷ — کشف المتوازی۔

۲۴۹۔ شیخ نظام الدین امیٹھوی

شیخ نظام الدین کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ نظام الدین بن محمد یٰسین بن فخر الدین بن ابوالفضل بن تاج الدین عثمانی امیٹھوی۔ کبار مشائخ چشتیہ میں سے تھے اور شیخ سری سقطی عثمانی کی نسل سے تھے۔ ۹۰۰ھ کو امیٹھی میں پیدا ہوئے جو ہندوستان میں اجودھیا کے قریب ایک مشہور شہر ہے اور جس کو علم و علما کے قدیم مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ بچپن ہی سے حصولِ علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جون پور گئے، وہاں شیخ معروف بن عبدالواسع جون پوری کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور کئی سال ان کے زیرِ تعلیم رہے۔ شیخ معروف، مولانا اللہ داد شارح کافیہ کے مرید تھے۔ پھر عازمِ مانک پور ہوئے اور شیخ نور الدین بن حامد حسینی مانک پوری سے اخذِ طریقت کیا۔ وہاں سے واپس جون پور اور پھر امیٹھی گئے۔ بہت بڑے فقیہ، شیخ، عالمِ دین، زاہد و عابد اور متقی تھے۔ ہمیشہ درس و تدریس اور تلقین و تذکیر کی شمع روشن کیے رکھی۔ یہ خدمت انھوں نے حسن نیت، اخلاصِ قلب اور خوفِ الٰہی کے جذبے کے ساتھ انجام دی۔ ان سے بے شمار علما و طلبا نے استفادہ کیا۔ صحیح معنوں میں علمائے ربانی میں سے تھے۔ کبھی کسی نے ان کو گھر یا مسجد کے باہر نہیں دیکھا۔ تین شہروں کے علاوہ سفر پر نہ جاتے۔ یا تو شیخ نظام الدین حسینی خیر آبادی کی ملاقات کے لیے خیر آباد کا قصد کرتے، یا شیخ عبدالغنی بن حسام الدین فتح پوری کی خدمت میں حاضری کے لیے فتح پور کا عزم فرماتے یا پھر شیخ مبارک بن شہاب الدین گوپاموی کی مزاج پرسی کی غرض سے گوپامئو کے سفر پر روانہ ہوتے۔

وہ بلاشبہ بہت بڑے عارف اور صوفی تھے لیکن ان کی عادت تھی کہ کسی پر اسرارِ معرفت وا نہ کرتے اور اس مسئلے پر ہمیشہ خاموشی کو ترجیح دیتے۔ سلوک و طریقت کے موضوع پر احیاء علوم الدین، عوارف المعارف، الرسالۃ المکیہ اور آداب المریدین وغیرہ کتابوں کا مطالعہ کرتے۔ ایک مرتبہ شیخ ابوالفتح نظام الدین خیر آبادی کے ہاتھ

میں ابنِ عربی کی فصوص الحکم دیکھی تو چھین لی اور مطالعہ کے لیے کوئی دوسری کتاب عطا کی۔

نمازِ جمعہ سے پہلے بطور احتیاط چار رکعت نماز پڑھتے، خطبہ میں سلاطین میں سے کبھی کسی کا نام نہ لیتے۔ کسی کو حتی الامکان حلقۂ بیعت میں داخل نہ کرتے۔ اپنے اصحاب و مریدین میں سے کسی کو اشتغال و اوراد پر کاربند ہونے کے لیے نہ کہتے، نہ کسی کو وظائف کی تلقین کرتے، جوتے سمیت نماز پڑھ لیتے۔ فرمایا کرتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جوتا پہن کر نماز پڑھنا ثابت ہے۔ فجر کی نماز غلس میں پڑھتے۔ سماع سے خود بھی احتراز کرتے اور اپنے مریدین و تلامذہ کو بھی روکتے۔ فرمایا کرتے، اگر کسی مسئلہ میں دونوں پہلوؤں کی گنجائش ہو، جواز کی بھی اور عدمِ جواز کی بھی یا حلّت کی بھی اور حرمت کی بھی، تو ایسی صورت میں اولیٰ یہ ہے کہ احوط پر عمل کیا جائے۔

شیخ نظام الدین امیٹھوی اسّی سال سے زائد عمر پاکر، ۲۸ ذی القعدہ ۹۷۲ھ کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ محمد غوثی نے گلزارِ ابرار میں اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں سنِ وفات ۹۹۱ھ تحریر کیا ہے۔[۵]

۲۴۰۔ شیخ نظام الدین نارنولی

شیخ نظام الدین بن عبدالکریم حنفی نارنولی، اپنے زمانے کے زبردست عالم تھے۔ ساتھ ہی کبارِ مشائخ چشتیہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کا نام اصل میں اللہ داد تھا، اور نظام الدین لقب تھا۔ ان کے والد شیخ عبدالکریم نارنولی، شیخ محمد غوث گوالیاری کے مریدین میں سے تھے۔ شیخ نظام الدین بھی باپ کے ساتھ گوالیار گئے اور وہیں شیخ

---

۵ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، منتخب التواریخ، ص ۲۸۲ تا ۲۸۶ — اخبار الاخیار، ص ۲۸۴، ۲۸۵ — اذکارِ ابرار، ص ۵۷۷ تا ۵۷۹ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۰، ۲۴۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۷۸ تا ۳۸۰ — طبقاتِ اکبری، ص ۳۹۳۔

محمد غوث کی خانقاہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ حصولِ علم کو مشغلہ ٹھہرایا اور اس درجہ کمال کو پہنچے کہ علومِ عالیہ و آلیہ میں اپنے معاصرین سے فوقیت لے گئے۔ نارنول میں ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا، جس میں متواتر چالیس سال تک اس عالمِ دین نے درس و تدریس کا غلغلہ جاری رکھا۔ یہ اپنے دَور کے صاحبِ طریقت بھی تھے، اور شیخ خانون بن علاء الدین ناگوری کے فیض یافتہ تھے۔ ان سے علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے استفادہ و استفاضہ کیا۔ ۲۸ صفر ۹۹۷ھ کو اس دنیائے فانی سے عالمِ آخرت کو روانہ ہوئے [۵۶]

۲۴۱۔ شیخ نظام الدین خیر آبادی

شیخ نظام الدین خیر آبادی کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ نظام الدین بن سید میرن بن نور بن مدن بن سعید بن قاضی شیخ بن انعام الدین بن رکن الدین بن محمد بن نور بن احمد بن محمود حسینی شیورانی۔ سندیلہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ شیخ سعد الدین بن قاضی بڈھن خیر آبادی سے بیعتِ طریقت کی، پھر حصولِ علم کے لیے سنبھل گئے۔ وہاں علامہ عزیز اللہ تلنبی کے درس میں شامل ہوئے اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بعد ازاں دیگر بلادِ ہند کے مختلف علما سے تحصیل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد خیر آباد واپس آئے اور خود سلسلۂ تدریس جاری کیا اور مسندِ افتا پر رونق افروز ہوئے۔ ان کی تدریسی سرگرمیوں اور علمی رفعتوں کا یہ عالم تھا کہ اپنے اساتذۂ کرام کی زندگی ہی میں ان کا شمار اکابر علما میں ہونے لگا تھا اور ملک کے دُور دراز حصوں سے طلبا ان کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے اور ان کے فیوضِ علمی سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ پھر اثنائے تدریس

---

[۵۶] اذکارِ ابرار، ص ۳۹۰، ۳۹۱۔ منتخب التواریخ، ص ۲۸۶، ۲۸۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۴، ص ۳۷۸۔

ہی میں قلب کی دنیا میں ایک اور ہنگامہ بپا ہوا اور ان پر جذبہ ربانی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اسی دوران میں سائین پور کی راہ لی اور وہاں جا کر شیخ صفی الدین عبدالصمد سائین پوری کی صحبت اختیار کر لی اور ان کی رہنمائی میں سلوک و طریقت کی منزلیں طے کرنے لگے۔ پھر خیر آباد گئے اور سب علائق سے منقطع ہو کر عبادتِ الٰہی اور ذکر و شغل میں مصروف ہو گئے۔ اس جلیل القدر عالمِ دین اور مسافرِ راہِ طریقت نے ۷ ربیع الاوّل ۹۹۷ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔[۷۵]

۲۴۲۔ علامہ نظام الدین بدخشی

علامہ نظام الدین حنفی بدخشی، حضرت حسن بصری کی اولاد سے تھے۔ اصل وطن بدخشاں تھا۔ وہیں پیدا ہوئے اور مولانا محمد سعید اور علامہ عصام الدین ابراہیم اسفرائنی اور دیگر اساتذۂ عصر سے علم حاصل کیا۔ کسی زمانے میں ذکر و فکر کی وادیِ روح پرور میں بھی گھومے پھرے اور اس کی مختلف منزلیں شیخ حسین خوارزمی کی صحبت میں طے کیں۔ مقتدر عالم اور نامور مصنف تھے۔ علمی اعتبار سے بدخشاں اور ماوراءالنہر کے تمام علما پر فوقیت رکھتے تھے اور بدخشاں کے شاہی امرا کی جماعت کے اہم رکن تھے۔ ۹۸۲ھ کو ہندوستان آئے اور اسی سال ۹ جمادی الاخریٰ کو خان پور کے مقام پر، جو جون پور کے مضافات میں واقع ہے، شاہِ ہند جلال الدین اکبر سے ملاقات کی۔ اس نے ان کے علم و فضل اور ذہنی و فکری صلاحیتوں سے متاثر ہو کر، پہلے قاضی خاں اور پھر غازی خاں کے خطاب سے مفتخر کیا۔ بڑے فصیح اللسان اور خوش بیان تھے۔ اکبر نے ان پر خوب عنایات کیں اور بہت سے مناصبِ جلیلہ سے نوازا۔ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ شرح عقائد پر حاشیہ سپردِ قلم کیا اور ایک رسالہ تحقیق و تصدیق ایمان کے

---

[۷۵] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۸۰، ۳۸۱، بحوالہ اخبار الاصفیا۔

بیان اور بحث میں لکھا۔

علامہ بدخشی، اکبر کے حاشیہ نشینوں اور مقربین میں سے تھے۔ یہ دربارِ اکبری کا پہلا شخص ہے، جس نے فتح پور میں، اکبر کے سامنے سجدۂ تحیت ادا کرنے کی رسم ایجاد کی اور اس طرح اپنے علم و فضل کی ساری متاع اور عمل و کردار کا تمام سرمایہ اکبر کے پاؤں میں رکھ دیا۔ اس نے اپنے زورِ بیان اور قوتِ گویائی سے بادشاہ کی بے حد خدمت کی اور بالآخر اس کے قدموں میں سر جھکا کر اس کا حقِ نمک ادا کر دیا۔ نظام الدین بدخشی اور اسی قماش کے دربار کے دیگر لوگوں کے علمِ کلام کی فراوانی اکبر کے لیے بہت ممد ثابت ہوئی اور اس کو مرتبۂ الوہیت تک پہنچانے میں انھوں نے اس کو پورا مواد فراہم کیا۔ العیاذ باللہ۔

بدایونی کے الفاظ ہیں: اوّل کسے کہ اختراع سجدہ پیش بادشاہ کرد۔ در فتح پور او بود۔

نظام الدین بدخشی نے ستر برس کی عمر پائی اور ۹۹۳ھ کو ارضِ اودھ میں انتقال کیا۔ ۵۵

۲۴۳۔ شیخ نوح بن نعمت اللہ سندھی

شیخ نوح بن نعمت اللہ صدیقی سندھی، علامۂ وقت اور فاضل عصر تھے۔ اعمال سندھ کے ایک مقام ہالہ کندی میں اقامت گزین تھے۔ اس زمانے کی تمام علمی سرگرمیوں کا مرکز یہی عالم دین تھے۔ قرآن مجید کی نہایت عمدہ تفسیر بیان کرتے تھے اور اس کے معانی دقیقہ کی وضاحت میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ دیارِ سندھ کے اس عالمِ دین نے ۲۷ ذی القعدہ ۹۹۸ھ کو جمعرات کے

---

۵۵ منتخب التواریخ، ص ۳۰، ۲۳۱، ۳۲۱ — مآثر رحیمی، ج ۲، ص ۱۹، ۲۰ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۲، ۲۴۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۸۱

دن ہالہ کندی میں وفات پائی۔[۹]

۲۴۴۔ مولانا وجیہ الدین علوی گجراتی

شیخ وجیہہ الدین بن نصراللہ بن عماد الدین علوی گجراتی، ماہ محرم ۹۱۱ھ کو سرزمین گجرات کے ایک گاؤں جانپانیر میں پیدا ہوئے اور اساتذۂ عصر سے حصول علم میں مشغول ہوگئے۔ پھر علامہ عماد الدین محمد بن محمود طارمی کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے۔ ان سے اصول و کلام، معانی و بیان اور منطق و فلسفہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں تک کہ تمام علوم مروّجہ میں درجہ کمال کو پہنچے۔ علوم آلیہ و عالیہ میں مہارت پیدا کی اور اپنے دَور کے عالم کبیر، مفسّر و فقیہ اور شیخ و امام گردانے گئے۔ درس و تدریس کے منصب علیا پر فائز ہوئے اور مسند افتا کو زینت بخشی۔ اس کے علاوہ علوم طریقت میں بھی بہرۂ وافر حاصل کیا اور شیخ قاضی خان چشتی نہروالی سے جو شیخ قاضن کے نام سے معروف تھے اور صاحب جواہر الخمسہ شیخ محمد غوث گوالیاری سے مستفیض ہوئے۔

شیخ وجیہہ الدین گجراتی بے شمار اوصاف کے حامل تھے۔ صاحب تدریس و اخلاص، پاک باطن، شریف النفس، عابد و زاہد، فیاض و جواد اور قانع بالیسیر تھے۔ گوشہ نشینی اور عزلت و تجرّد کی زندگی بسر کرتے تھے اور ہمیشہ علوم دینیہ کی تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ وضع و لباس کے معاملے میں سادگی پسند تھے اور عام لوگوں سے کوئی امتیاز نہ رکھتے تھے۔ موٹے جھوٹے کپڑوں پر قانع رہتے۔ جو کچھ کہیں سے حاصل ہوتا، وہ طلبا میں خرچ کر دیتے۔ اللہ نے ان

---

[۹] اذکار ابرار، ص ۳۹۴ — تحفۃ الکرام، ص ۴۶۹ تا ۴۷۱ — تاریخ معصومی ص ۲۸۲ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۸۳۔

کی دعائیں بڑا اثر اور شفا بخشی تھی۔ انھوں نے علائقِ دنیا سے الگ ہو کر اپنے آپ کو درس و تدریس اور عبادت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ کبھی امرائے دولت اور ارکانِ حکومت کے دروازے پر دستک نہ دیتے۔ صرف ایک دو مرتبہ کسی رکنِ حکومت کے پاس جانا پڑا تو بہت ہی جبر اور ناگواری کے ساتھ گئے۔ کسی نے ان کو کبھی اپنے گھر یا مسجد کے علاوہ کہیں نہیں دیکھا۔ یا تو طلبا کے ہجوم میں درس و تدریس میں مصروف ہوتے یا عبادت و ذکرِ الٰہی میں منہمک۔

شیخ موصوف مسندِ افتا پر فائز تھے مگر فتویٰ دینے اور اس پر دستخط کرنے کے بارے میں بے حد محتاط تھے۔ وہ گجرات (کاٹھیاواڑ) میں سکونت پذیر تھے۔ اور والیِ گجرات سلطان محمود ان کا انتہائی احترام کرتا تھا۔ تحقیق مسائل اور افتا کے باب میں وہ ان ہی سے رجوع کرتا ــــ اس سلسلے کا یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ سلطان مذکور کے عہد میں شیخ محمد غوث گوالیاری گجرات گئے تو صاحبِ کنز العمال شیخ علی متقی نے جو اس عہد کے بہت بڑے عالم اور دربارِ سلطانی میں بڑے اثر و اقتدار کے مالک تھے، بعض مسائل میں اختلاف کی بنا پر شیخ محمد غوث کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔ جب سلطان محمود کے پاس یہ فتویٰ پہنچا تو اس نے اس پر عمل درآمد کو اس وقت تک ملتوی کر دیا جب تک کہ شیخ وجیہہ الدین اس کی تصدیق نہ کر دیں۔ شیخ وجیہہ الدین چوں کہ شیخ محمد غوث کے افکار و خیالات سے آگاہ تھے، اس لیے انھوں نے فتویٰ دیکھتے ہی پھاڑ کر پھینک دیا۔ شیخ علی متقی کو اس کا علم ہوا تو وہ شیخ وجیہہ الدین کے گھر آئے اور اپنے کپڑے پھاڑ دیے اور مضطرب ہو کر کہا، آپ آخر کس بدعت اور دین میں رخنہ اندازی کے حامی بن گئے ہیں۔ ؟ انھوں نے جواب دیا، ظاہر شریعت کی رو سے ان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ چنانچہ شیخ وجیہہ الدین کے اس عمل سے شیخ محمد غوث پھانسی سے بچ گئے۔

اس واقعہ کے بعد شیخ وجیہہ الدین اکثر اپنی مجلسوں میں کہا کرتے تھے:

ظواہر شریعت پر ایسی ہی نظر ہونی چاہیے، جیسی شیخ علی متقی کی ہے اور حقائق

پر ایسی جیسی کہ شیخ محمد غوث کی ہے۔

شیخ وجیہہ الدین بہت بڑے مصنف، شارح اور محشی بھی تھے، انھوں نے مختلف علوم و فنون پر مشتمل کم و بیش ستائیس اہم درسی اور غیر درسی کتابوں پر شروح اور حواشی تحریر کیے جو اہلِ علم میں مقبول ہوئے اور لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ ان کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ حاشیہ تفسیر بیضاوی: یہ قرآن مجید کی مشہور تفسیر ہے اور اس کا ابتدائی حصہ داخلِ درس ہے۔

۲۔ حاشیہ علی شرح نخبۃ الفکر، اس کا نام نخبۃ الفکر فی مصطلح اہل الاثر ہے۔ اصولِ حدیث کی کتاب ہے۔ صاحب فتح الباری حافظ ابنِ حجر عسقلانی کی تصنیف ہے اور شاملِ نصاب ہے۔

۳۔ حاشیہ ہدایہ: یہ فقہ کی اہم اور مشہور کتاب ہے اور باقاعدہ مدارس عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے۔

۴۔ حاشیہ شرحِ وقایہ: یہ بھی فقہ کے مشہور متون میں سے ہے اور نصاب میں شامل ہے۔

۵۔ حاشیہ علی العضدی۔

۶۔ حاشیہ علی اصول البزدوی۔

۷۔ حاشیہ علی المطول

۸۔ حاشیہ علی مختصر المعانی۔

۹۔ حاشیہ علی التلویح۔

۱۰۔ حاشیہ علی شرح التجرید۔

۱۱۔ حاشیہ علی شرح العقائد النسفی: العقائد النسفی اصولِ دین میں ایک مختصر رسالہ ہے۔ اس کے مصنف شیخ نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد (متوفی ۵۳۷ھ) ہیں، اس کی مختلف علما نے شرحیں لکھیں، جن میں ایک شرح علامہ سعد الدین تفتازانی

(متوفی ۷۹۲ھ) نے سپردِ قلم کی جو مدارسِ دینیہ میں متداول ہے۔ شیخ وجیہ الدین گجراتی نے علامہ تفتازانی کی شرح پر حاشیہ لکھا۔

۱۲- حاشیہ علی الحاشیۃ القدیمۃ للمحقق الدوانی - یہ شیخ جلال الدین محقق دوانی کے حاشیہ پر حاشیہ ہے۔

۱۳- حاشیہ علی شرح المواقف للجرجانی۔

۱۴- حاشیہ علی حکمۃ العین - یہ کتاب علم منطق میں ہے۔

۱۵- حاشیہ علی شرح المقاصد۔

۱۶- حاشیہ علی شرح چغمینی۔

۱۷- حاشیہ شرح قطبی

۱۸- حاشیہ علی شرح الشمسیہ، للرازی۔

۱۹- حاشیہ علی شرح جامی۔

۲۰- حاشیہ علی شرح الارشاد - یہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب الارشاد کی شرح پر حاشیہ ہے۔ یہ کتاب علم نحو سے متعلق ہے۔

۲۱- شرح رسالہ ملا علی قوشجی - یہ رسالہ علم ہیئت کے موضوع پر ہے۔

۲۲- شرح ابیات التسہیل۔

۲۳- شرح اللوائح۔

۲۴- شرح جام جہان نما - یہ رسالہ علم تصوف میں ہے۔

۲۵- شرح کلید مخازن - رسالہ کلید مخازن شیخ محمد غوث گوالیاری کی تصنیف اور حقیقتِ مبداء ومعاد کے موضوع پر ہے۔ شیخ وجیہ الدین نے اس کی شرح قلم بند کی۔

۲۶- رسالہ حقیقتِ محمدیہ۔

۲۷- شرح تحفہ شاہی - تحفہ شاہی علامہ قطب الدین محمود بن مسعود شیرازی (متوفی ۷۱۰ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب انھوں نے وزیر امیر شاہ محمد بن صدر السعید

تاج الدین ابن معتز کے لیے لکھی، جو ایک جلد اور چار ابواب پر مشتمل ہے شیخ وجیہہ الدین اس کی شرح ضبطِ تحریر میں لائے۔

ارضِ ہند کے اس عظیم المرتبت عالم و فقیہ اور مصنف نے ۹۹۸ھ کو احمد آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔[1]

ٹ

۲۴۵ - علامہ ہبۃ اللہ شیرازی

علامہ ہبۃ اللہ کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ ہبۃ اللہ بن عطاء اللہ بن لطف اللہ بن سلام اللہ بن روح اللہ حسینی شیرازی، شاہ میر کے نام سے معروف تھے۔ شیراز میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ حصولِ علم کے لیے مختلف علمائے عصر کی خدمت میں حاضری دی۔ کتبِ احادیث اپنے نانا حافظ نور الدین ابو الفتوح طاؤسی سے پڑھیں اور اپنے زمانے کے علامہ اور فاضل کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ تصوّف و طریقت میں بھی بلند مرتبے کو پہنچے۔ سلطان محمود بیگڑہ کے عہد میں ۸۹۰ھ کو گجرات آئے اور رجانیا نیر میں سکونت اختیار کی اور علم و فضل اور نیکی و تدین کی بنا پر اس درجہ شہرت حاصل کی کہ ملک کے مختلف بلاد و امصار سے طلبائے علم

---

[1] مجموعہ حالات حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی۔ص ۱۷ تا ۷۵ — مآثر رحیمی، ج ۳ ص ۱۷، ۱۸ — مرآت سکندری، ص ۲۹۶ — مرآت احمدی، ج ۳، ص ۶۸ تا ۷۰ — منتخب التواریخ، ص ۳۹۲، ۳۹۳ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۹، ۲۵۰ — مفتاح التواریخ، ص ۱۹۴ — ابجد العلوم، ص ۸۹۶، ۸۹۷ — مآثر الکرام، ص ۱۸۱، ۱۸۲ — اذکارِ ابرار، ص ۴۰۵ تا ۴۰۹ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۸۵، ۳۸۶ — طبقاتِ اکبری، ص ۳۹۵ — حدائق الحنفیہ، ص ۳۸۸، ۳۸۹ — معجم المؤلفین، ج ۱۳، ص ۱۶۰ — الاعلام، ج ۹، ص ۱۲۴، ۱۲۵ — مقدمہ عمدۃ الرعایہ فی حل شرح الوقایہ، ص ۲۶۔ رودِ کوثر، ص ۳۹۳، ۳۹۴ — یادِ ایام، ص ۶۵، ۶۶۔

اور مسترشدین کثیر تعداد میں حاضرِ خدمت ہونے لگے۔

علامہ ہبۃ اللہ، مصنف بھی تھے اور تصنیف کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں:

۱۔ اسنی الکواشف فی شرح المواقف۔

۲۔ لوامع البرھان فی قِدم القرآن۔

۳۔ شرح تھذیب المنطق والکلام۔

۴۔ المحاکمۃ علیٰ شرح الشمسیۃ فی المنطق۔

۵۔ رسالۃ فی الھیئۃ۔

۶۔ رسالۃ فی اصول الحدیث

۷۔ رسالۃ فی المسلسلات[1]

دسویں صدی ہجری کے اس عالمِ دین کے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

ی

۲۴۶۔ مولانا یار محمد سندھی

مولانا یار محمد بن عبدالعزیز ابہری ثم کاہانی سندھی، شیخ اور عالمِ کبیر تھے۔ ان کا شمار اپنے دَور کے فحول علما میں ہوتا تھا۔ ۹۲۰ھ کو جام فیروز کے عہدِ حکومت میں شیخ عبدالعزیز ابہری کے ساتھ ہرات سے سندھ آئے اور کاہان میں اقامت گزین ہوئے جو نواح سیوستان میں ایک قریہ تھا۔ وہاں درس وتدریس اور افادۂ طلبا کا غلغلہ بلند کیا۔

مولانا یار محمد، جلیل القدر عالم، خوش اخلاق بزرگ، نرم مزاج اور متواضع انسان تھے۔ انھوں نے اپنے باپ سے اخذِ علم کیا اور خود ان سے خلق کثیر نے استفادہ

---

[1] اذکار ابرار، ص ۲۳۸، ۲۳۹ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۸۸، ۳۸۹۔

کیا۔ کاہان میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے [۱]

۲۴۷۔ شیخ یحییٰ بن ابوالفیض احراری

شیخ یحییٰ کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ شیخ یحییٰ بن ابوالفیض بن عبداللہ بن شیخ عبیداللہ احرار احراری سمرقندی۔ جلال الدین اکبر کے عہد کے صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے۔ شیخ عصر اور عالم و فقیہ تھے۔ فنِ طب میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ خوش خطی میں اپنے دَور کے لاثانی شخص تھے۔ کتابت کی رو سے لفظ " سبع " نہایت عمدگی سے لکھتے ـــ ساتھ ہی خوش اخلاق، خوش خصال، کریم النفس اور ایثار پیشہ تھے۔ جو کچھ کہیں سے حاصل ہوتا لوگوں پر خرچ کر دیتے اور ان کو فائدہ پہنچانے کی کوشش میں رہتے۔

دربارِ اکبری میں جب فتنہ پردازان دین کا عمل دخل بہت بڑھ گیا اور پرانی علمی و دینی محفلیں اُجڑ گئیں تو دربارِ شاہی سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بادشاہ سے حجاز جانے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے ان کو قافلۂ حجاج کا امیر مقرر کیا اور کافی خرچ دے کر رخصت کیا۔ حرمین شریفین گئے، حج کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے اور واپس آگرہ آگئے۔ آگرہ میں ان کا زیادہ وقت ریاضت و عبادت میں گزرتا تھا۔ اسی شہر میں ۹۹۹ھ کو راہیِ ملکِ بقا ہوئے [۲]

۲۴۸۔ سید یٰسین سامانوی

شیخ یٰسین بن ابویٰسین سامانوی، شیخ وجیہہ الدین علوی گجراتی کے تلمیذ

---

[۱] مآثر رحیمی، ج ۲، ص ۲۷۵ ـــ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۹۲ ـــ تحفۃ الکرام، ص ۲۴۴ ـــ تاریخ معصومی، ص ۱۰۶ ـــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۷۹۔

[۲] منتخب التواریخ، ص ۳۱۲ ـــ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۹۳، مہر جہانتاب۔

اور صالح عالم دین تھے۔ حجاز گئے، سعادتِ حج حاصل کی اور وہاں کے مشائخ سے کتبِ احادیث پڑھیں۔ پھر واپس ہندوستان آئے اور عرصہ تک بعض امرائے دولت کے پاس لاہور میں قیام پذیر رہے۔ اس کے بعد ان پر ایسا دور آیا کہ مشائخ و فقرا کا سا لباس پہنا اور امورِ دنیا سے منقطع ہو گئے اور یادِ خدا اور ذکرِ الٰہی کو شب و روز کا مشغلہ ٹھہرالیا۔ سرہند میں گوشہ نشین ہو گئے تھے اور مریدین و سالکین کی خدمت کو اپنا معمول بنالیا تھا۔ ابتدا میں شیخ وجیہ الدین کی صحبت میں گجرات رہے۔ دوسری مرتبہ پھر وہیں جانا چاہتے تھے۔ وہاں سے عازمِ حجاز ہونے کے متمنی تھے، مگر اس کا موقع نہیں ملا۔ البتہ بنگال گئے اور بہار کے ایک گوشے میں مدت تک مقیم رہے۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔ عہدِ اکبری کے عالمِ دین تھے، ان کی تاریخ وفات کا علم نہ ہو سکا۔۵۳

۲۴۹۔ قاضی یعقوب مانک پوری

قاضی یعقوب بن ابو یعقوب مانک پوری، قاضی کمال الدین مانک پوری کے نام سے معروف تھے۔ اکبری دور کے مشہور علما میں سے تھے۔ علمِ فقہ اور اصول میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ حنفی المسلک تھے اور قاضی فضیلت کے داماد تھے۔ ان کی وفات کے بعد منصبِ قضا پر متعین ہوئے۔ نہایت خوش مزاج اور شگفتہ بیان تھے۔ مزاحاً عربی شعر ہندی بحروں میں کہتے۔ ابتدائی دور میں بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر کے مقربین میں سے تھے۔ چند سال ہندوستان کے قاضی القضاۃ رہے۔ منقول ہے کہ اس زمانے میں وہ مقوی و مبہی معجون بہت کھاتے تھے۔

ایک روز اکبر کی مجلس میں اکل و شرب کی سرور انگیز چیزیں لائی گئیں۔ بادشاہ نے قاضی کو دعوتِ شرکت دی۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے پوچھا، تم کس قسم کا

---

۵۳ منتخب التواریخ، ص ۲۲۸، ۲۲۹۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۵۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۹۳، ۳۹۴۔

نشہ کرتے ہو؟" ایک ہندی مصاحب فوراً بولا: "پارہ کھاتے ہیں۔" ان کو قاضی القضاۃ کے عہدہ سے معزول کر کے بنگال کے محکمہ قضائت پر متعین کر دیا گیا تھا۔ لیکن جب معصوم کابلی نے اکبر کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تو اس کے معاون ہو گئے۔ اکبر نے اس جرم کی پاداش میں منصبِ قضا سے معزول کر کے قلعۂ گوالیار میں محبوس کرنے کا حکم دیا۔ مگر وہاں پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں انتقال کر گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھیں قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ تقریباً ۹۹۰ھ کا واقعہ ہے۔

انھوں نے آگرہ اور فتح پور کے نواح میں بلند و بالا عمارتیں تعمیر کرائیں، نہریں کھدوائیں، حوض بنائے اور کئی باغ لگائے۔ ایک بہت بڑا حوض موضع ہنسوہ میں بنایا جو اس زمانے میں فتح پور کے قریب ایک قریہ تھا۔[۴]

۲۵۰۔ شیخ یوسف بن احمد گجراتی

شیخ یوسف بن احمد بن محمد بن عثمان حسینی گجراتی، دسویں صدی ہجری کے دیارِ ہند کے مشہور افاضل میں سے تھے۔ ان کی بہت بڑی علمی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے والیِ گجرات سلطان محمود بیگرہ کے لیے ابنِ خلکان کی مشہور تاریخ، وفیات الاعیان کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام منظر الانسان، ترجمۂ تاریخ ابن خلکان رکھا۔ غالباً یہ ترجمہ انھوں نے ۸۹۰ھ میں کیا تھا۔ کہتے ہیں، یہ نہایت عمدہ اور ادیبانہ ترجمہ ہے۔ اس سے ان کی علمی قابلیت اور زبان و اندازِ بیان پر عبور کا پتا چلتا ہے۔[۵]

۲۵۱۔ مولانا یوسف سندھی

مولانا یوسف بن ابو یوسف حنفی سندھی، شیخِ وقت اور صالح عالمِ دین تھے۔

---

[۴] منتخب التواریخ، ص ۳۰۵ — طبقات اکبری، ص ۳۹۱ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۵۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۹۴، ۲۹۵

[۵] نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۹۵

علوم شرعیہ میں ماہر، معارفِ ادبیہ میں ممتاز، تیز ذہن اور روشن فکر تھے علمی وتحقیقی معاملات میں خطا و صواب میں خوب امتیاز کرتے تھے۔ یہ والئ سندھ مرزا محمد باقی کے عہد کے صاحبِ علم وفضل بزرگ تھے۔ مآثر رحیمی کا مصنف ان کے تقوی اور علوم میں مہارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے

مولانا یوسف بغایت پرہیزگار ودر علوم شرعیہ وفنون بے مثل زمان خود بود۔[۵۶]

۲۵۲- علامہ یونس سمرقندی

علامہ یونس بن ابو یونس سمرقندی ثم سندھی، علوم حکمیہ کے کبار اور ماہر علما میں سے تھے۔ مرزا شاہ حسین کے عہد میں ماوراء النہر سے سندھ تشریف لائے ——— ارضِ سندھ میں علمی اعتبار سے ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور درجہ مشیخت پر فائز تھے۔ ان کی علمی رفعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ والی سندھ مرزا شاہ حسین نے ان کے حضور زانوئے تلمذ تہہ کیا اور جرجانی کی شرح المواقف، اور بعض دیگر کتابیں باقاعدہ سبقاً سبقاً پڑھیں۔ بھکر کے صحیح النسب سیّد تھے اور بھکر کی مسندِ مشیخت و ولایت ہمیشہ اس عالمِ دین کے خاندان کے ذی علم حضرات کی طرف منتقل ہوتی رہی۔ سندھ کا یہ عالمِ کبیر ۹۵۱ھ کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوا۔[۵۷]

---

[۵۶] مآثر رحیمی، ج ۲، ص ۳۲۷۔ نیز ملاحظہ ہو: تاریخ معصومی، ص ۲۹۹۔ تحفۃ الکرام، ص ۱۸۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۹۷

[۵۷] مآثر رحیمی، ج ۲، ص ۳۲۰، ۳۲۱۔ تاریخ معصومی، ص ۲۸۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۴، ص ۳۹۸

مراجع ومصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا :

۱- آئینِ اکبری : شیخ ابوالفضل - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۸۹۳ء

۲- ابجد العلوم : نواب صدیق حسن خاں - مطبع صدیقیہ بھوپال - ۱۲۹۵ھ

۳- اتحاف النبلاء : نواب صدیق حسن خاں - مطبع نظامی، کان پور - ۱۲۸۸ھ

۴- اخبار الاخیار : شیخ عبدالحق محدث دہلوی - مطبع مجتبائی، دہلی - ۱۳۳۲ھ

۵- ادبی دنیا لاہور، کشمیر نمبر : مضامین عبداللہ قریشی - شمارہ مارچ، اپریل - ۱۹۶۶ء

۶- اذکار ابرار - اردو ترجمہ گلزارِ ابرار : محمد غوثی شطاری مانڈوی - ترجمہ فضل احمد جیوری
مطبع مفید عام، آگرہ - ۱۳۲۶ھ

۷- اردو دائرہ معارف اسلامیہ : دانش گاہ پنجاب، لاہور

۸- الاعلام : خیرالدین زرکلی - طبع ثانی - بیروت

۹- الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام : قطب الدین نہروالی المکی - لیبزگ - بروکلیس - ۱۸۵۹

۱۰- انوار العارفین : حافظ محمد حسین مرادآبادی - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۸۷۶ء

۱۱- ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون : اسماعیل پاشا - مطبع بہیہ، استنبول -
۱۹۴۵ء/۱۳۶۴ھ

۱۲- البدر الطالع جلد اول، ثانی : امام محمد بن علی شوکانی - مطبعۃ السعادۃ، طبع اول
قاہرہ، مصر، ۱۳۴۸ھ

۱۳- برصغیر پاک وہند میں علمِ فقہ : محمد اسحاق بھٹی - ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور - ۱۹۷۳ء

۱۴- برہان پور کے سندھی اولیا، المعروف بہ تذکرہ اولیائے سندھ : سید محمد مطیع اللہ راشد
برہان پوری - سندھی ادبی بورڈ، کراچی - ۱۹۵۷ء

۱۵- بزمِ تیموریہ : سید صباح الدین عبدالرحمٰن - دارالمصنفین اعظم گڑھ

۱۶- تاریخ تحفۃ الکرام جلد اول، دوم، سوم : مطبع حسینی اثنا عشری - محلہ فراش خانہ وزیر گنج

لاہور، ۱۳۰۴ھ۔ و مطبع ناصری، دا تح دلهانی۔

۱۷۔ تاریخِ داؤدی: عبداللہ۔ بہ تصحیح پروفیسر شیخ عبدالرشید مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۵۴ء

۱۸۔ تاریخ شیرازِ ہند جون پور: سید اقبال حسین۔ ادارہ شیرازِ ہند پبلشنگ ہاؤس جون پور۔ ۱۹۶۳ء

۱۹۔ تاریخ طاہری: سید طاہر محمد نسیانی ٹھٹھوی۔ سندھی ادبی بورڈ۔ حیدرآباد سندھ ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء

۲۰۔ تاریخ ظفرہ: گردھاری لعل احقر۔ مطبوعہ حکیم برہم۔ گورکھپور۔ ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء

۲۱۔ تاریخ فرشتہ: محمد قاسم فرشتہ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۳۳ء

۲۲۔ تاریخ کشمیر اعظمی: خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری۔ ناشر، غلام محمد نور محمد، تاجران کتب سری نگر۔

۲۳۔ تاریخ معصومی: میر محمد معصوم بھکری۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۲۴۔ تحفۃ الکرام: میر علی شیر قانع۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۲۵۔ تحقیقاتِ چشتی: مولوی نور احمد چشتی۔ پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور۔ ۱۹۶۴ء

۲۶۔ تذکرہ بمولانا ابوالکلام آزاد۔ مکتبہ احباب، لاہور

۲۷۔ تذکرہ صوفیائے بنگال: اعجاز الحق قدوسی۔ مرکز اردو بورڈ، لاہور۔ ۱۹۶۵ء

۲۸۔ تذکرہ عالم: بلاقی داس۔ میور پریس، دہلی۔ ۱۹۰۸ء

۲۹۔ تذکرہ علمائے ہند: مولوی رحمان علی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء

۳۰۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ، محمد ایوب قادری) پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی۔ ۱۹۶۱ء

۳۱۔ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی (ترجمہ رسالہ مناقب) تالیف شیخ عبدالوہاب اقضی القضات، متوفی ۱۰۸۶ھ۔ ترجمہ سید ابوظفر ندوی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی۔ ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء

۳۲۔ تزک بابری: فارسی ترجمہ، خان خاناں، بیرم خاں۔ چترا پربھا پریس بمبئی۔ ۱۳۰۸ھ

۳۳ - تعلیماتِ مجددیہ : ملک حسن علی جامعی - انجمن اشاعت التوحید والسنۃ، شرق پور - ۱۹۶۵ء -

۳۴ - چار باغ پنجاب : گنیش داس وڈیرا - مرتبہ پروفیسر کرپال سنگھ، امرتسر - ۱۹۶۵ء

۳۵ - جلوۃ العلماء : مولانا سید محمد عبدالباقی سہسوانی مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۹۲۲/۱۳۴۰ھ

۳۶ - حدائق الحنفیہ : مولوی فقیر محمد جہلمی - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء

۳۷ - خزینۃ الاصفیا : مفتی غلام سرور لاہوری - مطبع نامی گرامی مہاراج پنڈت بیجناتھ، الموسوم بہ ثمر ہند، لکھنؤ - ۱۲۹۰ھ

۳۸ - خلاصۃ التواریخ : لالہ سجان رائے بٹالوی - بہ تصحیح ظفر احسن - مطبع جی اینڈ سنز، دہلی - ۱۹۱۸ء

۳۹ - دربارِ اکبری : محمد حسین آزاد - دارالاشاعت پنجاب، لاہور مطبع رفادِ عام، لاہور - ۱۸۹۸ء -

۴۰ - رودِ کوثر : شیخ محمد اکرام - ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور - ۱۹۷۵ء

۴۱ - سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان - غلام علی آزاد بلگرامی - طبع بمبئی - ۱۳۰۳ھ

۴۲ - سفینۃ الاولیاء : دارا شکوہ - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۸۸۴ء

۴۳ - سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات - خلیق احمد نظامی - ندوۃ المصنفین دہلی - ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء

۴۴ - سیر العارفین : جلال الدین جمالی - مطبع رضوی دہلی - ۱۳۱۱ھ

۴۵ - سیر المتاخرین : غلام حسین خاں طباطبائی - نول کشور، لکھنؤ -

۴۶ - شذرات الذہب، جلد ۸ : ابو الفلاح عبدالحی بن العماد حنبلی - مکتبۃ القدسی قاہرہ، مصر - ۱۳۵۱ھ

۴۷ - الصارم المسلول علی شاتم الرسول - امام ابن تیمیہ - ترتیب محی الدین عبدالحمید - دار الفکر، بیروت -

۴۸ - الضوء اللامع - حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی -

۴۹۔ طبقات اکبری۔ نظام الدین ہروی۔ طابع، نول کشور۔ مطبع گرامی قدر اودھ اخبار، لکھنؤ۔ ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء

۵۰۔ ظفر الوالہ بمظفر و آلہ، جلد اول۔ عبداللہ محمد بن عمر الآصفی العثمانی۔ طبع لندن۔ ۱۹۱۰ء

۵۱۔ ظفر الوالہ بمظفر و آلہ، جلد ثانی۔ عبداللہ محمد بن عمر الآصفی العثمانی۔ طبع لندن۔ ۱۹۲۱ء

۵۲۔ عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ۔ [دی کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو دی عربک لٹریچر از ڈاکٹر زبید احمد] ترجمہ۔ شاہد حسین رزاقی۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۷۳ء

۵۳۔ الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ مع التعلیقات البینۃ، علامہ عبدالحی لکھنوی۔ طبع اول۔ مصر۔ ۱۳۲۴ھ

۵۴۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب: ذوالفقار احمد۔ مطبع فیض منبع مفید عام آگرہ۔ ۱۳۱۶ھ

۵۵۔ کشف الظنون، جلد اوّل۔ حاجی خلیفہ۔ مطبع بہیہ، استنبول ۱۹۴۱ء/ ۱۳۶۰ھ

۵۶۔ کشف الظنون، جلد ثانی۔ حاجی خلیفہ۔ مطبع بہیہ، استنبول۔

۵۷۔ کشمیر سلاطین کے عہد میں [کشمیر انڈر سلطانز، از پروفیسر محب الحسن] ترجمہ، پروفیسر علی حماد عباسی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ ۱۹۶۷ء/ ۱۳۸۶ھ

۵۸۔ لطائف قدوسی [مشتمل بر حالات و مقالات شیخ عبدالقدوس گنگوہی] از شیخ رکن الدین بن عبدالقدوس گنگوہی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۱۱ھ

۵۹۔ مانڈو۔ غلام یزدانی [ترجمہ، مرزا محمد بشیر ایم۔ اے] مفید عام پریس لاہور۔ ۱۹۴۱ء

۶۰۔ مآثر الامراء۔ جلد سوم، نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۹۱ء

۶۱۔ مآثر رحیمی۔ جلد اوّل، دوم، سوم، ملا عبدالباقی نہاوندی۔ بہ تصحیح محمد ہدایت حسین۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ، طبع جلد اول ۱۹۲۴ء۔ جلد دوم، ۱۹۲۵۔ جلد سوم، ۱۹۳۱ء۔

۶۲۔ مآثر الکرام: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ لاہور۔ ۱۹۷۱ء

۶۳ - مجموعہ حالات حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی۔ مطبع شہابی بھنڈی بازار ممبئی۔

۶۴ - محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن۔ عبدالجبار خاں صوفی۔ مطبع نامی فخر نظامی۔ حیدر آباد دکن۔

۶۵ - مرآتِ احمدی، جلد اول: مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خان بہادر، مطبوعہ کلکتہ، ۱۹۲۸ء

۶۶ - مرآتِ احمدی، جلد دوم: مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خان بہادر، مطبوعہ کلکتہ، ۱۹۲۷ء

۶۷ - مرآتِ سکندری: سکندر بن محمد عرف منجھو ابن اکبر۔ تصحیح و تنقیح۔ ڈاکٹر ستیش چند مصرا، و محمد لطف الرحمٰن، جامعہ مہاراجہ سیاؤجی راؤ، بڑودہ۔ مہاراجہ سیاؤجی یونیورسٹی پریس، بڑودہ۔ ۱۹۶۱ء

۶۸ - مرآتِ عالم: بختاور خان [قلمی نسخہ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور]

۶۹ - مصباح العاشقین: از شیخ بہاء الدین بن محمود بن ابراہیم نبیرہ قاضی شیخ حمید الدین ناگوری [قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور]

۷۰ - معجم المؤلفین: عمر رضا کحالہ۔ المکتبۃ العربیہ دمشق۔ مطبعۃ الترقی۔ دمشق ۱۹۵۷ء

۷۱ - مفتاح التواریخ: منشی دانشور۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۲۸۴ھ

۷۲ - مقدمہ [بر کتاب المتانہ فی مرمۃ الخزانہ، تصنیف علامہ مخدوم محمد جعفر بوبکانی] مولانا ابوسعید غلام مصطفیٰ قاسمی سندھی، سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۲ء

۷۳ - مقدمہ مرقات شرح مشکوٰۃ، مُلا علی قاری۔

۷۴ - مکتوباتِ قدوسی: شیخ عبدالقدوس گنگوہی۔ مطبع احمدی، دہلی۔

۷۵ - منتخب التواریخ: مُلا عبدالقادر بدایونی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۲۸۴ھ

۷۶ - منتخب اللباب، جلد اوّل: محمد ہاشم المخاطب بہ خافی خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۶۹ء

۷۷ - نزہۃ الخواطر، جلد ۴: علامہ سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ

حیدر آباد دکن - ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء

۷۸ - النور السافر فی اخبار القرآن العاشر : عبد القادر بن عبداللہ عیدروسی - ناشر المکتبۃ العربیہ بغداد - مطبعۃ الفرات ، بغداد - ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۴ء

۷۹ - ہدیۃ العارفین اسماء المؤلفین و آثار المصنفین، جلد اوّل - اسماعیل پاشا بغدادی - مطبع بہیہ، استنبول - ۱۹۵۱ء

۸۰ - ہدیۃ العارفین اسماء المؤلفین و آثار المصنفین، جلد ثانی - اسماعیل پاشا بغدادی - مطبع بہیہ، استنبول - ۱۹۵۵ء

۸۱ - ہفت اقلیم، جلد سوم : امین احمد رازی تصحیح و تعلیق، جواد فاضل، ناشر - کتاب فروشی علی اکبر و کتاب فروشی ادبیّہ ، طہران -

۸۲ - یادِ ایام : مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی - مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج - ۱۹۱۹ء/ ۱۳۳۷ھ

اسی مصنف کے قلم سے

الفہرست

یہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور محقق محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق کی تصنیف ہے جو علوم و فنون، سیر و رجال اور کتب و مصنفین کی مستند تاریخ ہے اور اس موضوع سے متعلق بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں، قرآن مجید، نزول قرآن، اور اس کے مختلف قراء، فصاحت و بلاغت، ادب و انشا، حدیث و فقہ، علم نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی و حساب، سحر و شعبدہ بازی، طب اور صنعتِ کیمیا اور ان تمام علوم کے علما و ماہرین، مذاہب چین و ہند وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

فاضل مترجم نے اس کے کئی مطبوعہ نسخے سامنے رکھ کر ترجمہ کیا ہے اور ضروری حواشی دے کر کتاب کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ ترجمہ کی زبان رواں اور شستہ ہے۔

برِصغیر پاک و ہند میں علم فقہ

اُردو زبان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی اور واحد تصنیف ہے۔ اس میں سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) سے لے کر سلطان اورنگ زیب عالمگیر (۱۱۱۸ھ) کے عہد تک کی تمام فقہی کاوشوں کا احاطہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند علم فقہ سے کس طرح روشناس ہوا۔ یہاں کے علما و زعمانے کس محنت و جاں فشانی سے اس کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا اور اس موضوع سے متعلق کن متون کی تدوین کی اور مختلف ادوار میں فرمانروایان اسلام نے کس حد تک ان کوششوں کی حوصلہ افزائی کی۔

فاضل مصنف نے مقدمہٴ کتاب میں فقہ کی تعریف، اس کی ضرورت و اہمیت اور قرآن و حدیث سے اس کے بنیادی تعلق کی صراحت کی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی ابتدا اور قدیم دور کے بعض فقہا کا تذکرہ بھی کیا ہے۔